اپریل 2018

خواتین ڈائجسٹ

PDF

Khawateen Digest April 2018

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہو گا۔ شُکریہ

www.urdusoftbooks.com

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ــــ محمود ریاض

مدیرہ ــــ شادرہ خاتون

مدیر ــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ــــ امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ــــ عدنان

اشتہارات ــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

سالگرہ مبارک

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

www.urdusoftbooks.com

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

پکوان

بیوٹی بکس

اپریل 2018

جلد 45 شمارہ 12

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
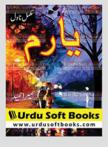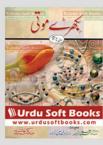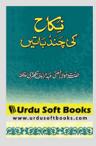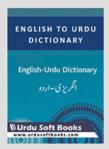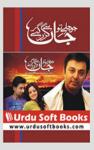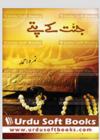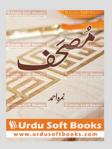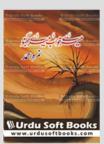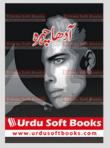
پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام : بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر لیے حاضر ہیں۔ 46 واں سالگرہ نمبر۔

گرمی، سردی، خزاں کے بعد بہار کا موسم۔ رنگوں، خوشبوؤں کا موسم جب ہر طرف ہریالی کی چادر بچھ جاتی ہے۔
آج سے 46 سال پہلے ایسے ہی ایک موسم میں خواتین کے لیے ایک ماہنامہ منظرِ عام پر آیا جس میں بہار رُت کے تمام رنگ تھے۔ پہلے شمارے نے ہی قارئین کو چونکا دیا کیونکہ اس سے پہلے شائع ہونے والے خواتین کے پرچوں سے مختلف اور منفرد تھا۔
بہت جلد اس پرچے نے قارئین کے دلوں میں جگہ بنا لی۔ اور یہ گویا ان کے گھر کا اور ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔
ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں، یہ اس کا کرم اور مہربانی ہے کہ آج آپ کا عزیز پرچہ ایک اور سال طے کر کے خواتین ڈائجسٹ 47 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔
وقت کی اس طویل مسافت میں خواتین ڈائجسٹ کی مقبولیت اور پسندیدگی میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا ہے اور آج یہ بیک وقت تین نسلوں کا پسندیدہ ترین پرچہ ہے۔
ہر ماہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بڑھ کر ہو۔ قارئین کی پرچے کے ساتھ دیرینہ وابستگی نے ثابت کیا کہ ہماری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور ہم پرچے کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ٹھہرے۔
خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ ہماری مصنفین کا رہا ہے جن کی بے مثال تخلیقات خواتین ڈائجسٹ کی زینت بنیں۔ جن کی سوچ اور فکر نے آگہی کے چراغ روشن کیے اور قارئین کے ذہنوں کو اجالنے کا فریضہ انجام دیا۔
ہم اپنی مصنفین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے جو قدر ہمارے دل میں ہے، شکریہ کا لفظ ان کے لیے ناکافی ہے۔
بہت سی مصنفین آج ہمارے درمیان نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لیے دعاگو ہیں۔ محمود ریاض صاحب، جنہوں نے اس پرچے کی بنیاد رکھی۔ محمود بابر فیصل اور محمود خاور جنہوں نے اس میں رنگ بھرے۔ ان کے لیے بھی دعائے مغفرت۔
اور قارئین جو ہمارا سب سے بڑا سرمایہ اور اثاثہ ہیں، جو قدم قدم ہمارے ساتھ رہیں، ہماری کاوشوں، کوششوں کو سراہا۔
ہم تہہ دل سے اپنی قارئین کے ممنون ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں ہمارا ساتھ ہمیشہ قائم رہے اور روشنی کا یہ سفر اسی طرح جاری و ساری رہے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر 2،

سالگرہ نمبر کے لیے بہت سی تحریریں موصول ہوئیں جو تاخیر سے ملنے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکیں۔ سمیرا حمید، امل رضا، سائرہ رضا، فرزانہ کھرل، عفت سحر طاہر، امت العزیز شہزاد اور ام طیفور کی تحریریں مئی کے شمارے میں شامل ہوں گی۔
اس طرح مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر 2 ہوگا۔

کاغذ کی ہوش رُبا گرانی و کمیابی،

عالمی مارکیٹ میں نیوز پرنٹ کی قیمت میں مسلسل اضافہ اور پاکستانی روپے کی قدر میں مسلسل کمی نے پرنٹ میڈیا کو تاریخی بحران کا شکار کر دیا ہے۔ کاغذ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اخبار و رسائل کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ تقریباً تمام اخبارات و رسائل قیمتوں میں اضافہ کر چکے ہیں۔ کاغذ کا بحران سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم اس بحران سے نبرد آزما ہیں۔ آپ کی رائے یہ فیصلہ کرنے میں معاون ثابت ہوگی کہ ادارے کو اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

اس شمارے میں،

- نعمہ ناز کا مکمل ناول۔ کاوشِ بے سود، ☆ بشریٰ احمد، نازیہ رزاق، سنیعہ عمیر اور فریدہ بتول کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، عفت سلطانہ، ہما نعیم، شینہ گل اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- نمرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول، ☆ ڈرامانگار، گیت نگار نغمہ امیر علی سے ملاقات،
- باتیں اوپی بیٹ سے۔ معروف فنکاروں سے سوالات کا سلسلہ، ☆ کرن کرن روشنی۔ احادیثِ نبوی کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ خط لکھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مخصوص سورتیں اور آیات

حضرت ابوسعید رافع بن معلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

''کیا میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی عظیم ترین سورت نہ سکھلاؤں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

جب ہم مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا تھا کہ میں تجھے قرآن کی عظیم ترین سورۃ سکھلاؤں گا؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الحمد للہ رب العالمین یہ سبع مثانی (بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔''

(بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ قرآن کریم میں آتا ہے ''اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دہرا کر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا ہے۔ (سورۃ الحجر 15-87)۔'' مذکورہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع مثانی سے سورۃ فاتحہ مراد لی ہے، کیونکہ یہ سات آیتیں ہر نماز میں اور ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ فرمان رسول ہے: (لا صلاۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب) ''اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی۔''

3۔ اسے قرآن کی عظیم ترین سورت اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ تمام مقاصد قرآن کی جامع اور مجملاً ان تمام مضامین پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی دیگر

www.urdusoftbooks.com

سورتوں میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔اس میں عقیدہ توحید اور صرف ایک رب کی عبادت اور اسی سے استعانت کرنے کا، نیز روز جزا، وعدہ و وعید اور گزشتہ امتوں کے سعادت مندوں اور گمراہوں دونوں کے قصوں سے عبرت پکڑنے کا بیان ہے۔

اسی لیے ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں اسے ام القرآن بھی کہا گیا ہے، یعنی قرآن کی جڑ، اصل اور بنیاد۔(جامع الترمذی، تفسیر القرآن، حدیث: 3124)

سورۃ اخلاص

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قل ھواللہ احد کے بارے میں فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک یہ (سورۃ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا:

''کیا تم میں سے کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی — قرآن پڑھے؟''

یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشکل معلوم ہوئی اور انہوں نے کہا۔

''اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کون اس کی طاقت رکھتا ہے۔'' (کوئی نہیں رکھتا)۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قل ھواللہ احد، اللہ الصمد (آخر تک) تہائی قرآن ہے۔'' (بخاری)

فائدہ: سورۃ اخلاص ایک مرتبہ پڑھ لینا اجر و ثواب میں ایک تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔

اس سورۃ میں اللہ کی توحید کا بیان اور اس کے کسی ہم سر کے ہونے کی نفی ہے۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی توحید کا بیان کتنا پسند ہے اور اسی حساب سے اس کو شرک سے کتنی نفرت ہے۔اسی لیے اس نے شرک کو نا قابل معافی گناہ قرار دیا ہے۔

بار بار پڑھنا

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو قل ھواللہ احد بار بار دہراتے ہوئے سنا۔جب صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کا ذکر کیا۔وہ اس عمل کو کمتر (معمولی) سمجھتا تھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً یہ سورۃ تہائی قرآن کے برابر ہے۔'' (بخاری)

فائدہ: یتقالھا کا مطلب ہے کہ تعجب کرنے والا شخص، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس شخص کا تذکرہ کیا جو بار بار پڑھتا تھا اور سورۃ اخلاص کے پڑھنے کو اجر و ثواب کے لحاظ سے معمولی سمجھتا تھا، لیکن آپ نے اس کی فضیلت بیان فرما کر اس کی غلط فہمی کو دور فرما دیا۔

جنت میں لے جانے والی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس سورۃ......قل ھواللہ احد کو پسند کرتا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی محبت تجھے جنت میں لے جائے گی۔'' (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

معوذتین

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تجھے نہیں معلوم کہ کچھ آیات اس رات میں ایسی نازل کی گئی ہیں جن کی مثل پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں؟ (وہ) قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ

برب الناس ہیں۔" (مسلم)

فائدہ : "ان کی مثل نہیں دیکھی گئیں" کا مطلب ہے کہ کوئی سورت ان کے علاوہ، ایسی ہو کہ سب کی سب تعویذ ہو، یعنی پناہ طلب کرنے پر مشتمل ہو۔ یہ چیز صرف ان دو سورتوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے انہیں معوذتین کہا جاتا ہے، پناہ دینے والی، کیونکہ ان کے ذریعے سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (معوذتین کے نزول سے پہلے اپنے الفاظ میں) جنوں اور لوگوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، یہاں تک کہ معوذ تین نازل ہو گئیں۔ جب یہ نازل ہو گئیں تو آپ نے ان کے ذریعے سے پناہ مانگنے کو اختیار فرما لیا اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے جن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی طاقت بھی عطا فرمائی ہے کہ وہ انسانوں کو اگر نقصان پہنچانا چاہیں تو اللہ کی مشیت سے پہنچا سکتے ہیں۔

بنابریں شرارتی جن بعض دفعہ انسانوں کو تنگ کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نظر کا لگنا بھی برحق ہے، جس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کو بغض و حسد کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے بد اثرات دوسرے شخص تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ نقصان یا کسی حادثے اور تکلیف سے دوچار ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ نظر محبت سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور نظر بد دونوں سے اپنے الفاظ میں پناہ مانگا کرتے تھے۔ مثلاً: اعوذ بک من الجان وعین الانسان۔

"میں تیرے ذریعے سے پناہ مانگتا ہوں جنوں سے انسانوں کی نظر سے۔" وغیرہ۔ جب ..... قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس نازل ہوئیں تو پھر آپ نے اپنے الفاظ کے بجائے ان سورتوں کے ذریعے سے پناہ طلب کرنا شروع کر دی کیونکہ یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں۔

2۔ ان کو معوذتین بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں، اللہ کے حکم سے، اپنے پڑھنے والوں کو جنات اور نظر بد سے بچاتی ہیں۔ معوذتین کے معنی ہیں، پناہ دینے والی دو سورتیں۔ اس لیے ان مقاصد کے لیے ان سورتوں کا پڑھنا بہت مفید ہے، ان کے ذریعے سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔

سورۃ ملک

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قرآن مجید کی ایک تیس آیتوں والی سورت ایسی ہے جس نے ایک آدمی کی (اللہ کے ہاں) سفارش کی۔ یہاں تک کہ اس کی بخشش کر دی گئی اور وہ سورت تبارک الذی بیدہ الملک ہے۔"

(اس روایت کو امام ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ یہ سورۃ قیامت والے دن اپنے پڑھنے والے کے لیے بارگاہ الٰہی میں مغفرت کی سفارش کرے گی۔

کافی

حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے رات کو سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھیں وہ اس کو کافی ہو جائیں گی۔" (بخاری و

مسلم)

بعض نے کہا ہے کہ ''کافی ہو جائیں گی'' کا مطلب ہے: اس رات کو ناپسندیدہ چیزوں سے اسے کافی ہو جائیں گی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قیام اللیل سے کافی ہو جائیں گی۔

فوائد و مسائل:

1۔ کافی ہو جانے کا مطلب ہے کہ سرکش شیاطین کی شرارتوں وغیرہ سے انسان بچ جاتا ہے۔

2۔ دوسرا مفہوم یہ ہے، جیسا کہ امام نووی نے بھی دوسرا قول نقل فرمایا ہے کہ یہ دونوں آیات تہجد کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ سورۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں۔ امن الرسول بما انزل الیہ سے آخر سورۃ تک ہیں۔

سورۃ بقرہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔'' (مسلم)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ قبرستان میں جس طرح مردے پڑے ہوتے ہیں اور کوئی عمل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اسی طرح اگر تم بھی گھروں میں نفل نماز اور تلاوت قرآن کا اہتمام نہیں کرو گے تو تمہارے گھر بھی قبرستان اور تم خود مردوں کی طرح ہو جاؤ گے۔

علاوہ ازیں اس میں گھروں سے شیطان کو بھگانے کا نسخہ بھی بتلا دیا گیا ہے اور وہ ہے سورۃ بقرہ کی خصوصی تلاوت۔

سب سے بڑی آیت

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابومنذرؓ! کیا تو جانتا ہے کہ تیرے پاس کتاب اللہ کی سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ (تیرے سینے میں محفوظ ہے؟'')

میں نے کہا: ''اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم ......'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا:

''ابومنذرؓ! تجھے علم مبارک ہو (قرآن کی عظیم ترین آیت معلوم ہونے کا علم۔'') (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ لا الہ الا ھو ...... سے مراد پوری آیت الکرسی ہے۔ اس میں اللہ کی صفات جلیلہ اور قدرت عظیمہ کا بیان ہے، اس لیے اس آیت کی بڑی فضیلت ہے۔

2۔ علم مبارک ہو، کا مطلب ہے: تیرے لیے نافع اور عزت و سرفرازی کا باعث ہو۔ اس علم سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے جو یقیناً دنیا و آخرت میں سرخ روئی کا باعث ہے۔

3۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد اگر سوال کا درست جواب دے تو اسے دعا دینے کے ساتھ ساتھ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔

آیت الکرسی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ رمضان (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی۔

چنانچہ ایک آنے والا میرے پاس آیا اور کھانے کے غلے میں سے لپ بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا:

''میں یقیناً تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا۔''

اس نے کہا: ''میں ضرورت مند اور عیال دار ہوں، مجھے سخت ضرورت ہے۔''

چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

صبح ہوئی (تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابوہریرہ! گزشتہ رات کو تیرے قیدی نے کیا کیا؟"

میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے اپنی ضرورت مندی اور عیال داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس نے تجھ سے جھوٹ بولا ہے اور وہ دوبارہ آئے گا۔"

میں تیسری مرتبہ اس کے انتظار میں رہا، چنانچہ وہ آیا اور غلے میں سے لپ بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا:

"میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا، تیرا یہ آنا تیسری مرتبہ ہے، تو (ہر مرتبہ) یہی کہتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا اور پھر آ جاتا ہے۔"

اس نے کہا: "مجھے چھوڑ دے، میں تجھے چند کلمات سکھا دیتا ہوں، ان کے ذریعے سے اللہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔"

میں نے پوچھا: "وہ کیا کلمات ہیں؟"

اس نے کہا: "جب تو اپنے بستر کی طرف قرار پکڑے تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر، (اس کی وجہ سے) صبح تک تجھ پر اللہ کی طرف سے ایک نگران مقرر رہے گا اور شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔"

تو میں نے (پھر) اسے چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب میں نے (اللہ کے فضل سے) صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

"تیرے رات کے قیدی نے کیا کیا؟"

میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! اس نے مجھے یہ یقین دلایا کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھلائے گا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ پہنچائے گا، تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "وہ کلمات کون سے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔

اس نے مجھ سے کہا: جب تو اپنے بستر کی طرف قرار پکڑے تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر۔ اول سے آخر تک۔ اور اس نے (یہ بھی) کہا کہ اللہ کی طرف سے تجھ پر ایک نگران رہے گا اور صبح تک شیطان ہرگز تیرے قریب نہیں آئے گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آگاہ رہو! یقیناً اس نے سچ کہا، حالانکہ وہ خود بڑا جھوٹا ہے۔ اے ابوہریرہ! تو جانتا ہے تین راتوں سے تو کس سے مخاطب رہا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ شیطان تھا۔" (بخاری)

فائدہ: دونوں ہتھیلیوں سے کسی چیز کو سمیٹنا اور لینا۔ اسے اردو میں لپ بھر کر لینا کہتے ہیں۔ اس آیت میں آیت الکرسی کی فضیلت اور رات کو سوتے وقت پڑھنے کی ترغیب ہے۔

اچھا وضو کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"میری اُمت کے لوگوں کو قیامت والے دن اس حال میں پکارا جائے گا کہ وضو کے نشانات سے ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اپنی یہ روشنی بڑھانے کی طاقت رکھے تو وہ ضرور ایسا کرے۔" (یعنی اعضائے وضو کو ان کی مقدار سے زیادہ دھونے کی کوشش کرے تاکہ روشنی میں مزید اضافہ ہو۔) (بخاری و مسلم)

اندر کیا ہے؟

انشاجی

نیویارک کی خبر ہے کہ وہاں ایک کتاب چھپی اور مہینے بھر میں اس کی پچیس ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں، ایک سو ساٹھ صفحے کی اس کتاب کی قیمت تین ڈالر ہے۔

یعنی تیس روپے، مشتاقوں کا ہجوم ایسا ہے کہ پبلشر اس کے دوسرے ایڈیشن کی فکر کر رہے ہیں۔

اور اس کتاب کے اندر کیا ہے، کچھ نہیں، سادہ اوراق ہیں، تحریر نہیں کوئی، تصویر نہیں کوئی۔

☆☆☆

ہمارے لیے اس خبر میں کوئی نئی بات نہیں، ہم نے کئی کتابیں پڑھی ہیں جن میں کچھ نہیں ہوتا، آخر میں کچھ ہاتھ نہیں آتا اور ایسی تو بہت ہیں کہ تین چوتھائی سے زیادہ خالی ہوتی ہیں، کسی میں پلاٹ نہیں ہوتا، کسی میں کردار نگاری نہیں ہوتی، کسی میں آغاز نہیں ہوتا، کسی میں انجام نہیں ہوتا، شاعری کی کتاب ہو تو اکثر وزن نہیں ہوتا۔

اور وزن ہو تو اس میں معنی نہیں ہوتے اور اگر وزن اور معنی دونوں ہوں تو شاعری نہیں ہوتی۔ قصے، کہانیوں اور شاعری کی تخصیص نہیں اور بہت سے مضامین کی کتابیں ہم نے اندر سے خالی دیکھی ہیں، ان کا مطالعہ استاد ذوق کے قصیدے کے اس شعر کی مثال ہے۔

رات بھر ٹھونگا کیا، انجم کے دانے چرغ پیر
صبح دم دیکھا تو واں اصلاً شکم میں کچھ نہ تھا

☆☆☆

اتنا البتہ ہے کہ ہماری ان کتابوں کے ورق سادہ نہیں ہوتے۔ نیویارک والی اس کتاب میں ورق سادہ چھوڑ دیے گئے ہیں اور شاید یہی اس کی مقبولیت کی وجہ ہے۔ یوں تو تحریر کی بھی کوئی قیمت نہیں رہی،

آپ سادے کاغذ کا ریم بازار میں جا کر بیچیں پھر چھپے ہوئے اخبار کا ریم لے جایے اور فرق دیکھ لیجیے، خواہ اس میں ہمارا کالم ہی کیوں نہ چھپا ہو، جس میں بے شمار قیمتی بلکہ انمول اور زریں اقوال اور بے بہا اشعار ہوتے ہیں، ڈیڑھ دو روپے سیر سے زیادہ قیمت نہ پائے گا، سادگی کی قدر کا یہ حال ہے کہ پرانے شاعر سادہ رویوں پہ مرا کرتے تھے، جس کے چہرے پر کوئی تحریر ہو، خط وغیرہ اس کی قدر گر جاتی تھی، محبوبوں تک کو اپنے مصحف رخ ہدیہ کرنے پڑتے تھے، دام دے کر خریدتا کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

کتاب کو اندر سے سادہ رکھنے میں کئی خوبیاں ہیں۔ پبلشر کا تو یہ ہے کہ کتابت بچتی ہے، طباعت یعنی چھپائی کی سیاہی بچتی ہے اور مصنف یعنی مضمون تک بچتا ہے، اچھی خاصی کتاب، محض پبلشر اور جلد ساز کے تعاون سے تیار ہو جاتی ہے۔

معاشرے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے گمراہ نہیں ہوتے، بے راہ روی نہیں پھیلتی، اس میں سرمایہ داری کی حمایت نہیں ہوتی، سامراج کی وکالت نہیں ہوتی، عریانی نہیں ہوتی، ابہام نہیں ہوتا، جہالت نہیں ہوتی، چرب زبانی نہیں ہوتی، تعصب نہیں ہوتا، غلط بیانی نہیں ہوتی، کچھ بھی تو نہیں ہوتا پھر ایسی کتاب یا کتابیں پڑھنے والے کی نظر خراب نہیں ہوتی، اسے عینک نہیں خریدنی پڑتی، اس سے کوئی ادھار نہیں مانگتا، ایک سو ساٹھ صفحے کی کتاب تیس روپے میں اتنی خوبیوں کے ساتھ قطعی مہنگی نہیں، کم از کم ہمیں مہنگی معلوم نہیں ہوتی۔

☆☆☆

بین الاقوامی بھائی چارے کے فروغ میں بھی

یہ کتابیں بہت کام آسکتی ہیں، ان کو دنیا میں ہر کوئی پڑھ سکتا ہے، ہر جگہ مقبول ہوں گی، اس سے خواندگی اور ناخواندگی کا مسئلہ بھی خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا، کیونکہ کتابوں کو ناخواندہ لوگ نہیں پڑھ سکتے، ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

خواندہ لوگوں کی حد تک بھی یہ دقت ہے کہ جو انگریزی پڑھا ہے، وہ عربی کتاب نہیں پڑھ سکتا اور عربی خواں کے لیے جاپانی زبان میں چھپی ہوئی کتاب بے معنی ہے، آنکھیں جھپکتا رہ جائے گا۔

اگر یونیسکو جو خود بھی تکلیف اٹھاتی ہے، ہمیں بھی تکلیف دیتی ہے، اس قسم کی کتابوں کو رواج دے تو ہماری پبلشنگ کی صنعت بڑی ترقی کر سکتی ہے اور قارئین کا معیار بھی بلند ہو جائے گا، وہ چھپی ہوئی گھٹیا کتابیں نہ پڑھیں گے، تو ضرور بلند ہو جائے گا۔

☆☆☆

جن لوگوں کو مطالعے کی عادت نہیں، ان میں مطالعے کو فروغ دینے کے لیے بھی یہ نسخہ اچھا ہے۔ لوگ مطالعے سے نہیں بھاگتے، صرف تحریر سے بھاگتے ہیں، سفید کورے کاغذ سے کوئی نہیں بھاگتا۔ ویسے تو یہ بات کوئی کتاب سے خاص نہیں، پرانی مثل ہے، تھوتھا چنا باجے گھنا، جتنا کوئی برتن خالی ہوگا اتنا ہی اس میں سے اچھی آواز آئے گی۔

آپ کے آس پاس جتنے مقبول عام آدمی ہیں، لوگ جن کے آگے پیچھے پھرتے ہیں، کبھی ان کے اندر جھانک کے دیکھیے، خالی ہوں گے، بالکل خالی، پس اگر ایک خالی کتاب کی اتنی قدر ہو رہی ہے کہ مہینے بھر میں دوسرا ایڈیشن نکل رہا ہے، جبکہ ادب عالیہ کی کتاب کے ایک ہزار نسخے نکلنے میں پانچ سال لگ جاتے ہیں تو کچھ تعجب نہ ہونا چاہیے۔ نظیر اکبر آبادی نے جو بات کورے برتن کے لیے لکھی ہے، کورے کاغذ کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔

تازگی ذہن کی، تری تن کی
واہ کیا بات کورے کاغذ کی

☆☆☆

دور کیوں جائیے، یہ ہمارا کالم ہی ہے، کیا رسالہ خریدنے والے سب ہی لوگوں نے پڑھا ہوگا۔ آپ بھی مارے باندھے ان سطور تک پہنچے ہوں گے، حالانکہ دیکھیے ہم اس میں کیا کیا مضمون کھینچ کر لائے، کیا کیا نکتے پیدا کیے ہیں، اگر اس کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تو سب پڑھتے، یعنی سب کی نظر سے گزرتی، آئندہ ہم اپنی کتابیں بھی سادہ ہی بازار میں لایا کریں۔ ان کے اندر چھاپ کر ان کو خراب نہیں کیا کریں گے۔ لوگ چاہیں ان میں حکمت کے نسخے لکھیں، پسندیدہ اشعار لکھیں، فلمی گانے لکھیں، محبوبوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر لکھیں یا کچھ بھی نہ لکھیں۔

کبھی بچے کی ناک پونچھنی ہو تو اس میں سے ورق پھاڑ سکتے ہیں۔ ہم اس میں ایسا کاغذ لگائیں گے، جو اس مقصد کے لیے موزوں ہو، رومال کا کام دے سکے، قیمت بھی تیس روپے سے کم رکھیں گے کیونکہ ہمارا ملک مقابلتاً غریب ہے۔

❁

یوں تو خواتین ڈائجسٹ کو ابتدا ہی سے بہترین لکھاریوں کا ساتھ ملا مگر جب جب ہم نے اپنے کسی سلسلے میں قارئین کو شمولیت کی دعوت دی تو ان کی شمولیت نے سلسلے کو چار چاند لگا دیے۔

46 ویں سالگرہ کے موقع پر موصول ہونے والے سروے سے اندازہ ہوا کہ قارئین زندگی کو کس رنگ سے دیکھتے ہیں، حالات و واقعات ان کی سوچ پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اور ادب ان کے نزدیک ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔

اگر چہ ہمارے پرچے سے انہیں جو کچھ حاصل ہوا اس کا کریڈٹ انہوں نے ہمیں دیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ بات کو سمجھنا اور پھر اسے اپنی زندگی پر لاگو کرنا، بہر حال ہماری ذہین قارئین ہی کا خاصہ ہے۔

آپ سب کی بے شمار دعاؤں اور ان مول محبت کے شکریے کے ساتھ آیئے بہنوں کے خیالات و احساسات کی دنیا میں چلیں۔ اور محظوظ ہوں۔

ہمارا پہلا سوال تھا

(1) ہمارے ارد گرد بہت سے رشتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی ایک رشتے پر لکھنے کو کہا جائے تو کس کا انتخاب کریں گی۔

(2) کہانی مختلف کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہیرو، ہیروئن سے ہٹ کر کس کردار نے آپ کو متاثر کیا۔

(3)

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
اسی میں کون سا عالم نہیں ہے

اس شعر پر کوئی دلچسپ جملہ لکھیں۔

دیپ محبت کے جلتے رہیں

ادارہ

نیر فہیم خان...... کراچی

اس بار سروے کے سوالات مشکل لگے مگر دلچسپ تھے۔ اسی دلچسپی کے پیش نظر دل نے سوچا کہ مجھے بھی حصہ لینا چاہیے بلکہ میں تو آپ کو مشورہ دینے والی تھی کہ والدین کے علاوہ کبھی کبھی انسان کو کسی دوسرے رشتے سے بھی بہت مدد ملتی ہے۔

آپ کا پہلا سوال میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی کا جواب حاضر خدمت ہے مگر اس سے پہلے خواتین ڈائجسٹ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔

(1) میر پور خاص...... چھوٹا سا شہر...... بچپن کی یادوں کا سمندر اسی شہر کے ارد گرد ہلکورے لیتا ہے نیم والی گلی کے کونے پر بنا پرانی طرز کا دو منزلہ مکان جس کے وسیع صحن میں ہماری آمد کے ساتھ ہی جھولا ڈال دیا جاتا تھا۔ نانا نانی، ماموں، خالہ چار افراد پر مشتمل مختصر سا ننھیال۔ نانا ابا تو بہت جلد چلے گئے تھے اس موٹی موٹی مٹی کی بنی پیلی دیواروں والے گھر میں تین نفوس باقی بچے تھے۔ نانی، حسن ماموں اور عشرت خالہ تینوں نے بے حد پیار دیا۔ خالہ سے تو دوستی تھی۔ خاندان کی پہلی نواسی ہونے کا شرف

حاصل ہونے کی وجہ سے نانی کی محبت کی حقدار بھی تھی اور حسن ماموں ...... میرے بچپن کو سنہری یادوں سے سجانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔

میں سدا سے کتاب کی شوقین، ہما اور عشرت خالہ پریوں کی بھوتوں کی کہانیاں پڑھتیں جو مجھے سخت ناپسند تھیں۔ میرے لیے خاص طور پر گلی کے کونے پر موجود جگنو لائبریری کے مالک کو ہدایت کر دی جاتی کہ روز دو کتابیں آئیں گی۔ ایک میرے لیے اشتیاق احمد کی سیریز میں سے کوئی ایک ......اور باقی دوسروں کے لیے۔ پہلے میں ان سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ وہ مذہبی طور پر شدت پسند تھے مگر وقت کے ساتھ نارمل ہوتے گئے۔ ان کے کمرے کے چوڑے طاقوں میں ہزاروں کتابیں تھیں جو میرے لیے جنت تھیں۔ کتابوں سے عشق ان ہی کے توسط سے پروان چڑھا۔ آج جو تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں ان ہی کا دیا فہم ہے۔ بچپن میں گلستان بلدیہ لے کر جانا فروٹ فارم کی سیر کرانا ان کی ذمہ داری تھی۔

ایک بار تو مجھے سائیکل پر بٹھا کر فروٹ فارم کی کچی سڑک پر ریس لگوائی تھی۔ میر پور خاص میں گزرا وقت ہمارے لیے انمول تھا۔ وہ چھوٹے سے اسٹور میں بچوں کو جمع کر کے ڈرامہ کرواتے، جس میں جاوید ہمیشہ ڈریکولا بنتا تھا۔ ہم بچوں کو ساتھ بٹھا کر نظمیں پڑھواتے۔

محنت کا یہ دور ہے بھیا، گھر گھر گھومے پہیہ

ہیا ہیا ہیا ......

بچوں کا زوردار نعرہ ہوتا۔ کبھی 78 موری پر پکنک منائی جاتی۔ کبھی بریجی لے جاتے۔ وہ سفر آج تک یاد ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ انتہائی کشادہ دل، وسیع القلب، رقم کو کبھی اہم نہیں جانا خوشیوں کو مقدم رکھا۔

شادی سے پہلے کا ایک ماہ نانی اور ماموں کے ساتھ گزارا بے حد خوب صورت۔ ماموں اس طرح خیال کرتے جیسے میں کوئی شہزادی ہوں۔ آم لے کر بیٹھ جاتے اور ایک پھانک کاٹ کر پلیٹ میں رکھتے میں وہ کھا لیتی تو دوسری پھانک کاٹ کر رکھتے۔

میں نے پوچھا۔ ”ایسا کیوں؟“

کہا۔ ”سارے آم کو کاٹ کر رکھوں گا تو آپ کا دل جلدی بھر جائے گا۔ ایک ایک کر کے کھائیں گی تو زیادہ کھائیں گی۔“

پہلی مرتبہ فرائی چانپ بھی انہوں نے ہی کھلائی تھی اور باہر کھانا کھلانے بھی لے گئے تھے۔ کباب جو کہ بہت مزے کے تھے۔ وہ مزہ آج بھی یاد ہے یا شاید وہ ماحول وہ وقت اچھا تھا۔ اگر میری زندگی کی اولین خواہشات پوچھی جائیں تو ان میں سے ایک یہ ہو گی کہ میرے ماموں کو بہت اچھی شریک حیات مل

جائے۔ جوان کی زندگی کو رنگوں سے بھر دے۔
سب اپنی اپنی زندگی میں مست ہیں۔ نانی کے انتقال کے بعد ماموں بالکل اکیلے ہیں۔ شاعرانہ مزاج والے۔ ہنس مکھ، لیکن بے حد حساس۔ اللہ کرے کہ ان کا دل سمجھنے والی کوئی مل جائے۔ حسن ماموں اب دکھی ہونے لگے ہیں' لوگوں کے رویّوں سے' بگڑے لہجوں سے، زمانے کی چالاکی اور شاطر پن ان میں نہیں ہے۔
ایک دوست کی فرمائش پر حیدر آباد سے کھیر بنوا کر کراچی دینے آئے۔
حسن ماموں' میرے دل میں آپ کے لیے بے حد خلوص پیار اور فکر ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ ان کی شادی ہو، بچے ہوں' وہ ایک مکمل زندگی گزاریں۔ ان کی ادھوری زندگی پر میں خود کو مجرم سمجھتی ہوں' ہماری زندگی میں رنگ بھرنے والے شخص کی اپنی زندگی بے رنگ ہے۔ اللہ ان کو خوش اور آباد کر دے' ہمیشہ مسکراہٹ قائم رکھے آمین۔

(2) بہت سے کردار ہیں جیسے دل دیا دہلیز میں مطربہ کا کردار تھا۔ حسد اور جلن کی وجہ سے اس نے دو دلوں میں آگ لگا دی تھی اور خود بھی ہر خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ انسان کتنی ہی کوشش کر لے ملتا وہی ہے جو نصیب میں لکھا ہو۔ پھر کیوں اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے وہ دوسروں کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے۔ ان کی خوشیوں سے حسد کرتا ہے' انہیں دکھ دیتا ہے۔ اگر انسان رب کی تقسیم پر راضی ہو تو ہر طرف آسانی رہتی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور بہت سے کردار ایسے ہیں جو ہیں ولن مگر قاری بہنوں نے انہیں بھی ہیرو بنا لیا ہے۔ جیسے یارم کا کارل' اف!! ایسے عجوبے دنیا میں دو چار آ جائیں تو بس ہر طرف ادھم ہی ادھم۔

(3) ذرا سا دل ہے' کسی آنے والے افسانے کا بہترین عنوان ہو سکتا ہے۔ ویسے اس دل کے ہی شاخسانے ہیں۔ جو ہر طرف دیوانے ہیں، جو صرف اس کی مانتے ہیں وہ خاک نشین ہو جاتے ہیں۔

افشین نعیم ...... اسلام آباد

(1) یہ سوال منتخب کرنے والے کو ہمارا سلام، بہت عرصے سے ایک کردار پر لکھنے کی بہت خواہش تھی سو پوری کرنے کا موقع مل گیا۔ آج سے تقریباً اٹھارہ برس قبل تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب شروع کی، وہاں ایک بہت سینئر ساتھی تھیں۔ جن کے بچے ہماری عمر کے تھے۔ انتہائی خوش لباس، خوش گفتار خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خوب نواز رکھا تھا۔ ایک سے ایک قیمتی کپڑا، جوتا' غرض پہناوا ان کا دیکھنے لائق ہوا کرتا۔ ہر سال حج و عمرہ جس کی سعادت نصیب ہوتی' جایا کرتیں۔ یہاں ان کو موضوع سخن بنانے کا مقصد ان کی کچھ عادات و اطوار ہیں، جن پر پندرہ سطریں چھوڑ پوری کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔
ہمارے اسکول میں کبھی کبھار تمام ٹیچرز اپنے اپنے پیسے ملا کر پلاؤ منگوایا کرتی تھیں۔ جب بھی کوئی ایسا موقع آتا، میڈم فٹ سے پیسے دینے سے انکار کر دیتیں۔ ''نہ بابا نہ میں اپنے بچوں کا حق نہیں مار سکتی۔'' حالانکہ بہت سی بچوں والی ٹیچرز پیسے دے کر ڈبل شیئر بھی منگوا لیا کرتیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو پیسے ملا کر ایک ہی حصہ منگوا لیتیں (یعنی دو ٹیچرز ملا کر منگوا لیتیں) خیر اگر وہ نہیں منگوانا چاہتی تھیں اپنا شیئر تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر وہ کیا یہ کرتی تھیں کہ جب پلاؤ آ جاتا تو ٹھسّے سے سب کے درمیان بیٹھی رہتیں۔ اب یہ بہت برا لگتا کہ سب لوگ کھا رہے ہوں، وہ ایسے ہی بیٹھی ہیں تو ہم میں سے بہت ساری ٹیچرز انہیں آفر کرتیں۔ میڈم پلیز آئیں' ٹیسٹ کریں۔ میڈم تو تیار بیٹھی ہوتیں' جلدی سے ایک خالی پلیٹ لے آتیں اور چمچ کی مدد سے اپنی خالی پلیٹ کو بھری پلیٹوں کی مدد سے بھرتیں، کھاتی چٹتیں، اللہ کا شکر ادا کرتیں (اللہ اللہ خیر صلا)۔

www.urdusoftbooks.com

پھر ہمارے اسکول میں عید ملن پارٹی کا رواج تھا۔ جس میں بچے گھروں سے مزے مزے کی چیزیں بنوا کر لاتے، چونکہ وہ ایک انتہائی سینئر ٹیچر تھیں سو اپنی سنیارٹی کا فائدہ اٹھا کر بچوں کو پلیٹ پیش کرتیں۔

"لو بھئی ٹیچرز کا حصہ اس میں ڈال دو۔" یہ بھتہ وصول کرنے کے بعد اعلان بھی کروا دیا کرتیں کہ کوئی چیز بچ جائے تو واپس گھر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے جمع کروا دینا۔ بچے تابع داری سے تمام بچا کھچا سامان جمع کروا دیتے وہ سمیٹ کر گھر لے جاتیں۔ ہمارے خیال میں رزق ضائع کرنا انہیں پسند نہ تھا سو سنبھال لیتیں۔

ایک مرتبہ ہم بغیر ناشتہ کیے اسکول آ گئے۔ گھر سے نکلتے نکلتے ایک سیب پرس میں ڈال لیا۔ بریک تک بھوک سے برا حال ہو گیا۔ اللہ اللہ کر کے بریک ہوئی سیب نکالا کھانے کے لیے۔ اب اتنے لوگوں میں اکیلے کھانا کچھ مناسب نہ لگا سو سب ساتھیوں کو باری باری آفر کیا چونکہ دانتوں سے کھانے والا معاملہ تھا چھری پلیٹ موجود نہیں تھا سو سب نے انکار کر دیا سوائے میڈم کے۔ میڈم نے سیب ہمارے ہاتھ سے لیا اور دانت اس میں گاڑے۔ کھاتے ہی جملہ بولا۔

"واہ...... سبحان اللہ کیا رسیلا سیب ہے۔"

ہماری ایک دوست نے یوں ہی تفریحاً مسکراتے ہوئے میڈم سے کہہ دیا۔

"میڈم! آپ کو قسم ہے، آپ نے اب سیب اس کو واپس نہیں کرنا۔" میڈم نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھا اور گویا ہوئیں۔

"ہائے اللہ اب کیا کروں۔" اور اس قسم سے ایسی مجبور ہوئیں کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پورا سیب کھا گئیں۔ ہم مارے لحاظ کے یہ بھی نہ کہہ پائے کوئی قسم وسم نہیں، واپس کیجیے ہمارا سیب۔ (ذرا آپ لوگ ہمارا درد محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ برسوں گزر گئے مگر زخم آج بھی تازہ ہے۔ سطروں کی قید نہ ہوتی تو آپ کو مزید محظوظ کرتے پر اب اجازت۔

(2) نمرہ احمد کا ناول ہے "نمل" کردار ہے زمر کے ابا جان کا، عام طور پر مصنفین کرام ہیرو، ہیروئن یا مین کرداروں کو اہمیت دیتے دیتے سائیڈ کریکٹرز کو کسی حد تک نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نمرہ نے

ابا جان کے کردار کو بہت خوب صورتی سے لکھا اور بڑی باریک بینی سے اس کردار کے احساسات ہم تک پہنچائے۔ ہمارے گھر میں تو یہ عالم تھا۔ کسی کو فکر ہوتی تھی۔ سعدی اس قسط میں ملا یا نہیں۔ کسی کو فکر ہوتی۔ ہاشم پکڑا گیا یا نہیں اور ہمیں فکر ہوتی زمر کے ابا اس بار ہیں کہ نہیں اگر ہیں تو کم ہیں یا زیادہ اور ان کا ایک

جملہ"اف اس لڑکی کو وکیل کیوں بنایا تھا۔" ہمارا پسندیدہ جملہ رہا۔

(3)

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
اس میں کون سا عالم نہیں ہے

شاعر عارضۂ قلب میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔
جوابی شعر عرض ہے۔

سارے عالم کو دل میں سما کے
کوئی شادی شدہ سالم نہیں ہے

میری زندگی میں بہت سے خیر کا موجب آپ کا یہ پرچہ بنا۔ کسی افسانے میں دس فیصد صدقہ آمدنی سے نکلنے کا پڑھا اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔ کسی اور جگہ سلام کے بارے میں حدیث پڑھی اس کو زندگی میں شامل کیا۔ کہیں پر دعا کا سنت طریقہ پڑھا تو سنت طریقے سے دعا شروع کی۔ غرض یہ کہ چودہ برس کی عمر سے جو آپ کے رسالوں کا ہاتھ تھاما تو اب سینتیسواں سن لگ گیا۔ ہم پاکستانی قائداعظم کے احسان مند جو انہوں نے کیا، اللہ نے ان ہی سے کروایا تھا۔ پاکستان بنانے کا عظیم کام اللہ نے کسی مولوی، مولانا، قاری، عالم دین کے لیے نہیں ایک بظاہر انگریز دکھنے والے مسلمان کے لیے رکھا تھا۔ جو ان ہی کے جیسا دکھتا تھا، جو ان کی زبان بولتا تھا، جو ان کے تعلیمی اداروں میں پڑھا تھا، جو ان کے سامنے کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ ڈٹ کر بات کرتا، بات منوالیتا تھا، دل میں مسلمانوں کا درد رکھتا تھا۔ سو پاکستان ان شا اللہ قائداعظم کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

اسی طرح موجودہ دور میں اسلام کو پھیلانے کا کام اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے ذریعے کروا رہا ہے۔ وہ بچیاں جو درس میں نہ جانا چاہیں، قرآن ترجمہ سے نہ پڑھنا چاہیں، وہ بھی آپ کے پرچوں کے توسط سے اسلام سیکھ رہی ہیں، سمجھ رہی ہیں، دین کو اپنے اندر جذب کررہی ہیں اور اس بات کا سہرا ان کے بانی کے ساتھ ساتھ ان تمام لوگوں کو جاتا ہے جو اس کار خیر میں شریک ہیں۔

فرزانہ انصاری عرف گڑیا...... کراچی

(1) آپی آپ نے جن رشتوں کا ذکر کیا ان پر بے حساب لکھا جا سکتا ہے۔ ہر رشتہ انمول ہے، چاہے وہ والدین ہوں، بہن بھائی، دوست احباب، پڑوسی یا استاد ہوں۔ میں اپنے والدین پر لکھنا چاہوں گی کیوں کہ والدین ہی وہ واحد ہستی ہوتے ہیں جن کی محبت بے غرض اور بے انتہا ہوتی ہے۔

میرے والدین اپنی کم سنی میں قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ جو واقعات ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں، وہ ہمارے والدین کے آنکھوں دیکھے اور ان پر بیتے ہیں۔ ہمارے نانا، نانی حیدرآباد میں آ کر آباد ہوئے اور ہمارے ددھیال والے کراچی آ کر آباد ہوئے۔ پھر ہمارے والدین کی شادی ہوئی (وہ ایک الگ داستان ہے) اور وہ "حاجی کیمپ" میں آباد ہوئے۔

میرے والدین کی سب سے بڑی خوبی ان کا دین دار ہونا ہے۔ میرے والدین بالکل پڑھے لکھے نہیں۔ اس کے باوجود صوم صلوٰۃ کے پابند، زکوٰۃ ادا کرنے والے، ماشاللہ حاجی، غرض بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ میرے والدین کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنی ساری اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ قرآن پاک کی تعلیم دلوائی، اسکول میں پڑھایا جبکہ ہم گیارہ بہن بھائی تھے۔ اتنے بچوں کو پڑھانا، لکھانا ان کی پرورش کرنا بے حد کٹھن رہا جبکہ والد صاحب کی اس وقت تنخواہ صرف چالیس روپے ماہوار تھی، میری امی بے حد کفایت شعار اور سلیقہ مند تھیں۔

امی کو سلائی کڑھائی آتی تھی، وہ اجرت پر کپڑے سیتی تھیں۔ دُور دُور سے لوگ کپڑے سلوانے آتے تھے اور یہ ہنر میری تمام بہنوں میں آیا سوائے میرے۔ میں سب سے چھوٹی ہوں تو سب کی لاڈلی

تھی اس لیے مجھ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالا۔

میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد میرے بڑے بھائی اپنی کوشش سے سعودی عرب (جدہ) روزگار کے لیے چلے گئے بعد میں چھوٹے بھائیوں کو بھی بلا لیا، یوں ہمارے گھر کے حالات بہتر اور خوشحالی کی طرف گامزن ہو گئے۔ بڑے بھائیوں نے بہنوں کی شادیاں کیں، اپنی شادی کی، جب میں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو گھر میں خوش حالی کے باوجود والد صاحب کام کرتے تھے۔ (وہ موٹر مکینک تھے)

انہوں نے یہ نہیں سوچا میرے بیٹے باہر کما رہے ہیں تو میں گھر بیٹھ کر کھاؤں، نہیں بلکہ آخر عمر تک کام کیا۔ اور گھر کی کفالت کرتے رہے۔ میرے والد کی عمر وقت وفات 70 برس کے قریب تھی۔ میرے والدین رزق حلال کے سخت حامی اور ادھار لینے کے سخت خلاف تھے۔ ان کی ایک نصیحت جو مجھے آج تک یاد ہے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا، کچھ کھانے کو نہیں تو بھوکے بیٹھے رہنا مگر کسی سے مانگ کر نہیں کھانا (اور الحمدللہ والد کی نصیحت پر آج تک عمل جاری ہے۔)

میرے والدین پڑوسی، رشتہ داروں کے حقوق بہت خوش دلی سے ادا کرتے تھے اور ہمیں بھی یہی تلقین کرتے تھے کہ ہم اپنے رشتہ داروں، مہمانوں، پڑوسیوں سے اچھا سلوک کریں۔

میری امی بے حد سوشل تھیں، کسی کی شادی بیاہ، خوشی غمی رد نہیں کرتی تھیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں بیٹوں کے جہیز، بری کی خریداری کے لیے ساتھ لے کر جاتے۔ ہماری امی نے کسی ضرورت مند کو "نہ" نہیں کی۔ میرے والدین نے غربت بھی بہت دیکھی اور جب پیسہ آیا تب بھی ان کے رویے میں فرق نہیں آیا، نہ اپنے لیے بینک بیلنس بنایا نہ بچا کر رکھا۔ سب کچھ اپنی اولاد اور دوسروں پر خرچ کر دیا۔

آخری عمر میرے والدین نے بہت کسمپرسی میں گزارے میری امی میری شادی کے بعد اکیلی سی ہو گئی تھیں۔ سب اپنی دنیا میں مگن، میری امی اپنی اولاد کی قربت کے لیے ترستی تھیں۔ میں اور میری ایک بڑی بہن بہت جاتے تھے تو وہ ہم سے اپنے دکھ سکھ کہہ لیتی تھیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم نے اپنی امی کی کسی خواہش کو حسرت نہیں بننے دیا۔ بس دکھ اس بات کا ہوتا ہے ہم اپنے بہن بھائیوں کو زیادہ امی کے پاس لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

میں قارئین کو ایک پیغام دینا چاہوں گی خدارا ضعیف ماں باپ کی خدمت کریں۔ یہی سوچ لیں۔ آج جس طرح ہم اپنے بچوں کی پرورش میں ہلکان رہتے ہیں کبھی ہمارے ماں باپ نے بھی ہمیں اسی طرح پالا ہوگا۔ اپنے والدین کو اکیلا نہ چھوڑیں، دنیا کے کام تو چلتے رہتے ہیں، کبھی اپنے والدین کے

ساتھ بیٹھیں، ان سے بات چیت کریں' ان کا خیال رکھیں، ان کو اس طرح ٹریٹ کریں جیسے ہم اپنے بچوں کو کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کی دنیا و آخرت سنور جائے گی ورنہ بعد میں صرف پچھتاوا رہ جائے گا۔

میرے والدین کی صرف ایک بڑی خامی یہی تھی وہ وصیت نامہ نہیں لکھ کر گئے۔ آج ان کے بنائے گئے گھر پر سب آپس میں لڑتے ہیں۔ اور میں دکھ سے دیکھتی رہتی ہوں۔ ان کو والدین سے زیادہ زمین جائیداد کی پروا ہے۔

(2) آپی آپ نے ایک کردار کی قید کیوں لگائی ہمیں تو بہت سارے کردار پسند رہے ہیں۔ بہرحال "دل پھولوں کی بستی" میں ہمیں "نبیل بھائی" کے کردار نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ آج تک ہم "نبیل بھائی" کو بھول نہیں پائے۔ وجہ ان کا خلوص، بے غرض محبت ہے۔ اگر منفی کردار کی بات کی جائے تو "دیمک" کے "ہاشم" کے ہم بہت بڑے فین رہے ہیں۔ وجہ اس کا رکھ رکھاؤ، اپ ٹو ڈیٹ ہونا، اچھا وکیل، اپنے خاندان کو سپورٹ کرنا، اپنی بیٹی کے لیے پوزیسیو ہونا اور پھر جواہرات پر تیزاب پھینکنا، غرض ہر بات نے اپنا اثر چھوڑا اور اس کے انجام نے بہت اپ سیٹ کر دیا تھا۔

(3) اس شعر کا جواب شعر ہی سے دوں گی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

عندلیب زہرا...... راولپنڈی

(1) مجھے بچپن سے ہی سالگرہ کا تہوار پسند ہے۔ کیک، غبارے، تحائف اور فل پروٹوکول...... سو سالگرہ کا مفہوم میری لغت میں کچھ یوں تھا "سب سے گفٹس ملنا" سالگرہ منانا اب بھی پسند ہے۔ لیکن خواتین ڈائجسٹ نے مفہوم بدل دیا ہے۔ اپنے سالگرہ نمبر پر تحفے دے کر۔ "اچھے ناول، افسانے، سروے...... واقعی خواتین ڈائجسٹ کی ہر ادا میں، ایک نرالی ادا ہے۔

زندگی اور اس کی رونقیں' رشتوں سے عبارت ہوتی ہیں۔ زندگی بھی متحرک رہتی ہے ورنہ تو کائی زدہ جوہڑ بن جائے۔ سو رشتے زندگی کا رنگ، آہنگ، ساز، مضراب سب کچھ ہیں۔ اگر ایک شخص کامیاب ہے، دولت مند ہے لیکن رشتوں کے معاملے میں تہی دامن ہے تو اس سے بڑا مفلس اور کوئی نہیں ہے۔ سو رشتے بنائیے اور جو ریڈی میڈ ملے ہیں۔ انہیں قائم رکھیں۔ میرے پاس تھوڑے سے اچھے رشتے ہیں۔ ان میں سے اپنے ابو کا انتخاب کیا ہے۔ کیوں ......اس کا جواب آپ کو مل جائے گا۔ میرے ابو ایک اچھے انسان تھے۔ میں نے "انسان" لکھا ہے۔ والد تو ہر بیٹی کا اچھا ہوتا ہے۔ چھپر چھاؤں، پہلا پیار، پہلا ہیرو، دلیر' جری، مضبوط کندھوں والا، روشن آنکھوں والا، مہربان بادل جیسا ......لیکن کیا وہ اچھا شوہر، بھائی، بیٹا بھی ہوتا ہے؟ پڑ گئے ناں سوچ میں؟ رک گئے ناں قلم؟

لیکن میرے ابو ہر رشتے میں بے مثال تھے۔ ان سے وابستہ ہر رشتہ خواہ والدین کا ہو یا بیوی کا، بہن بھائی ہوں، دوست یا ملازم، سسرالی عزیز...... ان سے عزت و محبت ہی پاتا، ابو کی نگاہوں میں ہر عورت کے لیے عزت و پاکیزگی ہوتی۔ اس لیے تو ہر عورت خواہ وہ رشتے دار ہو یا غیر...... ان سے عزت اور تحفظ پاتی تھی۔ وہ نفس کی پاکیزگی پر زور دیتے۔ آپ پڑھیں، جاب کریں، ترقی کا ساتھ دیں لیکن نفس میں پاکیزگی ہو، وہ مان، بھروسا، اعتبار دیتے تھے، لکھنے اور کہنے کو یہ الفاظ بہت آسان اور ہلکے ہیں۔ کبھی نبھانے یا آزمانے کی نوبت آ جائے تو انسان کو اپنے ظرف کے وسیع یا تنگ ہونے کا پتا چلتا ہے۔

ہمیشہ دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے ہارنے سے ڈر لگتا...... میرا کندھا تھپتھپاتے۔ بکھرے رنگوں والی ڈرائنگ اور شکستہ تحریروں کو فخریہ دکھاتے۔" جوانی میں پارسائی اختیار کرنا، شیوہ پیغمبری

ہے۔" بارہا کہتے ...... بغیر صلے کی پرواہ کیے وہ سب کے کام آتے۔ میں نے خاموش خدمت کا مفہوم ان سے جانا۔

خامی......!! سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ وہ اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟ شاید خلوص والوں میں یہ کمی ہوتی ہے کہ وہ جلد باز ہوتے ہیں۔ ابو بہت نرم دل اور جذباتی لحاظ سے کمزور تھے۔ خونی رشتے دھوکا بھی دیتے تب بھی معاف کر دیتے۔ چالاکی سمجھ جاتے لیکن نرم دلی کے ہاتھوں معاف کرتے اور سنبھلنے کا موقع دیتے۔ ہم انسان ہیں۔ ہمیں خود کو فرشتہ نہیں بنانا۔ دنیا میں رہنے کے لیے تھوڑی سی خود غرضی، کڑواہٹ، بے مروتی کی ضرورت ہوتی ہے ابو ان سے نا آشنا تھے۔ اسی بات نے انہیں خونی رشتوں سے بہت دکھ بھی دیا اور دوستوں سے دھوکا بھی ...... لیکن اللہ کا احسان ہے اس نے اپنی عافیت میں رکھا۔ ابو سے میں نے سیکھا ہے بغیر جتائے دوسروں کے کام آنا اور ان کے عیب ڈھانپنا۔ ابو کو گئے برسوں بیت گئے ہیں لیکن ہر شخص کے پاس ان سے وابستہ اچھی یاد، بات اور عزت ہے اس سے بڑا رب کا احسان کیا ہوگا، کہ نیک نامی ہمارا سرمایہ عزت ہے۔

(2) واہ، میرا پسندیدہ، مطلب کا سوال ہے۔ اصل کردار تو یہی سپورٹنگ کردار ہوتے ہیں۔ اور ثمرہ بخاری کی کردار نگاری بہترین ہے۔ میں نے بہت کم عمری میں ان کا ناول "یہ اہل دل حسن ہیں دھرتی کا" پڑھا تھا۔ ردا بہ اس کی ہیروئین تھی اور اس کی کزن پلس فرینڈ ثمن (غالباً یہی نام تھا) مجھے ثمن کا کردار پسند ہے اور اب تک یاد ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ معاشرے میں بہت کم ہیں۔ دوسروں کی جیت پر تالیاں بجانے والے، دکھ میں کندھا دینے والے، بھرم رکھنے والے، یہی لوگ دھرتی کا اصل حسن ہیں۔ ورنہ ہم تو خوب صورتی یا ذہانت یا دولت کی خوبی کو سہار نہیں سکتے اور اپنا حق جان کر فرعون بن بیٹھتے ہیں۔ سو دھرتی کا حسن ہماری ذہانت یا خوب صورتی نہیں بلکہ عام سے نظر آنے والے خاص لوگ ہیں۔ دوسرا کردار "نمل" کی حنین ہے۔ کچھ منفی، کچھ مثبت، کچھ غلط، کچھ صحیح، بزدل، ظالم، جذباتی ...... لیکن اپنی اصلاح کرنے والے کردار۔ جس میں ارتقاء ہے۔ ہر لڑکی کی اس میں کسی نہ کسی طرح جھلک ہے۔ کم یا زیادہ ...... بہر حال ہے۔ میں نے اس کردار کو زمر اور فارس کے کرداروں سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے پڑھا ہے۔

(3) دل ہی تو ہے جس نے اس بزم گاہ میں تماشا سجا رکھا ہے۔ کبھی ٹھنک جائے تو کبھی اٹک جائے۔ ساری شرارتیں، جسارتیں اس دل ہی کی تو ہیں۔ دماغ صاحب تو کنٹرول روم میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس شعر کے ساتھ مجھے ایک لیڈر اور ان سے وابستہ خواتین یاد آ گئیں۔

☆

آمنہ ریاض

کیف کو خبر ملتی ہے کہ قلعے کے اصل مالکان آ رہے ہیں تو وہ ان کی آمد سے پہلے قلعے میں گھسنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ زرگل، کیف اور یاسر تینوں قلعے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں یاسر ایک پراسرار وجود کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

رونے کی آواز وسامہ کی تھی۔ منفرا اور خوش نصیب کو وہ دوسری منزل سے ملتا ہے۔ دونوں اس واقعے سے پریشان ہو جاتی ہیں۔ منفرا کیف سے مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سلمان احمد کے گھر میں آگ لگ جاتی ہے، اس واقعے کو آیو گھمتی سے منسوب کر کے سلمان احمد بہانے سے کیف کو اپنے گھر سے نکال دیتا ہے، کبیر بابا کیف کو بستی میں چور مشہور کر دیتے ہیں۔

بالآخر کیف، فلک بوس پہنچ جاتا ہے۔ کیف اور منفرا کو کبیر بابا مشکوک لگتے ہیں۔ خوش نصیب کے پاس شامیر کی تصویر دیکھ کر منفرا اس سے واقفیت کا اظہار کرتی ہے مگر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

کیف رات کو اس کمرے کی تلاشی لینے جاتا ہے جہاں وسامہ پراسرار انداز میں پہنچ گیا تھا، خوش نصیب اور منفرا اسے تلاش کرتی ہوئی خود بھی وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ایک حیرت ناک منظر نظر آتا ہے۔

چھبیسویں قسط

دروازہ کھلنے کی آواز سے اس کرسی پر بیٹھے وجود کو ہلکا سا جھٹکا لگا مگر اس نے گردن موڑ کر ان کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ وجود جیسے پہلے سے واقف تھا کہ وہ دونوں وہاں ضرور آئیں گی۔

دوسری جانب کیف کے وجود میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ جیسے ان دونوں کی موجودگی سے قطعی ناواقف تھا۔

خوش نصیب کی آنکھیں خوف سے پھٹنے کے قریب تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ اٹھتی، منفرا نے اپنا ہاتھ تیزی سے اس کے منہ پہ جما دیا۔ خوش نصیب جو منفرا کی موجودگی کو یکسر فراموش کر بیٹھی تھی، اس کی اس حرکت پر بری طرح کسمسا کر رہ گئی۔ منفرا نے اس کے منہ کو ہاتھ کی مدد سے بند کیے کیے سختی سے نفی میں گردن ہلائی تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ خوش نصیب چیخنے کی غلطی نہیں کرے گی تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا۔ وہ خوش نصیب کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے آگے بڑھی تھی مگر کیف کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

''بچے......'' وہ جیسے کراہی تھی۔ اسے یکدم اپنی بے وقوفی کا شدّت سے احساس ہوا تھا۔

اس نے خوش نصیب کی جانب دیکھا، لیکن اس کی نظریں کیف پر تھیں۔ وہ مڑنا چاہتی تھی لیکن خوش نصیب نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے کیف کی طرف لے آئی تھی۔

وہ دونوں ہی خاموشی سے کیف کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھیں۔

وہ سفید لبادے والی بول رہی تھی۔

''میں ایک راز ہوں۔''

☆☆☆

میں ایک راز ہوں۔

ایک سربستہ راز۔

ایک ایسا اسرار جو کئی سالوں سے قلعہ فلک بوس کی دیواروں سے لپٹا ہوا ہے اور بشام کے پہاڑوں میں گشت کرتا پھرتا ہے۔

میرے نادیدہ وجود سے بہت کے قصے مشہور ہوئے اور فلک بوس کی دیواروں پر اپنا نقش چھوڑ کر ان حسین وادیوں میں گم ہو گئے۔

میں، ایک سوال، ایک معمہ۔

ایک نہ سلجھنے والی گتھی۔

میں ایک ہیولا، جو احساس کی چوکھٹ پر دستک دیتا ہے۔

دکھائی نہیں دیتا۔

میں سماعت کا وہ گمان...... جس کا مفہوم کبھی واضح نہیں ہوتا..

کیونکہ میں ایک سایہ ہوں۔

ایک آسیب۔

ایک بھٹکی ہوئی روح۔

جسے قلعہ فلک بوس کی دنیا میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہی میرا مسکن، یہی میری آماجگاہ۔
نہ میں اپنی تخلیق کے راز سے واقف نہ اپنی فنا سے آگاہ۔
میں فقط اک راز ہوں......
ایک بھٹکی ہوئی روح......
میں آیوشمتی ہوں......

ہاں......
میں آیوشمتی ہوں۔
اور لوگ سمجھتے ہیں میں ان کا وہم ہوں۔
ایک غلط فہمی۔
میں ان کو چھو کر گزروں تو ہوا کی سرسراہٹ۔
بات کروں تو سانپ کی پھنکار......
کسی چیز کو گرا کر متوجہ کرنا چاہوں تو دہشت کا نشان......
فلک بوس کے باسی......مجھ سے ڈرتے ہیں، خوف کھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔
وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تو وہ بھی مجھے نظر نہیں آتے۔
حالانکہ میں وہ ہوں۔
جو ان کے رازوں کی امین ہوں۔
میں نے وہ سب سنا جو کسی نے نہیں سنا۔
میں نے وہ سب دیکھا جو کبھی کسی کو دیکھنے نہیں دیا گیا اور کبھی کسی کو دکھائی ہی نہیں دیا۔
وہ میری کہانیاں نگر نگر بیان کرتے ہیں لیکن میں نے ان کے راز آج تک فاش نہیں کیے۔
کیوں نہیں کیے......پتا نہیں......
شاید اس لیے کیونکہ میں آیوشمتی ہوں......
ہمیشہ زندہ رہنے والی۔
اور زندہ رہنے کے لیے بڑے کشٹ اٹھانے پڑتے ہیں۔
چپ رہنا پڑتا ہے......مگر اب میں چپ رہ رہ کر اکتا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بولوں اور لوگوں کو وہ بتاؤں جو میرے دل میں آج تک چھپا رہا ہے۔ ان تمام الزاموں کی صفائی دوں جنہیں مجھ سے منسوب کر دیا گیا۔ میرے سینے میں بہت سی کہانیاں دفن ہیں۔ کیا تم ان میں سے کوئی کہانی سننا چاہو گے؟
چلو میں تمہیں ان دو لڑکوں کی کہانی سناتی ہوں جن کو میں ان کے بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ جن کو میں نے معصوم ننھے بچوں سے جوان ہوتے دیکھا ہے۔ جن کے عروج سے لے کر زوال تک کی کہانی سے میں واقف ہوں۔ وہ دونوں بھائی ہر سال یہاں آتے تھے۔
ان میں سے ایک بڑا تھا۔ جس کی آنکھیں ذہانت سے چمکتی تھیں۔ عام سے نقوش جن سے بڑا پن جھلکتا تھا لیکن وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ جس قدر عام شکل و صورت کا مالک تھا، اس قدر اس کے لفظ خوبصورت تھے جو قلم سے نکلتے تو ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے تھے۔

اور وہ...... اس کا چھوٹا بھائی...... وہ بے مثال تھا۔ وہ اتنا خوبصورت تھا کہ اس پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ جو اسے دیکھ لیتا نظر نہ ہٹا پاتا۔ وہ ایسا تھا کہ اگر نظر بھر کر کسی کو دیکھ لیتا تو اس انسان کو پتھر کا بنا ڈالتا۔ کسی ریاست کے مغرور شہزادے جیسا۔ جو گھوڑے پر سوار آتا ہے، دیکھتا ہے اور فتح کر لیتا ہے۔ وہ حسین تھا۔ خدا نے اسے اس قدر فرصت سے بنایا تھا کہ اگر لکھنے والے اس کی خوبصورتی پر لکھنا چاہیں تو لفظ کم پڑ جائیں۔

وہ معاویہ تھا۔ معاویہ اردشیر ازی۔ فلک بوس کا مالک۔ فلک بوس کا شہزادہ۔

اور وہ دوسرا لڑکا...... وہ وسامہ طالب تھا۔ مشہور لکھاری وسامہ طالب جو معاویہ کا بڑا بھائی تھا۔ اس کا کزن، اس کے ماموں کا بیٹا......

ان دونوں کی مثال یک جان دو قالب کی سی تھی۔ معاویہ کے لیے وسامہ لازم و ملزم تھا۔ وسامہ کی حیثیت سامری جادوگر کے اس طوطے کی سی تھی جس میں اس کی جان قید تھی۔

یہاں تک حالات ٹھیک ٹھاک تھے۔ مسئلہ تب شروع ہوا جب اس سامری جادوگر کا وہ طوطا اس کہانی کے تیسرے کردار کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

ہاں اس کہانی میں ایک تیسرا کردار بھی تھا۔ اور وہ تھی آئے کت۔

آئے کت۔ جو آئی اور اس نے سب کی زندگیوں کو تہ و بالا کر دیا۔

مجھے لگتا ہے تم ایسے سمجھ نہیں پا رہے۔ رکو...... میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ وہ ساری تفصیل جسے کوئی بھی نہ جان سکا۔

☆☆☆

وہ کمرہ نمبر چار کی مریضہ کو دوا کھلا کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی جب وہ نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور پوری طاقت سے اس ٹکرا گیا۔

وہ ہل کر رہ گئی۔ ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی ٹرے زمین پر گری اور شیشے کی بوتلیں زمین پر گرتے ہی ایک چھناکے سے ٹوٹتی چلی گئیں اور ان میں بھری دوائی نے زمین پر کچھ نقش و نگار بنا ڈالے۔ آئے کت نے دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید اس وقت وہ بھی دوائیوں کے ساتھ زمین پر گری نظر آتی۔ اس نے تلملا کر اس پہلوان کو دیکھا، جس نے آ کر اسے ٹکر ماری تھی۔

اور پھر وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا خوبصورت تھا۔

بے حد خوبصورت۔

ترکش ڈراموں کے ہیرو جیسا۔

وہ ہیرو جو اس کی کمزوری تھے۔

وہ خوبصورتی کے پیچھے دیوانی تھی۔ چاہے وہ خوبصورت منظر ہوں یا خوبصورت انسان...... وہ نظر نہ ہٹا پاتی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لمحہ بھر میں ہی اس کا دل اس کے ہاتھوں سے نکل کر اس نوجوان کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس نوجوان کو دیکھتی چلی جا رہی تھی جو تیز بولنے کے ساتھ ساتھ پیچھے کوریڈور کی جانب اشارہ بھی کر رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ سن سکی۔ اس کی بات سننے کے لیے اس کا حواسوں میں آنا ضروری تھا۔

اس لڑکے کو جیسے ہی اپنی بات نہ سُنے جانے کا احساس ہوا تھا، اس نے آئے کت کے کندھے کو دبوچ کر اسے ہلا ڈالا تھا۔

"آئے کت......! آپ میری بات سن رہی ہیں؟ میرے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ آپ چل کر اسے دیکھیں۔"

آئے کت نے بڑی مشکل سے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔ اس بندے کی خوبصورتی نے اسے اس بات پر بھی حیران نہ ہونے دیا کہ وہ اسے نام سے اس کے مخاطب کر رہا تھا جبکہ وہ اس سے پہلی بار مل رہی تھی۔

"میں......میں......ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"نہیں......ڈاکٹر کو بلانے کسی اور کو بھیجیں......آپ میرے ساتھ چلیں آئے کت! میرے بھائی کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے فوراً۔" فرمائشی انداز......

"دیکھیے، میں صرف نرس ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ڈیوٹی پر موجود ہیں، میں ان کو بلا لیتی ہوں۔ وہ آپ کے بھائی کو پراپرلی چیک کرلیں گے۔" آئے کت نے سمجھانا چاہا۔

"ارے تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہیں۔" وہ جھنجلایا۔

اسی وقت اس کے دو اور ساتھی وہاں آگئے اور آئے کت سے ضد کرنے لگے کہ وہ چل کر ان کے پیشنٹ کو چیک کرلے۔

اسی دوران ڈاکٹر نعمان بھی وہاں آگئے تھے۔ ان کے وہاں آتے ہی باقی دو لڑکے تو وہاں سے کھسک گئے تھے۔ لیکن وہ لڑکا آگے بڑھ کر پرسکون انداز میں ڈاکٹر سے بات کرنے لگا تھا۔ اس گفتگو کے دوران آئے کت پرسکون ہو کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔ ان کی گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوا کہ اس لڑکے کا نام معاویہ ارد شیرازی تھا اور اس کا بھائی ہائی کنگ کے دوران سلپ ہوگیا۔ اس کے پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر نعمان نے اس کی ساری بات سننے کے بعد آئے کت کو ساتھ آنے کو کہا اور وہ لوگ اس کوریڈور کی طرف بڑھ گئے، جس طرف اس لڑکے کا بھائی ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

اپنی شفٹ ختم ہونے کے بعد وہ اسپتال کے باغیچے میں رکھے ایک بینچ پر جا بیٹھی تھی۔ ہاسٹل جانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ ویسے بھی آج کل وہ ڈبل شفٹ میں کام کر رہی تھی۔ اس کا ذہن بھٹک بھٹک کر معاویہ ارد شیرازی پر جا اٹکتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اسے بھول نہیں پا رہی تھی۔

اور یہ تو اس کا بچپن کا مسئلہ تھا۔ وہ جب جب، جہاں جہاں کوئی خوبصورت چہرہ، کوئی خوبصورت چیز یا منظر دیکھ لیتی تو گھنٹوں اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہ پاتی تھی۔

وہ ترکی ہیرو جیسا لڑکا بھی اب اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بنیادی طور پر ترکی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔۔۔ اس کی پہلی محبت۔۔۔ اور ترکی جانا اس کا بچپن کا خواب۔۔۔ ایسا ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

اس کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اس کا باپ پاکستانی جب کہ ماں ترکی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ کسی ڈگری کے حصول کے لیے ترکی گیا تھا۔ واپسی پر ڈگری تو وہ لایا ہی تھا، ساتھ ساتھ اس کی ترکش بیوی اور

چھوٹی سی آئے کت بھی ساتھ تھی۔ اس کے باپ کے خاندان کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا کیونکہ ان کے خاندان میں رشتے خاندان کے اندر ہی کرنے کا رواج تھا۔ اس کے باپ کی منگنی بھی خاندان میں زبانی کلامی کی جا چکی تھی۔ آگے وہی ہوا جو ان حالات میں ہوتا ہے۔ اس کی دادی نے اپنا دوپٹا بیٹے کے قدموں میں ڈال دیا اور اس کے باپ کے سب دعوے پانی کا بلبلہ ثابت ہوئے۔

ٹھیک ایک مہینے بعد آئے کت کی ماں روتی دھوتی واپس ترکی چلی گئی۔ اس کے کردار پر کچھ الزام لگائے گئے تھے اور وہ شاید اس کے باپ سے بے انتہا محبت کرتی تھی جو اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی تھی۔ مزید ظلم یہ تھا کہ آئے کت کو بھی ماں سے جدا کر دیا گیا تھا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تین سال بعد ہی ایک ایکسیڈنٹ میں آئے کت کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی زندگی میں بھی اس کی زندگی کچھ آسان نہیں تھی۔ اس کے ساتھ گھر والوں کا سلوک کسی ناجائز بچے کا سا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد تو کسی ہمدردی کی امید رکھنا ہی بے کار تھا۔ اس کے دادا، دادی کا انتقال پہلے ہی ہو گیا تھا اور اس کی سوتیلی ماں اور تایا تائی اسے ساتھ رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی ماں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ آئے کت کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن اس کی ماں سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ نتیجتاً اس کے تایا نے ایک دن اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے یتیم خانے میں چھوڑ گئے۔ پھر کبھی مڑ کر کسی نے اس کی خبر نہ لی۔

یہاں سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس کی عمر فقط پانچ سال تھی۔ اس کے ذہن پر جو ایک خوبصورت چہرہ نقش تھا، وہ اس کی ماں کا تھا۔ ان کی کچھ تصاویر اب بھی اس کے پاس موجود تھیں۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت بچی تھی اور اپنی ماں کی خوبصورتی پر دل و جان سے عاشق......وہ اکثر خواب بھی ایسے ہی دیکھتی تھی۔ جس میں اس کی ماں پری کی صورت آتی تھی اور اسے اپنے ساتھ ترکی لے جاتی تھی۔ لیکن اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور وہ عمر کے مراحل طے کرتی چلی گئی۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی، اس کے دماغ میں یہ بات پختہ ہوتی چلی گئی کہ اگر وہ کامیاب زندگی گزارنا چاہتی ہے تو اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ نمبر ایک آپ خوبصورت ہوں اور نمبر دو آپ امیر ہوں۔ وہ اپنے نام کی مانند خوبصورت تھی اور اب اسے پیسہ کمانا تھا۔ بے شمار پیسہ۔

اس نے پیسے کمانے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ جس یتیم خانے میں رہ رہی تھی وہاں سے آٹھ سے چودہ سال کے بچوں کو گھروں میں کام کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا اور یقیناً اس عمل سے جو پیسے ملتے تھے اس پر یتیم خانے کے مالک کا ہی حق تھا۔ آئے کت کو بھی کام کرنے کے لیے بھیجا جانے لگا۔ سب سے پہلے اسے ایک ایسے گھر میں کام دلایا گیا جہاں کی مالکن کا اپنا ایک انسٹی ٹیوٹ تھا جہاں خواتین کو مختلف ہنر سکھائے جاتے تھے۔ یہ ادارہ اس نے اپنے گھر میں ہی قائم کر رکھا تھا۔

آئے کت نے وہاں سے دیکھ دیکھ کر نئے نئے ہنر سیکھنا شروع کیے۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے نٹنگ کا کام سیکھا لیکن مہارت حاصل کر لینے کے باوجود اس کام میں زیادہ پیسہ اس کے ہاتھ نہیں آ سکا۔ اس نے اپنی خوبصورتی کا فائدہ اٹھا کر پیسہ کمانے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا اور پھر اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہاتھ کی صفائی پر بھی کام کیا اور جلد ہی اس کام میں بھی طاق ہو گئی۔ چھوٹی موٹی چوریاں اس کی عادت بنتی چلی گئیں۔

چودہ سال کی عمر میں وہ ایک اور گھر میں کام کرنے لگی جہاں اس کی دوستی اس گھر کے ڈرائیور سے ہو گئی۔ آئے کت کی اٹھان اچھی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، خوبصورت نقوش، وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ڈرائیور آئے کت کے عشق میں مبتلا تھا۔

دو سال تک وہ اس گھر میں ملازمت کرتی رہی تھی۔

مقامی سطح پر بنے ہوئے اس یتیم خانے میں سولہ سال کی عمر میں پہنچنے والی لڑکیوں کو جسم فروشی جیسے کاموں میں ملوث کر دیا جاتا تھا۔ آئے کت اس بات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ شاید یہ کام بخوشی کر لیتی اگر اسے اس کام سے پیسہ ملنے کی امید ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ گھروں میں کام کر کے کمائے جانے والے پیسوں کی طرح اس کام کے پیسے بھی مالکان کی جیب میں جائیں گے۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس ڈرائیور کی مدد سے یتیم خانے سے فرار ہو گئی۔ اس بندے نے آئے کت کو اپنے ایک دوست کی مدد سے کسی ڈاکٹر کے گھر میں کام دلوا دیا۔ آئے کت کی بھولی بھالی صورت نے اسے، اس گھر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے میں بہت مدد دی۔ گھر کا مالک ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھا جس کا شہر میں اپنا ایک بڑا اسپتال تھا۔ آئے کت کی فرمائش پر اس نے آئے کت کو اپنے اسپتال میں نرسنگ کا کام سیکھنے پر لگا دیا۔ نرسنگ کا کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ آئے کت نے جو کام کیا تھا، وہ بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بنانے کا تھا۔ اس کام میں اس کی خوبصورتی نے اس کا بڑا ساتھ دیا تھا جس سے فائدہ اٹھانا وہ بہ خوبی سیکھ چکی تھی۔

نرسنگ کا کورس وہ مکمل کر ہی چکی تھی۔ اب وہ کچھ اور کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اس گھر کے مالک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ممکن تھا کہ وہ اس کام میں کامیاب بھی ہو جاتی لیکن وہ خدا خوف رکھنے والا شخص تھا، چنانچہ آئے کت نے بڑے آرام سے اس پر دست درازی کا الزام لگا دیا۔ بدنامی کے خوف سے اس بندے نے آئے کت کو کچھ رقم ادا کر دی اور آئے کت راتوں رات اس گھر، اس شہر اور وہاں کے لوگوں کی زندگی سے غائب ہو گئی۔

اور اب...... وہ یہاں تھی۔ اس اسپتال میں اس نے اپنے تعلقات کو استعمال کر کے جاب حاصل کی تھی۔ پچھلے دو سال سے وہ نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی اور یہاں آ کر اس نے کوئی بڑا کارنامہ بھی سر انجام نہیں دیا تھا۔ اس نے یہاں خود کو ایک قابل عزت انسان کے طور پر پیش کیا تھا جس کے دل میں خوف خدا تھا اور جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے یہ کام کر رہی تھی۔

یہ ایک مشہور و معروف اسپتال تھا۔ یہاں اسے اپنے کام کا اچھا معاوضہ مل جاتا تھا۔ لیکن صرف معاوضہ اس کے خواب پورے کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ کسی ایسے انسان کی تلاش میں تھی جو اس کا ہاتھ تھامے اور اس کے سارے خواب پورے کر دے۔

اور آج اسے اپنی منزل نزدیک آتی محسوس ہوئی تھی۔ معاویہ اردشیرازی ہی وہ شخص تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھا اور بے تحاشا امیر بھی۔۔۔ اب اسے بس ایک پلان کی ضرورت تھی۔۔۔ اور پلان اس کے پاس تیار تھا جس پر عمل کرنے کی شروعات تو وہ کر ہی چکی تھی۔

معاویہ اردشیرازی اپنے بھائی کو اسپتال لے کر آیا تھا جو ہائی کنگ کرتے ہوئے اپنے پیر کو زخمی کر بیٹھا تھا۔ معاویہ کے بے حد اصرار پر وسامہ کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی

گئی تھی کہ وسامہ کو کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی اور اس کی موچ بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی مگر اس کے بے حد اصرار پر معاویہ کو اسپتال میں داخل کرلیا گیا تھا اور آئے کت کو خصوصی طور پر اس کی دیکھ بھال پر بھی مامور کر دیا گیا تھا۔

پچھلے دو دن سے وسامہ اسپتال میں موجود تھا۔ اور ان دو دنوں میں معاویہ بھی زیادہ تر اسپتال میں ہی پایا جاتا تھا۔ ان دو دنوں میں ہی اس نے وسامہ سے اچھی سلام دعا کرلی تھی۔ وہ وسامہ کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ اگرچہ وسامہ کو کسی خاص دیکھ بھال کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی آئے کت اس پر بے حد مہربان تھی کیوں کہ وہ یہ جان چکی تھی کہ معاویہ، وسامہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ اکثر بیٹھ کر وسامہ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اگر معاویہ موجود ہوتا تو وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہو جاتا تھا۔ آئے کت حیران ہوتی تھی کہ بھائی ہونے کے باوجود ان کی شکل وصورت میں اتنا تضاد کیوں تھا۔ معاویہ جس قدر خوبصورت تھا، وسامہ اتنا ہی عام شکل وصورت بلکہ کسی حد تک بدصورت تھا لیکن یہ آئے کت کے خیالات تھے جس کی آنکھوں کو کوئی عام چیز جچتی ہی نہ تھی۔ اس کا خوبصورتی کا معیار بے حد بلند تھا۔

چنانچہ اس نے وسامہ کے بارے میں ایسا کچھ سوچنے کی زحمت بھی نہ کی جو وہ معاویہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی کہ معاویہ ایک بے حد جذباتی اور کسی حد تک بے وقوف انسان ہے۔ وسامہ کی محبت میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اگر وہ اسے اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے تمام خواب پورے ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔

اپنے بارے میں ایک فرضی کہانی بھی آئے کت انہیں سنا چکی تھی جس کے مطابق اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور ماں ترکی میں رہتی تھی۔ وہ خود دو سال پہلے ترکی سے پاکستان آگئی تھی کیوں کہ اسے پاکستان بہت پسند تھا۔ اور نرسنگ اس کا جنون تھا کیوں کہ اسے لوگوں کی خدمت کر کے سکون ملتا تھا۔ وسامہ اس کے بارے میں جان کر بے حد متاثر ہوا تھا جس کا اس نے برملا اظہار بھی کیا تھا۔

☆☆☆

''ہاں جی اب کیا پلان ہے؟ تین دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں پڑے ہوئے۔ ایک لڑکی نہیں پھنسا سکے ابھی تک؟'' معاویہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

''لینگویج پلیز......'' وسامہ نے ناک چڑھائی۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں لڑکی پھنسا نہیں رہا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' معاویہ نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''ایک بات نہیں ہے یار۔'' وسامہ بے چارگی سے بولا۔ ''وہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو؟ اگر میں اسے پسند نہ آیا تو؟'' وسامہ کے لہجے میں انجانے خدشات بول رہے تھے۔

معاویہ کو وسامہ پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''کسی کی کیا مجال کہ میرے بھائی کو ریجیکٹ کرے...... اتنا مت ڈرو وسامہ...... وہ چاہ کر بھی تمہیں انکار نہیں کر پائے گی۔'' معاویہ نے پورے یقین سے کہا تھا۔

''تم نہیں سمجھو گے معاویہ! تمہارے نزدیک تو مجھ سے زیادہ اچھا اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ لیکن

یار......" وسامہ بات مکمل نہیں کر سکا تھا کیونکہ معاویہ نے بور ہو کر درمیان میں ہی اسے ٹوک دیا تھا۔
"او بس کردو بھائی! خود کو انڈر رایسٹیمیٹ نہ کرو۔ کہاں ہیں وہ سارے الفاظ جن کے ذریعے تمہارے ہیرو اپنی ہیروئن کو پروپوز کرتے ہیں۔ یاد رکھنا وسامہ! اگر آج بھی تم نے اسے پروپوز نہ کیا تو لکھاری برادری کی ناک کٹ جائے گی۔" معاویہ اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وسامہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"بولو......؟ کرو گے نا آج تو پروپوز؟" معاویہ نے منّت بھرے انداز میں بات جاری رکھی۔ "یار! میں تنگ آ گیا ہوں ہاسپٹل کو دیکھ دیکھ کر۔"
وسامہ ہنس دیا۔
"اچھا ٹھیک ہے ختم کرو یہ ڈراما......بس ڈسچارج کرواؤ مجھے یہاں سے۔۔۔۔ پروپوز کرنے کو بعد میں دیکھ لیں گے۔"
"یعنی تم ہمّت نہیں کرو گے؟" معاویہ جھنجلایا۔
"یار مجھے تھوڑا ٹائم دو...... یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" وسامہ افسردگی سے بولا تھا۔
معاویہ اگلے کتنے ہی لمحے اسے خفگی سے گھورتا رہا پھر جیسے تھک کر مسکرا دیا۔
"میں پروپوز کر دوں؟" معاویہ کا لہجہ سراسر چڑاتا ہوا تھا۔
بے ساختہ مسکراہٹ وسامہ کے چہرے کو روشن کر گئی۔
"ہاں کر دو۔" اس نے شرارت کا جواب شرارت سے ہی دیا تھا۔
معاویہ نے بھنویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ یہی لمحہ تھا جب کمرے کا دروازہ کھول کر آئے کت اندر داخل ہوئی تھی۔ معاویہ نے چہرہ موڑ کر پیچھے دروازے کی جانب دیکھا پھر اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔
"ہاں بھئی، شادی کرو گی؟" وہ شرارت سے چمکتی آنکھیں آئے کت پر گڑی تھیں۔
وسامہ کو اس سے اس حرکت کی امید نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ معاویہ کو ٹوکتا اس نے آئے کت کی آواز سنی تھی۔
"ہاں کروں گی۔"
وسامہ کو اپنے ہاتھ پاؤں شل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ خوشی کی انتہا پر پہنچ کر اس نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ آئے کت کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وسامہ کچھ کہتا، معاویہ "یاہو۔" کا نعرہ لگا کر اس سے لپٹ گیا۔
"مبارک ہو بھائی! بھابھی مان گئیں۔" وہ خوشی سے چیخ رہا تھا۔
وسامہ خوشی کی شدّت سے کچھ بول نہیں پایا۔ آئے کت شرما کر پلٹی اور کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

"میں پروپوز کر دوں؟"
آئے کت دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے ہی والی تھی جب اس نے معاویہ کی آواز سنی تو وہ ٹھٹک گئی۔
اسے دوپہر کے وقت کوریڈور میں ہونے والی مڈبھیڑ یاد آ گئی جس میں معاویہ نے اس کے لیے کسی

سرپرائز کا ذکر کیا تھا اور ساتھ ہی آنکھیں گھما کر کہا تھا کہ وہ کوشش کرے گا کہ آج وہ سرپرائز اسے ضرور مل جائے۔

لمحہ بھر میں ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔اسے اپنے خواب...... اپنا ارادہ، بغیر کسی محنت کے پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔اس نے مزید انتظار کرنا مناسب خیال نہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

اس کے اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ معاویہ اس کی جانب مڑ کر بولا تھا۔

''ہاں بھئی شادی کرو گی؟'' چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ لیے وہ پوچھ رہا تھا۔اس کا پرپوزل بھی اس کی طرح منفرد تھا۔بے نیاز سا انداز...... جیسے شادی کا نہ پوچھ رہا ہو۔کافی پلانے کی دعوت دے رہا ہو۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس کا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔ ''ہاں کروں گی۔۔۔'' وہ بولی تھی۔

اور پھر اگلے ہی لمحے پورا اسپتال جیسے اس کے سر پر آ گرا تھا۔معاویہ اپنے بھائی کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اس کے لیے بھابھی کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔آئے کت کو اپنے ہاتھ پاؤں سُن ہوتے محسوس ہوئے تھے۔اسے کچھ لمحے لگے تھے اصل صورت حال سے واقف ہونے میں۔اسے لگا تھا کہ وہ مزید کھڑی نہیں رہ پائے گی۔وہ تیزی سے مڑی اور قریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اس کے قدم اسٹاف روم میں آ کر تھمے تھے۔وہ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔آنسو تیزی سے اس کی آنکھوں میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔وہ رونا نہیں چاہتی تھی تب ہی بے دردی سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا۔اسے پلان بی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''ہیلو......'' وہ ایک دم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔وہ چونک گئی۔

''ہائے......'' آئے کت نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔معاویہ نے اس کے اس عمل کو غور سے دیکھا اور پھر شرارت سے ہنسا۔

''بھئی مجھ سے کیوں شرما رہی ہو؟ جس سے شرمانا ہے وہ تو کمرے میں پڑا ہے۔''

آئے کت نے اس کی شرارت کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''کوئی کام ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں...... کام تو ہے۔ایکچوئلی مجھے کسی کام سے جانا ہے اور وسامہ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔تو کیا تم کچھ دیر اسے کمپنی دے سکتی ہو؟'' اس نے زندہ دل سی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالتے ہوئے کہا تھا۔

''سوری معاویہ! میرے ڈیوٹی آورز ختم ہو چکے ہیں۔'' اس نے رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''یار......! تھوڑی دیر کی بات ہے۔وعدہ رہا، میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا...... پلیز نا...... اسی بہانے تم وسامہ سے باتیں بھی کر لینا۔'' وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

آئے کت اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

خوبصورتی سے متاثر ہونے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ آپ خوبصورت شکل والوں کی بات کو ٹال نہیں پاتے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی تھی۔ "مگر پلیز جلدی واپس آ جانا۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔"

"تھینک یو سو مچ۔" معاویہ خوشی سے بولا تھا۔

وہ ہاسپٹل سے باہر جانے والے راستے کی جانب مڑ گیا تھا جب کہ آئے کت وسامہ کے کمرے کی جانب چل پڑی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل اس مصیبت سے نکلنے کے طریقے سوچنے میں مصروف تھا۔ اسے ہر حال میں وسامہ سے جان چھڑانا تھی۔ وہ کسی عام صورت انسان سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ بھی اس صورتحال میں کہ معاویہ کی صورت میں اس کا خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے تھا۔

کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خود کو سنبھالا۔ تھا اور کمرے میں داخل ہو گئی وسامہ بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی اور اسے اپنے اعصاب پر سکون ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وسامہ سو چکا تھا۔

پرسکون سانس بھرتے ہوئے وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزیں ٹھیک کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس چلی گئی تھی اور پردہ کھسکا کر کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور اسے اپنا دماغ پرسکون ہوتا محسوس ہوا۔

کھڑکی سے ٹیک لگا کر اس نے منہ موڑا اور وسامہ کی جانب دیکھنے لگی۔

"تم کیوں آ گئے ہو...... اس سب کے درمیان......" اس نے جھنجلا کر وسامہ کو خاموشی کی زبان میں مخاطب کیا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ پھر اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر وسامہ کے بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وسامہ سلیپ پیرالسس کا شکار تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بظاہر دیکھنے میں کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر اس کے چہرے پر ہلکا سا اضطراب تھا۔ اس کے دائیں بازو کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے جب کہ ہاتھوں کی انگلیاں قدرے اندر کو مڑی ہوئی تھیں جیسے وہ چادر کو تھامنے کی کوشش کر رہا ہو۔

سلیپ پیرالسس نیند کے دوران شعور اور لاشعور کے اس درمیانی حصے کو کہتے ہیں جہاں انسان کا دماغ نیند میں جاگ جاتا ہے لیکن جسم حرکت کرنے سے معذور رہتا ہے۔ اس حالت میں انسانی دماغ کوئی خواب دیکھ رہا ہوتا ہے اور کچھ غیر معمولی تصاویر انسانی دماغ میں ابھر آتی ہیں اور انسان خود کو ان غیر معمولی چیزوں کے ساتھ کمرے میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ سینے پر شدید بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے اور جسم حرکت نہیں کر پا رہا ہوتا۔ وہ اس حالت میں خود کو مردہ تصوّر کرتا ہے یا شدید خطرے میں۔ یہ حالت چند سیکنڈز یا منٹوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اس حالت میں اگر کوئی اور آپ کو جاگنے میں مدد دے تو اس حالت سے نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔

آئے کت نے وسامہ کی کسی طرح کی مدد کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ آنکھوں میں نفرت بھرے وہ دو تین سیکنڈز اس کی شکل دیکھنے کے بعد اس کی چادر درست کر کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ تقریباً دو منٹ بعد وسامہ نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دی تھیں اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ آئے کت تیزی سے اس کی جانب بڑھی اور اس کی کمر سہلانے لگی تھی۔

''کیا بات ہے وسامہ؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟'' وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے وسامہ کی حالت کے بارے میں علم نہ ہو سکا ہو۔

''ہاں......'' وسامہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ ''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ سہا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

آئے کت نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی جانب بڑھایا۔

''شاید آپ نیند میں ڈر گئے ہیں۔ کوئی بُرا خواب دیکھا ہے؟ لیں، پانی پی لیں۔''

وہ وسامہ کو پانی پلانے لگی۔

اس نے وسامہ کو پھر سے سونے کو کہا تھا لیکن وسامہ جاگتا رہا تھا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور آئے کت سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے سب سے پہلے معاویہ کی پھرتی کے لیے اس سے معافی مانگی تھی۔ وہ اسے اپنی محبت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

دو گھنٹے بعد جب معاویہ کمرے میں داخل ہوا تو آئے کت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ خوبصورتی کے بغیر رہنا آسان تھا، دولت کے بغیر نہیں۔ اس کا پلان بی تیار تھا اور اس نے وسامہ کو شادی کے لیے ہاں کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

کچھ دن بعد میں نے انہیں فلک بوس میں دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وسامہ کے والد نے آئے کت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وسامہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ معاویہ نے اس بار بھی وسامہ کا ساتھ دیا تھا اور ان دونوں کو ساتھ لے فلک بوس آ گیا تھا۔ حالانکہ اس کے والد اس بات کے سخت خلاف تھے۔ وہ ہمیشہ سے فلک بوس کی جگہ ایک شاندار ہوٹل تعمیر کرنا چاہتے تھے لیکن معاویہ نے ان کی ایک نہیں سنی تھی۔

وہ یہاں نہ بھی آتے تب بھی میں اردشیر ازی کو اس کے عزائم میں بھی کامیاب نہ ہونے دیتی۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ کوئی میری جنت کو نقصان پہنچائے۔ ہاں فلک بوس میری جنت ہی تو ہے۔ میں یہاں سالوں سے رہتی آ رہی ہوں۔ فلک بوس کو ہمیشہ سے میں نے آباد رکھا ہے۔ کتنے ہی انسان آئے اور چلے گئے۔ وہ میں تھی جس نے کبھی فلک بوس کو غیر آباد نہ ہونے دیا۔

اور اب یہ لوگ تھے۔ وسامہ اور آئے کت۔ نیا شادی شدہ جوڑا جو بہت سے خواب لیے یہاں آ کر رہنا شروع ہوا تھا۔ ان کے ساتھ معاویہ کا خاندانی ملازم اور اس کی بیوی بھی تھے۔ وہ اچھے لوگ تھے چنانچہ میں نے انہیں قبول کر لیا۔ وہ مجھے ستاتے نہیں تھے۔ تنگ نہیں کرتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے، دھیمے مزاج کے لوگ تھے۔ قہقہے فلک بوس میں تب گونجتے تھے جب معاویہ فلک بوس آتا تھا۔

لیکن......وہ لڑکی، آئے کت......وہ اتنی معصوم نہیں تھی جتنی نظر آتی تھی۔ وہ وسامہ کی بیوی ضرور تھی لیکن اس کی آنکھیں......وہ معاویہ کو دیکھتے ہوئے چمکتی تھیں۔

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وسامہ ایک ایکسیڈنٹ میں اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا تھا اور ان دنوں میں معاویہ فلک بوس میں ہی قیام پذیر تھا۔ میں نے ان دونوں کو ایک صبح باغیچے میں واقع تالاب کے کنارے نصب سفید پری کے سائے میں کھڑے دیکھا۔ معاویہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا اور آئے کت اداس......وہ

لوگ سرگوشیوں کی صورت بات کر رہے تھے۔
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا معاویہ! اب کیا ہوگا؟" آئے کت نے اداسی سے کہا۔
"تم پریشان نہ ہو...... میں وسامہ کو بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا۔ پاکستان سے باہر جانا پڑا تو میں یہ بھی کروں گا آئے کت۔" معاویہ نے اپنی پریشانی کو فراموش کر کے اسے تسلی دی تھی۔
آئے کت نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔
معاویہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر آئے کت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"پلیز رو مت...... دیکھو میں ہوں نا یہاں...... میں سب سنبھال لوں گا... وسامہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو پلیز۔" وہ اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔
آئے کت نے جواب نہیں دیا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔
معاویہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے آئے کت کو چپ کروائے۔
"آئے کت! پلیز چپ ہو جاؤ۔ میں ہوں نا۔ تم اکیلی نہیں ہو۔"
وہ سر اٹھا کر معاویہ کو دیکھنے لگی تو معاویہ نے تسلی دینے والے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کیا تم مجھے اپنا سکتے ہو معاویہ؟" جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے جیسے اپنے دل میں چھپے جذبات کا اظہار کر ڈالا۔
معاویہ کو اس کی بات سن کر جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" معاویہ غرایا تھا۔
اس کی آنکھوں میں شدید غصہ نظر آ رہا تھا۔
"مع...... معاویہ میری بات سنو۔" وہ ہکلا کر بولی۔ اپنی ہی بات کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ پھر اس نے معاویہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ "پلیز معاویہ! میں جو تمہیں بتانے والی ہوں شاید تم نے اس بارے میں سوچا تک نہ ہو۔ معاویہ! میں نے ہمیشہ تم سے ہی محبت کی ہے۔ میں ہمیشہ سے وسامہ میں نہیں، بلکہ تم میں انٹرسٹڈ تھی۔"
"کیا بکواس ہے یہ۔" معاویہ غصے سے بولا تھا۔ "اول تو مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو تم نے وسامہ کے پرپوزل کو ایکسیپٹ ہی کیوں کیا تھا؟"
"میں نے اس کا پرپوزل نہیں تمہارا پرپوزل ایکسیپٹ کیا تھا۔" آئے کت نے جیسے بے چارگی سے اعتراف کیا تھا۔
معاویہ سناٹے میں رہ گیا۔
وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم اور وسامہ سگے بھائی نہیں ہو۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وسامہ کے پاس دولت اور جائیداد کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔
اس نے کہاں سوچا تھا کہ نکاح کے فوراً بعد اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔
"میں تمہیں تب بھی بتانا چاہتی تھی لیکن۔۔۔ میری ہمت نہیں ہوئی۔ معاویہ میں کنفیوز ہو گئی تھی میں۔"
"میری بات سنو آئے کت۔۔۔!" معاویہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے نہیں

بتا کہ تم نے کیا سمجھا اور اس وقت سچ کیوں نہیں بتایا مگر...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب اس بات کو یہیں ختم سمجھو...... دوبارہ ایسی کوئی بات زبان پہ مت لانا۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے اندر جانے کو مڑ گیا تھا پھر ایک جھٹکے سے رکا۔

"ایک بات...... اگر وسامہ کو تمہارے کسی عمل سے تکلیف پہنچی یا اسے کبھی بھی اس بارے میں کچھ پتا چلا تو یاد رکھنا آئے کت...... تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

اس نے بات اتنی نفرت سے مکمل کی تھی کہ آئے کت مزید کچھ بول نہیں سکی۔

میں نے اوپر، کمرے کی کھڑکی سے سب دیکھا تھا اور ایک ایک لفظ سنا تھا۔

معاویہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر کی سمت جا رہا تھا اور آئے کت سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہیں تالاب کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔ پہلی بار اسے اپنی خوبصورتی فضول محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ہر حال میں معاویہ چاہیے تھا۔

"معاویہ اردشیرازی...... ! میں ہر حال میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ کیونکہ اب تم میری ضرورت نہیں میری ضد ہو۔۔۔ ایسی ضد جسے ہر حال میں پورا کرنا ہے چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد تک کیوں نہ جانا پڑے۔"

اس نے آنکھوں سے نکلنے والوں آنسوؤں کو ہتھیلی کی مدد سے پونچھتے ہوئے جیسے خود کو یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

معاویہ قریباً ایک مہینہ ان کے ساتھ گزار کر واپس جا چکا تھا۔ وسامہ کی حالت اب قدرے سنبھل چکی تھی۔ اگر چہ وہ ابھی بھی اپنی ٹانگ کھو دینے کے صدمے سے پوری طرح باہر نہیں آسکا تھا لیکن پہلے سے اس کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔

آئے کت نے معاویہ کے جانے سے پہلے اس سے اپنے رویّے کی معافی مانگ لی تھی۔ اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ معاویہ کا دل اپنی جانب سے صاف کر دے۔۔۔ معاویہ نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا مگر وہ اس دن کے بعد سے آئے کت کی جانب سے بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ اس کی تمام تر نرمی وسامہ کی ذات تک ہی مختص ہو کر رہ گئی تھی۔ اول تو وہ آئے کت کو خود سے مخاطب ہی نہیں کرتا تھا اور اگر وہ خود سے بات کرتی تب بھی وہ بہت روکھے پھیکے لہجے میں بات کا جواب دیتا تھا۔

آئے کت کے معافی مانگنے پر بھی اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بس اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

معاویہ کے جانے کے بعد آئے کت نے اپنے منصوبے کو مکمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دماغ کسی شیطان کی طرح تانے بانے بننے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے منصوبے کو تمام تر خامیوں سے پاک بنانا چاہتی تھی۔

اس نے جانے سے پہلے معاویہ کو اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ ان کے لیے ایک اور ملازم کا انتظام کر دے جو وسامہ کا خیال رکھ سکے۔ معاویہ نے کبیر کو ملازم کے انتظام کا حکم دیا تھا۔ کبیر نے معاویہ سے مشورے کے بعد اپنے بیٹے پاشا کو بھی وہاں بلوا لیا تھا۔

آئے کت نے بستی میں جا کر میرے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بستی سے واپس آرہی تھی جب جنگل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے پاشا کو دیکھا تھا۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔ آئے کت ایک درخت کی عقب میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ جلد ہی وہ ان دونوں کے رشتے سے واقف ہوگئی۔ پاشا اس لڑکی کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جلد ہی شہر میں کوئی کام تلاش کر لے گا اور اس کے بعد اپنے والد کو ان دونوں کے رشتے کے بارے میں بتا کر انہیں راضی کر لے گا، تب تک وہ صبر سے کام لے جبکہ وہ لڑکی خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

آئے کت کچھ دیر وہاں کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی پھر متبادل راستے سے ان کی نظروں میں آئے بغیر فلک بوس واپس آگئی۔ اس کی ملازم کی تلاش ختم ہو چکی تھی۔ اسے اب بس پاشا کو اپنے جال میں پھنسانا تھا اور اٹھارہ انیس سال کے بے وقوف سے لڑکے کو پھنسانا اس کے لیے کچھ ایسا مشکل کام نہیں تھا۔

☆☆☆

پاشا برآمدے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا ایک کیاری کی مٹی نرم کر رہا تھا جب آئے کت اس کے عقب میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ اپنے کام میں اتنا مشغول تھا کہ آئے کت کی موجودگی کو محسوس بھی نہیں کر سکا تھا۔

"کیسے ہو پاشا؟" آئے کت نے نرمی سے پکارا۔

پاشا اچھل پڑا۔ وہ بری طرح ڈر گیا تھا۔ آئے کت ہنس دی تو وہ اپنے ڈرنے پر شرمندہ ہو گیا۔

"کیا کر رہے تھے؟" آئے کت نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

رعب حسن تھا یا مالکن کے سامنے ہونے کا خیال...... وہ چند لمحے اپنے حواسوں پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"کچھ خاص نہیں بی بی! معاویہ صاحب نے بابا کو باغیچے کی حالت سدھارنے کا حکم دیا تھا۔ میں آج کل فارغ ہی ہوں اس لیے بابا کا ہاتھ بٹانے کے لیے یہ کام شروع کر دیا۔" وہ مؤدب لہجے میں بولا تھا۔

"اچھا......" وہ گردن اچکا کر کیاری کا جائزہ لینے لگی۔ "کیا کرتے ہو تم شہر میں؟"

"پہلے پڑھ رہا تھا، اب کام کی تلاش کر رہا ہوں بی بی۔" اس نے سر جھکا کر بتایا۔

"تا کہ تمہارے بابا تمہاری شادی اس لڑکی سے کروا دیں؟" آئے کت نے شرارت سے کہا۔

پاشا کے تو گویا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ ہکا بکا آئے کت کو دیکھ رہا تھا۔ جو معاملہ اس کا باپ بھی ابھی نہیں جانتا تھا۔ اس کے بارے میں مالکوں کو علم ہو چکا تھا۔ وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

آئے کت کو فوراً ہی اس کی پریشانی کا احساس ہو گیا تھا۔ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"ارے ڈرو مت...... تم تو پریشان ہی ہو گئے ہو۔"

پاشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے پریشان کھڑا تھا۔

"ڈرو مت پاشا...... ! مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں؟" آئے کت نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو...... کیسے......؟" پاشا نے جھجک کر پوچھا۔

وہ وقتاً فوقتاً سر اٹھا کر آئے کت کی جانب بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ پاشا کے لیے اپنی نظر پھیرنا مشکل ہو رہا تھا۔

آئے کت مسکرا دی۔

''میں نے کل تمہیں اور اسے دیکھا تھا۔ وادی سے واپس آتے ہوئے۔ جنگل میں ......'' اس کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ ''بہت خوبصورت ہے۔ تمہارے ساتھ جچے گی۔''
پاشا نے شرما کر مزید سر جھکا لیا۔
''تم اپنے بابا کو بتاتے کیوں نہیں اس کے بارے میں؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا اور خود برآمدے میں پڑی خوبصورت کین کی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔
''وہ مانیں گے ہی نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولا۔
''بیٹھ جاؤ پاشا ......'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''اور مجھے پوری بات بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔''
پاشا آگے بڑھا اور زمین پر کرسی سے کچھ فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔
اس لڑکی کا نام شہر بانو تھا۔ شہر بانو کا تعلق کبیر کے دشمنوں سے تھا۔ شہر بانو کے چچا نے کبیر خان کے چچا زاد بھائی کو کسی تنازعے پر قتل کردیا تھا اور خود فرار ہوگیا تھا۔ یہ دشمنی پاشا اور شہر بانو کی پیدا ہونے سے بھی پہلے سے چلی آرہی تھی اور اب تک قائم تھی۔ کبیر خان کبھی بھی دشمنوں کی بیٹی کو گھر میں نہ لاتا۔
''پھر ابھی میں کماتا بھی نہیں ہوں کہ بابا پر زور ڈال سکوں۔ ایک بار کمانا شروع کردوں تو بابا کو میری بات سُننا ہی پڑے گی۔'' وہ ایک عزم سے بولا۔
آئے کت بغور اس کی بات سنتے ہوئے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ چہرے پر بے وقوفی کی حد تک معصومیت تھی۔ اور یہی بے وقوفی اس کی باتوں سے بھی عیاں ہوتی تھی۔ وہ فطرتاً معصوم سا انسان تھا جو دوسروں کو بھی معصوم سمجھتا تھا، اس لیے اپنے دل کی بات کھل کر آئے کت کو بتاتا چلا گیا۔
''تم فکر مت کرو پاشا! میں اس کام میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔'' آئے کت نرمی سے کہہ رہی تھی۔
پاشا کی آنکھوں میں پہلے حیرانی پھر معصوم سی خوشی پھیل گئی۔
''آپ سچ میں میری مدد کریں گی؟''
''بالکل...... میں تمہارے بابا سے بات کروں گی۔ وہ ضرور مان جائیں گے۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتی کہ جیسے میں اپنی محبت کو پانے میں ناکام رہی ہوں، تم بھی ناکام رہو۔'' بات ختم کرتے کرتے اس کے لہجے میں اداسی جھلکنے لگی۔
پاشا کا دل افسوس سے بھر گیا۔
''تو کیا بی بی، وسامہ صاحب کے ساتھ خوش نہیں ہیں؟ کیا وہ کسی اور سے محبت کرتی تھیں؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا دل اپنی اتنی اچھی بی بی کی اداسی پر خود بھی اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ وہ چپ چاپ آئے کت کی شکل دیکھتا رہا۔
''خیر......'' آئے کت نے جیسے خود پر قابو پا کر بات کا آغاز کیا تھا۔ ''تم ابھی اپنے بابا سے کوئی ذکر مت کرنا۔ میں خود ان سے بات کروں گی اور جہاں تک تمہاری جاب کا تعلق ہے تو اس کے لیے بھی میں بات کرتی ہوں کسی سے......''

اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
پاشا نے بھی فوراً اپنی جگہ چھوڑی اور احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ اندر جانے کے لیے مڑی ہی تھی جب پاشا نے اسے پکارا تھا۔
''بی بی! کیا آپ......وسامہ صاحب سے......؟'' وہ بات مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔آئی کت کی ناراضی کا بھی خوف تھا۔
''ہاں ہاں بولو......کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' آئی کت نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔
''کیا آپ کسی اور سے محبت کرتی تھیں؟'' پاشا نے بڑی ہمت کر کے سوال کیا تھا۔ بہرحال اس موضوع کا آغاز تو آئی کت کی جانب سے ہی ہوا تھا۔
آئے کت کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ پاشا کو اپنے سوال پر افسوس ہونے لگا۔
''کبھی بتاؤں گی اس بارے میں تمہیں پاشا خان! ویسے بھی اب تو ہم دوست بن گئے ہیں تمہیں نہیں بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی۔'' آئے کت نے کہا تھا اور اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔
پاشا کا لفظ ''دوست'' پر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
میں نے کہا نا کہ وہ فطرتاً معصوم انسان تھا۔اس کے نزدیک لڑکا اور لڑکی کی دوستی کا ایک ہی مطلب تھا۔ اور وہ مطلب یقیناً دوستی نہیں تھا۔وہ حیرانی سے آئے کت کو دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
کوارٹر کی طرف سے آتے ہوئے کبیر خان کی نظریں پاشا پر جمی ہوئی تھیں۔اس کی پیشانی پر سوچوں کا جال بچھا تھا جب کہ نظریں پاشا کے انہماک کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

پھر ان باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔آئے کت اکثر پاشا کے پاس آ کر اس سے باتیں کرنے لگتی۔کبیر خان نے کتنی ہی بار ان کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا تھا اور اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ پاشا گھر کی مالکن سے اس طرح سے باتیں کرے۔
دوسری طرف پاشا دن بہ دن آئے کت کا گرویدہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔
ویسے بھی جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آئے کت بے چاری کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اور یہ کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی اور وسامہ نے زبردستی اس سے نکاح کیا تھا، تب سے اس کا دل آئے کت کی ہمدردی سے لبالب بھر گیا تھا۔اسے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا تھا کہ وسامہ اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا ہے۔
عورت خوبصورت ہو اور پھر مظلوم بھی تو مرد کا دل ہمدردی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔ایسا ہی کچھ پاشا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔پھر آئے کت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے بابا کو منانے میں اس کی مدد کرے گی سو اتنی ہمدردی تو وہ کر ہی سکتا تھا۔
آج بھی آئے کت کو باغیچے میں اکیلا دیکھ کر وہ اس کے پاس آیا تھا اور پاس آنے پر جب اس نے دیکھا کہ آئے کت رو رہی ہے تو وہ مزید افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی کرسی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا اور بے بسی سے روتے ہوئے دیکھنے لگا۔
اس کے لیے آئے کت کی اداسی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

''بی بی! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔
آئے کت نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے پاشا کی وہاں موجودگی سے بے خبر ہو۔
''پاشا...... تم کب آئے؟'' اس نے تیزی سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔
اس عمل کے دوران اس کی گرم شال ــ سر سے اتر کر اس کے چہرے اور گردن کو نمایاں کر گئی۔
پاشا دکھ بھری نظروں سے آئے کت کو دیکھنے لگا۔ اس کی گردن اور کان کے پاس کچھ سرخ اور نیلے نشان موجود تھے۔
آئے کت کو جوں ہی اس کی نظروں کا احساس ہوا، اس نے تیزی سے اپنی شال کو دوبارہ ــ سر پر اوڑھ لیا۔
''انہوں نے پھر آپ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔'' پاشا نے دکھی سے لہجے میں کہا۔
آئے کت نے ایک نظر اس پر ڈالی اور کچھ بولے بغیر سامنے کی جانب دیکھنے لگی۔
پاشا نے اس کی خاموشی کو بغور سنا اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔
''بی بی! میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں، میں کیا کروں؟'' پاشا نے پرعزم انداز میں پوچھا۔
آئے کت نے نرمی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ''تم میرے لیے دعا کیا کرو۔''
''وہ تو میں ابھی بھی کرتا ہوں۔ مگر میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ بی بی! آپ وسامہ سر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟'' وہ جذباتی سا ہو کر بولا۔
''ایسا ممکن نہیں ہے پاشا! معاویہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا، وہ اپنے بھائی کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں جانے کی کوشش کروں بھی تو بھی وہ مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ وہ زبردستی مجھے نکاح پر مجبور کر سکتے ہیں تو وہ مجھے یہاں سے نکلنے ـ کیوں دیں گے۔'' آئے کت کا چہرہ دنیا جہان کا ملال سمیٹے ہوئے تھا۔
پاشا نے سر جھکا لیا۔ وہ آئے کت کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔
''مگر...... مگر وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ مار دیں گے آپ کو...... مجھے نہیں لگتا کہ معاویہ سر بھی وسامہ سر کے اس مرض سے واقف ہیں۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو پاشا! معاویہ یقیناً اس بات کے بارے میں نہیں جانتا۔ اور وہ اس بات پر یقین کرے گا بھی نہیں۔ بھلا وہ میرے کہنے پر کیوں یقین کرے گا کہ اس کا بھائی ایک نفسیاتی مریض ہے۔ ایسا نفسیاتی مریض جو دورے کی حالت میں مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔'' آئے کت کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔
ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی جسے کچھ دیر بعد آئے کت نے ہی توڑا تھا۔
''صرف ایک طریقہ ہے میرے پاس...... اور وہ یہ...... کہ میں دنیا کے سامنے ثابت کروں کہ وسامہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔ اگر معاویہ کو اس بات پر یقین آ گیا تو مجھے اس عذاب سے نجات تو شاید پھر بھی نہ ملے لیکن شاید وہ اس کا علاج کروا دے اور میری زندگی کچھ آسان ہو جائے۔''
''آپ...... آپ نے کچھ سوچا ہے؟ کوئی طریقہ جس سے یہ بات کھل کر سب کے سامنے آئے؟'' پاشا

نے پرجوش ہو کر پوچھا۔
''ہاں پاشا! آزادی حاصل کرنے کے لیے تو پرندے بھی کوشش کرتے ہیں، میں تو پھر انسان ہوں۔ میں نے سوچا ہے مگر وہ طریقہ مشکل ہے اور میں اکیلی اس پر عمل بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے کسی کی۔''
''بی بی! میں کروں گا نا آپ کی مدد...... میں ہوں آپ کے ساتھ...... مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔'' پاشا جذباتی ہو کر بولا۔
''آپ مجھے بتائیں۔ آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟''
''معاویہ کو اس بات پر یقین تب آئے گا پاشا! جب وسامہ کی حالت اس کے سامنے بگڑے۔''
پاشا بغور اس کی بات سن رہا تھا۔
''اور اس کی حالت معاویہ کے سامنے تب ہی ایسی ہوگی اگر وہ کسی چیز سے ڈر جائے۔ کچھ ایسا ہو کہ اسے معاویہ کے سامنے دورہ پڑے۔ پھر معاویہ کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''
''اور ہم انہیں ڈرائیں گے کیسے۔'' پاشا نے تجسس سے پوچھا۔
آئے کت نے لفظ ''ہم'' پر بغور اسے دیکھا اور پھر اسے اپنا سارا منصوبہ مناسب کانٹ چھانٹ کے ساتھ بتاتی چلی گئی۔ پاشا ہونق سا اس کی ساری منصوبہ بندی سنتا چلا گیا تھا۔
''پر...... بی بی...... ایسے...... کیسے؟'' وہ گڑبڑا رہا تھا۔
''میری بات سنو پاشا! تم اچھی طرح سوچ لو...... سمجھ لو...... تمہارے جو تحفظات ہیں۔ ان پر غور کر لو۔ میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اگر پھر تمہارا دل راضی ہو تو مجھے بتا دینا۔ اور دل راضی نہ ہو تو ......تو مجھے زندگی کو ایسے برداشت کرنے کی عادت سی ہو چلی ہے۔'' کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے اپنے سر سے چادر کو کھسکایا تھا اور گردن کے نشانات پھر سے نمایاں دکھنے لگے تھے۔
وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اندر کی سمت چلی گئی تھی۔
اندر آنے کے بعد اس نے سر پر چادر کو دوبارہ سے کھینچ لیا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ وسامہ اسٹڈی ٹیبل کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے ایک نرم سی مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے آئے کت نے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی گردن کے گرد بازو باندھ لیے اور اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکا دی۔ وسامہ اس کی اس ادا پر مسکرا دیا۔
''کام ختم نہیں ہوا؟'' اس نے وسامہ کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے صفحات پر نگاہ دوڑائی۔
''بس تھوڑا ہی باقی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص نرم سے انداز میں بولا۔
''چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''نیک خیال ہے مگر آدھے گھنٹے بعد۔''
''ٹھیک ہے۔'' آئے کت مسکرا کر پیچھے ہٹی اور باتھ روم میں چلی گئی۔
چند ہی لمحوں بعد وہ شیشے کے سامنے کھڑی گردن پر میک اپ سے بنائے جانے والے ان نشانات کو صاف کر رہی تھی۔

☆☆☆

اور پھر کچھ ہی دن کے بعد فلک بوس میں میرے نام سے ایک نئے کھیل کا آغاز ہوا۔۔۔ ایک ایسا

کھیل جس کی بنیاد آئے کت کے شیطانی دماغ نے رکھی تھی۔
اس کھیل کا آغاز مری ہوئی گلہریوں کے اس ڈھیر سے ہوا تھا جنھیں پاشا نے جنگل سے جال لگا کر پکڑا تھا اور پھر مار کر فلک بوس کے ایک تہ خانے کی طرف جانے والے راستے پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد دو دن چار دن کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ وسامہ کو ان مری ہوئی گلہریوں کا ڈھیر تب ملا تھا جب ان کے جسم گل سڑ کر بدبو دینے لگے تھے۔ وسامہ نے پاشا کو بلا کر پوچھ گچھ کی تھی۔
"یہ کیا ہے؟ یہاں کتنے عرصے سے صفائی نہیں ہوئی پاشا؟" وسامہ نے ناگواری سے کہا۔
"مجھے اس بارے میں پتا نہیں صاحب! آپ جانتے ہیں، میں کل ہی شہر سے آیا ہوں۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔
"کبیر بابا کو بلاؤ۔" وسامہ نے پاشا کے والد کا نام لیا تو پاشا تھوڑا محتاط ہو گیا۔
"وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد ان کی واپسی ہے۔" پاشا نے وسامہ کی ناپسندیدگی کو بغور جانچتے ہوئے کہا تھا۔
پاشا سے وسامہ نے وہ جگہ صاف کرنے کے لیے کہا ساتھ ہی اسے تاکید کی کہ جب تک وہ یہاں ہے صفائی ستھرائی کے کاموں کی نگرانی کرے۔ پاشا نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور اس نے ایسا کیا بھی تھا مگر وسامہ کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ آئے کت کے پوچھنے پر اس نے پورا واقعہ من و عن اس کے گوش گزار کر دیا۔
آئے کت نے بڑے سرسری سے انداز میں کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے فلک بوس سے اپنے خوف کا اظہار کیا تھا۔ "اکیلی تہ خانہ تو کیا، فلک بوس کے کسی حصے میں گھومنے کی ہمت نہیں کر سکتی میں۔"
"ارے ایسی کیا بات ہے یہاں؟"
"اتنی پرانی عمارت ہے یہ... اور بہت عرصہ غیر آباد بھی رہی ہے... سنا ہے ایسی جگہوں پر بھوت پریت اور روحیں بسیرا کر لیتی ہیں... اگر کسی روز کوئی جن میرے سامنے ہی آ کر کھڑا ہو گیا تو میں تو ایک منٹ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔" آئے کت نے مزاحیہ سے انداز میں کہا تھا لیکن وسامہ چونک سا گیا۔
اسے بے ساختہ بچپن میں، میرے بارے میں سنی ہوئی کہانی یاد آئی تھی مگر جلد ہی وہ اس سوچ کو ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
اگلے دن سے فلک بوس کی صفائی ستھرائی کا کام مزید جانفشانی سے ہونے لگا اور وسامہ کے نزدیک بات ختم ہو گئی۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ پریشان کن واقعات کا ایک سلسلہ تھا جو مری ہوئی گلہریوں کے اس ڈھیر سے شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایسا اکثر ہی ہونے لگا۔ اکثر ہی مری ہوئی گلہریاں ملنے لگیں اور وہ مری ہوئی گلہریاں صرف وسامہ کو ہی ملتی تھیں۔
پہلے پہل وسامہ نظر انداز کرتا رہا لیکن جب یہ واقعات بڑھے تو وسامہ چونک گیا۔ اب گلہریوں کے جسم گلے سڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر ان کے جسم پر خون بہہ بہہ کر خشک ہو چکا ہوتا تھا۔ وسامہ کا قیاس تھا کہ ضرور فلک بوس میں کوئی جنگلی کتا یا بلی گھس آتی ہے اور درختوں پر پھدکتی گلہریوں پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔
اس کے اس خیال کا رخ جلد ہی میری ذات کی جانب موڑ دیا گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ پاشا نے ایک گلہری مار کر درخت کی کھوہ میں رکھ دی جس کی نشاندہی آئے کت نے کی۔

''ڈرومت آئے کت! یہ ضرور کسی بلی کا کام ہے۔'' وسامہ نے ادھر ادھر اپنے اندازے کی درستی کے لیے نظریں دوڑائیں۔

''میرا نہیں خیال...... بلی کا کام ہوتا تو وہ یوں گلہری کو چھوڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ آخری ہڈی بھی بھنبھوڑ کر رکھ دیتی...... یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی درندے نے اپنی نفسیاتی تسکین کے لیے اس بے چاری گلہری کا سر کاٹا ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بول رہی تھی۔

''اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گلہریوں کا قتل آیوشمتی کر رہی ہو۔'' پاشا آئیوری کی باڑھ کے پیچھے سے نکلا۔ وہ دونوں ابھی تک اس کی وہاں موجودگی سے ناواقف تھے۔

''تم یہاں کب آئے پاشا...... ہم نے تمہیں نہیں دیکھا۔'' آئے کت نے کہا۔

''میں پچھلی کیاری کی گوڈی کر رہا تھا۔ نیچے بیٹھا ہوا تھا اس لیے آپ کو نظر نہیں آیا۔'' پاشا نے مسکرا کر کہا ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی کھرپی ان کے سامنے کی۔ اس کے ہاتھ اور کھرپی مٹی میں لت پت تھے۔

''اور یہ تم کیا کہہ رہے تھے۔ گلہریوں کے بارے میں؟''

پاشا کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ آگئی۔ ''معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کی بات سن لی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وسامہ نے کہا۔ ''لیکن تم کیا کہہ رہے تھے؟'' اسے تجسس ہو رہا تھا۔

''میں کہہ رہا تھا، ہوسکتا ہے ان گلہریوں کو آیوشمتی مار رہی ہو۔ سنا ہے اس کی روح فلک بوس میں کئی سالوں سے بھٹک رہی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' آئے کت نے ایسے کہا جیسے اسے پاشا کی بات پر یقین نہ ہو۔

وسامہ کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔

''اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ الٹا سیدھا بولنے کی عادت ہے اسے۔'' بابا کبیر کہیں سے برآمد ہوئے پاشا کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ پاشا سٹپٹا گیا۔

''کہانی دلچسپ لگ رہی ہے۔ مجھے سننے تو دو۔'' آئے کت نے بابا کبیر سے کہا اور بات سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔

''تمہیں ہر الٹی بات میں دلچسپی ہوتی ہے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔۔۔ کبیر! مجھے دوبارہ کوئی مرا ہوا جانور یہاں نظر نہیں آنا چاہیئے۔'' وسامہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو چکا تھا۔

جس وقت وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے برآمدے تک پہنچے لان میں کھڑے پاشا کو بابا کبیر سے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

آئے کت نے وادی میں سنی ہوئی میرے نام سے منسوب کہانی وسامہ کو سنا دی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وسامہ میرے ذکر سے خوفزدہ رہنے لگا ہے تو وہ اکثر میرا ذکر کر کے وسامہ کو ڈرانے لگی۔ وہ ہر دوسرے دن میرا کوئی قصہ وادی سے نکال کر لاتی اور مزے لے لے کر وسامہ کو سناتی۔ سب کچھ اس کے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ وسامہ جو کہ بچپن سے ہی کچھ ڈرپوک واقع ہوا تھا' وہ بے حد خوفزدہ رہنے لگا۔ اس نے دوسری منزل پر جانا کم کر دیا۔ آگے پیچھے اس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ وسامہ کے دل میں آیوشمتی کا

شک یقین پکڑتا چلا گیا۔ فلک بوس سے مری ہوئی گلہریاں ملنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔
پھر آہستہ آہستہ وسامہ کو ڈرانے کا لطف کم ہونے لگا۔ وسامہ بھی آہستہ آہستہ اس ذکر کا عادی ہو چلا تھا۔
معاویہ نے آیئے کت کے لیے نٹنگ مشین اور نٹنگ کا ضروری سامان بھجوا دیا تھا کیوں کہ آیئے کت اپنا کام شروع کرنا چاہتی تھی۔ وسامہ کو دکھانے کے لیے آیئے کت دن رات نئے نئے ڈیزائن بنانے لگی۔
آیئے کت کے مصروف ہونے سے قبل ہی مری ہوئی گلہریوں کے ملنے میں کمی آ گئی تھی لیکن وسامہ کے دل میں خدشہ سا بیٹھ گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے دن پورے فلک بوس کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی راہداریوں میں گھومتا پھرتا، کمروں میں جھانکتا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس نے گھومنا پھرنا کم کر دیا۔ اس نے بھی کسی سے کہا نہیں لیکن بچپن میں سنے اور پڑھے ہوئے جن بھوتوں کے قصے کہانیاں اس کے ذہن و دل پر ایسا گہرا تاثر چھوڑ چکی تھیں کہ ان کا اثر ستائیس سال کی عمر میں بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ "مرے پر سودرتے" یہاں ایک اصلی روح کا ذکر ہو رہا تھا جس کے بارے میں وادی کے چند لوگوں کا دعوا تھا وہ اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہ اپنے ڈر کا ذکر بھی کسی سے نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے بزدل سمجھا جاتا اور یہ بات اس کی مردانگی کو ہرگز گوارا نہ تھی۔
اس رات طوفان آیا تھا۔ آسمان پر بجلی کے کوڑے برس رہے تھے اور تیز ہوائیں در دیوار سے سر ٹکراتی پھرتی تھیں۔ وسامہ نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ طوفان کے شور سے بھری پراسرار رات فلک بوس کے دالان میں اتر آئی تھی۔ اس نے پردہ برابر کر دیا اور ٹی وی دیکھنے کے ارادے سے دوسری سمت میں بڑھا۔ لیکن ابھی اس نے دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ اسے ڈرانے کی نیت سے باہر کھڑے پاشا نے کھڑکی پر دستک دی اور فوراً ایک طرف ہو گیا۔
وسامہ چونک کر پلٹا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بری طرح حیران ہوا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے ذرا آگے ہو کر بند شیشے سے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے اب بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔
اس نے پردہ برابر کیا اور واپس ہوا۔ اس بار پھر اس کے پلٹتے ہی شیشے پر دستک ہونے لگی۔
وسامہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بار وہ پردہ ہٹائے۔ لیکن دستک بڑھتی جا رہی تھی۔ وسامہ نے ہمت جمع کی اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ پردہ سرکا دیا۔ پردہ ہٹتے ہی دستک بند ہو گئی۔ دستک دیتا پاشا فوراً نیچے بیٹھ گیا تھا۔ وسامہ کو یہی نظر آیا کہ باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ وسامہ بری طرح دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا پیڑ پودوں سے سر پٹخ رہی تھی۔
وسامہ کا ایک ہاتھ ابھی تک پردے کو پکڑے ہوئے تھا، وہ جوں ہی پیچھے ہٹنے لگا، بند شیشے کے دوسری طرف ایک دم سے پاشا سامنے آ گیا۔ یہ سب اتنا غیر متوقع اور اچانک ہوا تھا کہ وسامہ بری طرح دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔
وسامہ نے غصے سے پاشا کو اندر بلایا۔ اور اس سے اس بدتمیزی کی وجہ پوچھی مگر پاشا مسلسل اس عمل سے انکاری تھا۔ وسامہ نے اسے کام ختم کر کے وہاں سے جانے کا حکم دیا اور خود کمرے میں چلا گیا تھا۔ وسامہ کے جانے کے فوراً بعد برآمدے میں موجود کبیر وہاں آ گیا تھا اور پاشا کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کوارٹر میں لے گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے کبیر خان! کیا بات ہے؟'' پاشا کی ماں گھبرا کر آگے بڑھی لیکن کبیر نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے پاشا خان؟'' کبیر نے غصے سے اس کا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑا اور چیخا تھا۔

''کیا بابا؟'' پاشا قدرے گھبرا گیا تھا۔

''تم وسامہ صاحب سے اس طرح کیسے پیش آسکتے ہو؟'' کبیر کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''بابا۔۔۔میں۔۔۔'' اس نے صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

یہ کوشش بری طرح ناکام رہی تھی کیوں کہ کبیر کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس کے منہ پر نشان چھوڑ گیا تھا،

''کیا وہ تمہارے دوست ہیں؟ یا کوئی ایسا قریبی رشتہ جس کی بنا پر تم ان سے یہ گھٹیا مذاق کرو؟''

''بابا میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔میں تو کھڑکی۔۔۔''

پاشا بات مکمل نہیں کر سکا تھا۔ اس سے پہلے ہی کبیر نے ایک اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

''میں نے خود تمہیں کھڑکی پر دستک دیتے اور انہیں ستاتے ہوئے دیکھا ہے پاشا خان......! اس لیے مجھ سے یہ مت کہو کے تم نے کچھ نہیں کیا۔''

پاشا ہاتھ پر گال رکھے ان کی شکل دیکھ رہا تھا مگر اس وقت صفائی دینا ضروری تھا۔ اس نے پھر سے بولنے کی کوشش کی۔

''بابا میری بات تو سنو۔۔۔''

کبیر نے ایک اور تھپڑ مار کر اسے چپ کرا دیا۔

''بد بخت انسان۔۔۔جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ میں نے وسامہ صاحب کو

کچھ نہیں بتایا کیونکہ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ان کو اپنے بیٹے کے کالے کرتوت بتا سکوں۔"
"آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ اتنا غصہ کر رہے ہیں۔۔۔؟" وہ جھنجلا کر بولا تھا۔
"میں پچھلے کتنے ہی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم آئے کت بی بی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہو۔۔۔انہیں چھپ چھپ کر دیکھتے ہو۔۔۔تمہارے ذہن میں کیا خناس بھرا ہے' میں اچھے سے جان گیا ہوں۔"
پاشا کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔اس کا باپ کیا سوچ رہا ہے اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
"اپنا سامان باندھ کر رکھو پاشا خان۔۔۔میں تمہیں جلد واپس شہر بھیج رہا ہوں۔تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں عزت دار لوگوں کے ساتھ رکھا جائے۔"
"آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے' مجھے کم از کم صفائی پیش کرنے کا موقع دیں۔" پاشا گھبرا کر بولا تھا۔ وہ شہر بانو کو چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
"میں فیصلہ کر چکا ہوں۔۔۔اور اسے اب کوئی نہیں بدل سکتا۔"
کبیر فیصلہ سنا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے چلی گئی تھی۔جبکہ پاشا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھتا چلا گیا۔
لیکن اگلے روز بابا کبیر کو کچھ بتانے کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ اس نے وسامہ سے سامنا ہوتے ہی وضاحتیں دینا شروع کر دی تھیں۔اس کا کہنا تھا وہ رات کو پاشا کے ساتھ آیا تھا لیکن چونکہ اندر اس کا کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ کچھ فاصلے پر ہی رک گیا تھا اور جس وقت وسامہ نے اندر سے پاشا کے لیے دروازہ کھولا بابا کبیر کچھ فاصلے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اگر پاشا نے مسلسل کھڑکی پر دستک دی ہوتی تو ضرور یہ بات اس کے نوٹس میں آجاتی۔
اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جھوٹ بول دیا تھا لیکن اس جھوٹ نے وسامہ کے دل میں میرے بارے میں اور خوف بھر دیا تھا اور اس شک کو تقویت خاتون بی بی کی باتوں نے دی تھی۔جس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے میراذ کر وہاں چھیڑ دیا تھا۔اور کھڑکی پر دستک کو میری کارستانی بتا کر وسامہ کو تلاوت قرآن کا مشورہ دیا تھا۔ وسامہ نے کبیر کو اس لڑکے کو حویلی میں بلانے کا کہا جس پر بقول بستی والوں کے' میں نے حملہ کیا تھا اور وہ خوف سے ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا مگر کبیر ایسا نہیں کر سکا کیوں کہ وہ لوگ کب کے بشام چھوڑ کر جا چکے تھے۔
بس ثابت ہوا کہ قسمت آئے کت کا ساتھ دے رہی تھی۔

☆☆☆

وسامہ کا خوف اس کے اعصاب کو متاثر کرنے لگا تھا۔اسے ہر وقت ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے اور یہ احساس شام کے بعد سے بڑھنا شروع ہو جاتا تھا۔وہ جس راہ داری سے گزرتا' جس جگہ جا کر بیٹھتا اسے ایسا لگتا تھا جیسے دو آنکھیں مستقل اس کے چہرے پر لگی ہوئی ہیں اور اس کی ایک ایک حرکت' ایک ایک جنبش کو نوٹ کر رہی ہیں۔ایک بار پھر وسامہ نے اسے اپنے دماغ کا خلل سمجھا اور خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب اس کا وہم ہے لیکن آئے کت نے اس کے وہم کی تائید کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔اس نے وسامہ سے کہا تھا کہ وہ اپنے نٹنگ کے کام میں بے حد مصروف رہتی ہے لیکن اس دوران اسے بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔

وسامہ کا خود پر نظر رکھے جانے کا احساس جیسے جیسے زور پکڑتا گیا ویسے ویسے اس کی کارکردگی متاثر ہوتی گئی۔ کیونکہ اس کے معاشی معاملات کا دارومدار ان ہی پیسوں پر تھا جو اسے مختلف جرائد اور پبلشرز کے لیے لکھنے پر ملتے تھے سو اس نے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنا زیادہ وقت اسٹڈی میں کتابیں پڑھنے میں گزارنا شروع کر دیا۔ اس چیز نے اس کی طبیعت پر بہتر اثر ڈالا تھا اور اس کی کارکردگی بھی بہتر ہو گئی تھی۔

ان ہی دنوں میں سے ایک دن میں آئے کت نے ایک موٹا تازہ چوہا اس کے اسٹڈی ٹیبل پر رکھے ایک پیالے کے نیچے چھپا دیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وسامہ اس بہادری کا مظاہرہ کرے گا لیکن وسامہ نے ایک دم اس پیالے کے حرکت کرنے پر اسے الٹ دیا اور چوہا چھلانگ لگا کر اس کی گود میں آ گرا۔ وسامہ ہڑبڑاہٹ میں کرسی سمیت زمین پر گرا تھا۔ چوٹ بھی آئی تھی لیکن اس کا خوف ختم ہو گیا تھا۔

یہ آئے کت کے لیے لحہ فکریہ تھا۔ وہ اپنی ساری بازی کو یوں ضائع جاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سو اس نے ایک نیا ڈراما تیار کیا جس کو پورا کرنے میں قدرت نے اس کا پورا ساتھ دیا تھا اور وسامہ کا سویا ہوا ڈر پھر سے جاگ گیا۔

آئے کت نے معاویہ کے کمرے سے کچھ قیمتی سامان چرایا اور اسے توڑ پھوڑ کر کر اس کمرے میں چھپا دیا جہاں اس کی نٹنگ کی مشین رکھی تھی۔ اگلے دن وہ اور وسامہ وادی کی سیر کو گئے تھے اور سیر پر جانے سے پہلے اس نے اپنے تیار کردہ تمام نٹنگ کے نمونے بھی ضائع کر کے کمرے میں چھوڑ دیے تھے۔ وادی سے واپسی پر کبیر نے وسامہ کو معاویہ کے کمرے سے سامان چوری ہونے کی اطلاع دی تھی۔

پولیس کو بلایا گیا۔ مناسب کاروائی بھی ہوئی اور وسامہ کے کہنے پر پولیس کا ایک بندہ چوکیدار کے فرائض دینے گیٹ پر جا بیٹھا۔ پاشا ابھی تک فلک بوس میں ہی موجود تھا اور اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ابھی بھی آئے کت کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے ایک سفید چادر کو درخت پر اس طرح پھنسایا کہ تیز ہوا چلنے پر ایسا لگتا تھا کہ کوئی سایہ ہوا میں لہرا رہا ہو۔ اس چادر کو روح سمجھ کر وسامہ تو خوفزدہ ہوا سو ہوا۔۔۔ دروازے پر بیٹھا پولیس والا بھی خوفزدہ ہو کر فلک بوس سے نکلتا چلا گیا اور جنگلی کتوں کا شکار بن گیا۔۔۔

یہ دوسرا بڑا واقعہ تھا جسے بشام واسیوں نے پورے اہتمام سے میرے نامہ اعمال میں شامل کر دیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سمیرا حمید

ٹرین میں وہ میرے عین سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور میں اس کے۔ وہ کتاب پڑھ رہی تھی' اور میں اسے۔ اس کے بال بھورے تھے اور آنکھیں نیلی، چہرے پر اداسی تھی اور کچھ غصہ بھی۔ پہلے تو میں اپنے موبائل پر ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ پھر بور ہو کر باہر جھانکنے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ میں اس لڑکی کا جائزہ بھی لے رہا تھا جس نے ایک بار بھی نظر اُٹھا کر مجھے نہیں دیکھا تھا اور اس چیز نے مجھے تکلیف دی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کوئی ایک گھنٹے سے آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہو اور وہ ایک بار بھی نظر اُٹھا کر نہ دیکھے تو کتنا برا لگتا ہے۔

''کوئی زبردستی تو نہیں ہے کہ میں تمہیں دیکھوں۔'' کتاب پڑھتے پڑھتے اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا اور یقین جانئیں کہ حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ اس نے میری سوچ لفظ بہ لفظ پڑھ لی تھی۔

''سوری، میں سمجھا نہیں......؟'' میں نے اپنی شرمندگی چھپانے کی بچکانہ سی کوشش کی۔

وہ طنز سے ہنسی۔ ہاتھ سے اپنے بال شانے سے پیچھے کیے اور کتاب کو بند کر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ تھوڑی فرصت اور زیادہ غصّے سے مجھے گھور رہی تھی یعنی جو مجھے پہلے ایک نظر نہیں دیکھ رہی تھی' اب پوری طرح سے صرف مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

''تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ تم پچھلے ایک گھنٹے سے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔''

وہ تو میں جانتا تھا لیکن وہ کیوں اور کیسے جانتی تھی۔ حد ہے وہ میری ذات میں تانک جھانک کر رہی تھی۔

''میں اپنی اسائنمنٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''آنکھیں پیاری ہیں لیکن تھوڑی سی اور بڑی ہوتیں تو اور اچھی لگتیں۔ اور یہ بال......اف' زہر لگتا ہے مجھے جب لڑکیاں ایسے چڑیلوں کی طرح بالوں کو نیلا پیلا کروا لیتی ہیں۔ یہ بھی ایک چڑیل ہی ہے۔ امریکا کی ایک یہی بات بہت بُری ہے' یہاں ہر کوئی منہ اٹھا کر کچھ بھی کر لیتا ہے۔''

اس نے سارے لفظ چبائے اور میرے منہ پر دے مارے۔ میں اندر تک خوف سے سمٹ گیا۔ کیا وہ میری ساری سوچیں پڑھ رہی تھی......ایک ایک...... مطلب کہ لفظ بہ لفظ......یعنی کہ حرف بہ حرف......

''ایک ایک......مطلب کہ لفظ بہ لفظ......'' وہ طنز سے ہنس دی۔

جیسے ہی اس نے یہ کہا' یقین جانئیں میں اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔ میں واقعی میں خوف زدہ ہو چکا تھا۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتی ہو؟''

ویسے تو وہ صرف میری سوچ پڑھ رہی تھی لیکن میں یہ سمجھا کہ وہ میری جان لینے والی ہے۔ مجھے کوئی بلی چوہا بنا دینا چاہتی ہے یا کسی غار میں لے جا کر بند کر دینا چاہتی ہے۔

''بنے بنائے چوہے کو میں پھر سے چوہا کیوں بناؤں گی؟ بے وقوف۔'' کہہ کر وہ دوبارہ سے

کتاب ـــــ پڑھنے لگی۔

اب ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری ہونے لگا تھا۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ جو کچھ ہمارے دماغ میں چل رہا ہوتا ہے اس پر صرف ہمارا حق ہوتا ہے۔ ویسے بھی دماغ میں چلنے والی باتیں بتانے والی کہاں ہوتی ہیں۔ یہ فسادی باتیں واہی تباہی باتیں جھگڑالو باتیں ہوتی ہیں۔ انہیں زبان سے نہیں نکالا جا سکتا۔

باہر موسم سرد تھا...... میں لڑکی سے اپنی نظریں بچاتے ہوئے باہر جھانک لیتا تھا۔

اندر موسم گرم تھا...... وہ اب گاہے بگاہے آنکھ کی کمان اٹھا کر مجھے دیکھ (گھور) لیتی تھی۔

میں نے اپنے دماغ کو کسی اور کام میں لگانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن یقین جانیں دل اور دماغ دونوں بہت بے ایمان، تھوڑے لوفر اور زیادہ لفنگے

ہوتے ہیں۔ جو نہیں سوچنا چاہیے، وہی سوچتے ہیں۔ جس شخص کو دماغ سے نکال دینا چاہیے اسے ہی زبردستی پکڑ کر بٹھا دیتے ہیں جس خیال کو جھٹک دینا چاہیے، اسے ہی یہ گلے سے لگا کر، مہمان بنا لیتے ہیں۔ یہ دل اور دماغ، سچ کہوں تو ہمارے پکے دشمن ہیں۔ یہ عین موقعے پر مرواتے ہیں۔

پانچ منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد بھی میرا دماغ سامنے بیٹھی لڑکی کو سوچنے پر بضد رہا۔ میں سر جھٹک رہا تھا' مووی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زیر لب گانا گنگنا رہا تھا۔ سفید برف' تیز بھاگتی ٹرین اور آنے والی چھٹیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا...... پھر بھی...... میرا دماغ...... اُف یہ دماغ...... چپ کر جا یار......

ٹھیک ہے ٹیکنالوجی بہت ترقی کر چکی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی سائنس دان کی اولاد، کچھ ایسا ایجاد کر لے جو ہماری سوچ پڑھ لے یا پھر ٹیلی پیتھی سیکھ کر دوسروں کو ایسے ذلیل ورسوا کرے۔

''میرے پاپا سائنس دان نہیں تھے اور میں ٹیلی پیتھی بھی نہیں جانتی۔''

اس نے زیر لب کہا۔ نظریں اس کی ابھی بھی کتاب پر ہی تھیں اور دھیان میری سوچ پر۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی کام کیوں نہیں کر لیتی تھی یا وہ کتاب پڑھ لے یا مجھے بے عزت۔

''شاید کوئی جادوگرنی ہے یہ......''

اس نے ٹھک کر کے کتاب کو زوردار آواز سے بند کیا۔ میرا دل بھی ٹھک کر کے جیسے بند ہی تو ہو گیا۔ میں کیا کرتا، میرا دماغ میری کسی بھی عرضی' منت' حکم' دھمکی کا اثر ہی نہیں لے رہا تھا اور وہی کر رہا تھا' جو اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اگر میرا دماغ انسانی شکل میں میرے سامنے آ جاتا تو میں اب تک اس کا گلا دبا چکا ہوتا۔ اسے ٹھنڈی جھیل میں ڈبو کر اس کا سانس بند کر چکا ہوتا۔ ورنہ ٹرین سے دھکا دے کر باہر پھینک چکا ہوتا۔

''میں تمہیں جادوگرنی لگتی ہوں؟ کون سی جادوگرنی ٹرین میں سفر کرتی ہے، کتاب پڑھتی ہے' کافی پیتی اور چپس کھاتی ہے؟''

''جادوگرنیاں ماڈرن بھی تو ہو سکتی ہیں۔'' میں نے زبان سے کہا۔ گو میں ڈرا ہوا تھا لیکن اب کیا کرتا' میں پھنس بھی تو چکا تھا۔

''دماغ کی طرح تمہاری زبان بھی کافی چلتی ہے۔'' غصے سے اس کے چہرے کے عضلات سکڑنے لگے تھے لیکن وہ تو غصے میں بھی بڑی کیوٹ لگ رہی تھی۔

اس نے پھر گھور کر مجھے دیکھا۔ ''میرا تھپڑ بھی بہت کیوٹ ہے اور میری سینڈل بھی، سمجھے! میرے بیگ میں ایک عدد اسپرے موجود ہے' جو امریکا کی ہر لڑکی تم جیسے لفنگوں کے لیے بیگ میں رکھتی ہے۔ سات سمندروں کے پانی سے آنکھیں دھو لو تو بھی جلن سے تین دن تک مچھلی کی طرح تڑپتے رہو گے۔''

اس نے بیگ کھولا' میں سمجھا وہ اسپرے نکالنے لگی ہے۔ میں ڈر گیا، جلدی سے اپنا بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کتاب کو بیگ میں رکھا اور میرے شانے کو ٹکر مارتی ہوئی آگے نکل گئی۔

ہمارا اسٹیشن آ چکا تھا...... ٹرین رُک چکی تھی۔

میرا دماغ بھی ٹھکانے آ چکا تھا...... اور وہ بھی تو جا چکی تھی۔

''مس ٹیلی پیتھی......'' میں اس کا نام نہیں جانتا تھا، میں اسے آواز دے کر روکنا چاہتا تھا لیکن کیسے روکتا۔ میں نے ہجوم میں جگہ بناتے ہوئے چلّا کر کہا اور ہاتھ بلند کر کے زور زور سے لہرانے لگا لیکن وہ رکی نہیں۔

"مس مائنڈ ریڈر......" میں پھر سے چلّایا۔
اس نے آواز سن لی تھی' پلٹ کر مجھے دیکھا بھی تھا' لیکن پھر بھی وہ رکی نہیں تھی۔
زندگی کے کچھ اتفاقات ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں، یہ اتفاق بھی ہمیشہ یاد رہنے والا تھا۔
وہ خوب صورت تھی لیکن اداس تھی۔
وہ سوچ پڑھ لیتی تھی لیکن اپنی سوچ چھپائے ہوئے تھی۔
ایسے لوگ روز روز کہاں ملتے ہیں۔ ایسے لوگ گم کر دینے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اسٹیشن کے ہجوم میں' میں کچھ دیر کے لیے گم صم کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے یاد کرنا پڑا کہ میں خواب میں نہیں ہوں۔ مجھے یاد کرنا پڑا کہ میں نے اسے حقیقت میں دیکھا ہے۔
"مجھے یاد رہا کہ میں اس کی سمت کھنچا چلا جا رہا ہوں۔"

☆☆☆

برفانی ہوا، دھند میں لپٹا شہر، میں اور میری سائیکل۔
میں سائیکل چلا رہا تھا اور میرا اکاؤبوائے ہیٹ ہوا میں اُڑ جانے کے قریب تھا۔ میں تھوڑا سا ڈھیٹ بھی واقع ہوا ہوں، میں نے رُک کر ہیٹ کو اُتار کر اپنے کراس بیگ میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بھی میرے سر پر جمے رہنے کی ضد نہیں کی اور "تیز ہوا کے سنگ اُڑ گیا" تھا تو وہ سستا لیکن مجھے پسند بہت تھا۔ اب وہ اڑ چکا تھا تو میں پچھتا رہا تھا کہ اتنی تیز ہوا میں اسے پہننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے گھر پر ہی آرام کرنے دیتا۔ موسم کی مناسبت سے تو اونی ٹوپی پہننی چاہیے تھی لیکن اتنی عقل ہوتی تو آج میں بل گیٹس نہ ہوتا۔
خیر کچھ کھا پی لینے کے خیال سے میں ایک کیفے کے باہر رکا۔ سائیکل کھڑی کی اور اندر آ گیا۔ جس وقت میں اپنے دستانے اُتار کر، سر کو گھما کر کیفے کے اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وقت میں قریب قریب برف کا پتلا بن جانے کے مراحل میں تھا سفید اور یخ۔
کونے کی میز پر، کھڑکی کے پاس وہ بیٹھی ہوئی تھی وہ اور اس کے سامنے میز پر میرا ہیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔
آپ نے دنیا جہاں کی فلمیں دیکھی ہوں۔ مسٹری اور فینٹسی کہانیاں پڑھی ہوں اور پھر آپ کو کوئی فلموں جیسا کردار حقیقی زندگی میں مل جائے تو آپ اسے ایسے ہی جانے دے سکتے ہیں؟ نہیں نا تو پھر اس دن میں نے اسے کیوں جانے دیا تھا؟ یہ سوال میں نے خود سے ہزاروں بار پوچھا تھا۔ امریکا کے اس برفیلے شہر میں' میں نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ تو کیا مجھے اس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ اب وہ پوری کی پوری ملی تھی تو میرے ہیٹ کے ساتھ ملی تھی۔
میں خاموشی سے چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور اپنے ہیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تو یہ تمہارے پاس آ گیا تھا، شکریہ۔"
اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "ہاتھ ہٹاؤ اس پر سے۔"
"یہ ہیٹ میرا ہے۔"
"میں اسے پولیس کو دینے جا رہی ہوں۔"
"اتنے سے ہیٹ کے لیے تم پولیس کے پاس جاؤ گی۔ اس کا مالک جبران تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ پولیس کو زحمت نہ دو۔"
"یہ ہیٹ اور یہ مالک دونوں پولیس کے پاس جائیں گے کیونکہ اس ہیٹ کی وجہ سے میرا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ میں سائیکل چلا رہی تھی اور یہ ہیٹ اُڑتا ہوا میرے منہ پر آ کر چپک گیا تھا۔ مجھے دکھائی دینا بند ہو گیا اور میں ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔"

"کیا فلمی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے قہقہہ لگایا۔ "تم تو پوری کی پوری فلم ہو بھئی۔"

مجھے یہ سب مذاق لگ رہا تھا لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ جو میز پر رکھا ہوا تھا، وہ زخمی تھا۔ آنکھ کے کنارے پر بینڈ ایج لگی ہوئی تھی۔ وہ واقعی زخمی تھی۔

"اگر میں فلم ہوں تو تم بھی کسی کارٹون سیریز سے کم نہیں ہو۔" اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

"مجھے معاف کردو۔ غلطی میرے ہیٹ کی ہے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری اماں کہتی ہیں' میں بہت نیک شریف انسان ہوں۔"

"ہونہہ......شریف......" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے برا لگا کہ میری وجہ سے اسے تکلیف پہنچی تھی۔ وہ کافی پینے لگی۔ میں نے بھی اپنے لیے کافی منگوالی۔ جب تک میری کافی آئی، اس وقت تک وہ اپنی کافی پی کر اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

"کہاں جارہی ہو؟ ابھی میری کافی ختم نہیں ہوئی۔"

"تو؟"

"تو تم ایسے کیسے مجھے اکیلا چھوڑ کر جاسکتی ہو؟ بیٹھ جاؤ۔"

"کس خوشی میں؟"

"کسی بھی خوشی میں۔ جب تک میں کافی پیوں گا اس وقت تک ہم تھوڑی سی باتیں کرلیں گے۔"

"باتیں......سن لی ہیں میں نے تمہاری سب باتیں۔" اس نے جتا کر کہا اور باہر نکل گئی۔

"میرا نام جبران ہے' اپنا نام بھی بتادو۔"

میں نے پیچھے سے کہا لیکن وہ رکی نہیں۔ اگر وہ ہر بار بھاگ سکتی تھی تو میں بھی بھاگ سکتا تھا۔ میں فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ دوبارہ میں اسے گم نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ وہ اپنی سائیکل پر بیٹھ چکی تھی' میں نے بھی اپنی سائیکل کو پکڑا اور اس پر بیٹھ کر اس کی رفتار تیز کردی۔

گو میں بچپن سے سائیکل چلا رہا تھا لیکن مجھے ماننا پڑے گا کہ وہ مجھ سے اچھی سائیکل سوار تھی۔ وہ آگے آگے تھی' میں اس سے تھوڑا سا پیچھے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہماری ریس شروع ہو چکی ہے۔ وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور سچی بات یہ ہے کہ میں ہانپنے لگا تھا۔

اتنے ٹھنڈے موسم میں اتنی تیز سائیکل چلانا دل گردے کا کام ہے۔ ٹھنڈی ہوا نے میری ناک سن کردی تھی۔ اگر میں مزید دس پندرہ منٹ تک ایسے ہی سائیکل چلاتا رہتا تو میرا کام آسانی سے تمام ہوسکتا تھا۔ پھر مجھے برف پر پھسل جانے کا ڈر بھی تھا۔ اس موسم میں لوگ گاڑی احتیاط سے چلاتے تھے' اور میں سائیکل کو "جیٹ" کی طرح اُڑا رہا تھا۔ دو پہیوں کا یہ جیٹ مجھے صاف صاف کریش ہوتا بھی نظر آرہا تھا۔

"میری بات تو سُنو! رک جاؤ پلیز۔"

اس کے تھوڑا سا قریب ہو کر میں نے چلا کر کہا۔ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور رفتار مزید بڑھادی یعنی عجیب لڑکی تھی اسے لگتا تھا کہ مجھے دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہے' میں بس سارے کام چھوڑ کر اس کے پیچھے ہی بھاگتا رہوں گا۔

"تو کس نے کہا ہے کہ بھاگو' دفع ہوجاؤ۔"

اس نے چلا کر کہا اور اپنی رفتار اور تیز کرلی، میں چکرا کر رہ گیا۔

لڑکی تھی یا بجلی......

"شٹ اپ!" بجلی نے کڑک کر کہا۔

وہ اتنے غصے میں تھی کہ مجھے لگا کہ وہ سائیکل روکے گی' اپنا کوئی دوسرا' تیسرا ٹیلنٹ ظاہر کرے گی

یعنی منہ سے آگ وغیرہ نکالے گی اور مجھے جلا کر بھسم کر دے گی۔
"میرے منہ سے آگ نہیں نکلتی' مجھے افسوس ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا ورنہ میں اب تک تمہیں کوئلہ بنا چکی ہوتی۔"
دیکھیں ذرا یہ تو مصیبت ہے کہ انسان کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ خیر میں نے پوری جان لگا کر سائیکل کی رفتار اور بڑھائی اور اس سے آگے نکل کر عین اس کی سائیکل کے سامنے' چند فٹ دور اپنی سائیکل روک کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ کچھ ایکشن فلموں کی طرح کا انداز تھا' لیکن پھر میں اور کیا کرتا۔
ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگر میں "ایکشن" دکھا سکتا ہوں تو وہ بھی دکھا سکتی ہے۔ میں اس کا راستہ روک کر کھڑا تھا' ساری سڑک نہیں۔ وہ سائیکل کو نیم دائرے میں گھما کر' سائیڈ سے نکل گئی۔ میری گردن بھی نیم دائرے میں اٹھی رہ گئی۔ وہ جا چکی تھی پھر سے......
ایسی عجیب وغریب لڑکی مجھے ہی کیوں ملی تھی۔

☆☆☆

ایسی عجیب وغریب صلاحیت مجھے ہی کیوں ملی تھی۔ جیسے کان کو آواز سنائی دیتی ہے' ویسے ہی مجھے سوچ سنائی دیتی تھی۔
کار ایکسیڈنٹ میں اس کا باپ مرا تھا' یہ بھی مر جاتی۔"
اس وقت میں چھ یا سات سال کی تھی جس وقت مجھے اپنے سوتیلے باپ کی یہ سوچ سنائی دی تھی۔ اس دن میں ماں کی شادی کے تین مہینے بعد ان کے ساتھ رہنے گئی تھی۔ اب مجھے ان ہی کے ساتھ رہنا تھا۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ اس بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکی تھی۔ دس سال کا ہونے پر بھی نہیں کہ میری سوتیلی بہن جو میرے گال کھینچتی ہے اور مجھ سے اپنے سب چھوٹے بڑے کام کرواتی ہے' وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں کیوں دیتی ہے؟ میرا سوتیلا باپ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتا' تو دل ہی دل مجھ پر لعنت بھیجنا کیوں پسند کرتا ہے۔
میں نے ماں سے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔ "کیسی کیسی کہانیاں پڑھنے لگی ہو تم ردا؟ دیکھو، سب دماغ میں بیٹھ گئی ہیں۔ نماز پڑھا کرو، ایسے بُرے بُرے خیال نہیں آئیں گے۔"
بُرے خیالات تو دوسروں کے تھے۔ مجھے ان سے بچنا تھا...... پر کیسے؟
میں نے اپنی دوست کو سب کچھ بتایا۔ وہ اُوپر اُوپر سے مجھے تسلیاں دیتی رہی' لیکن اندر ہی اندر وہ مجھے سائیکو کہہ رہی تھی۔
"اگر تم ایک بار ڈاکٹر سے مل لو تو زیادہ بہتر ہے۔" اس نے اپنی ہنسی دبا کر کہا تھا۔
میں اس کی ہنسی اور "سائیکو، سائیکو" میں پھنس کر رہ گئی۔ اسکول کی ڈاکٹر کے پاس گئی تو اس نے ایک نفسیاتی بیماری کا نام لیا اور مجھے دوا دے دی۔ میں دوا کھاتی رہی' لیکن میری بیماری بڑھتی گئی۔ اتنی بڑھ گئی کہ میرے دل میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ جن چند لوگوں سے میں نے اس بیماری کا ذکر کیا تھا' انہیں لگتا تھا کہ یہ میرے دماغ کی کارستانی ہے۔ فلموں اور کہانیوں کے علاوہ ایسا کہیں نہیں ہوتا کہ کوئی سوچ سن یا پڑھ سکے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی عارضہ ہے ورنہ بس ذہن کا فتور۔
میں نے ٹیلی پیتھی پر کچھ ناولز پڑھ لیے ہیں اور میرے لاشعور میں یہ باتیں بیٹھ چکی ہیں۔ میں خوابوں خیالوں میں رہنے والی لڑکی ہوں۔ مجھے ایسی عجیب وغریب باتیں نہیں سوجھیں گی تو کسے سوجھیں گی۔
ماں نے کہا کہ میں کسی سے اس بات کا ذکر نہ

کروں ورنہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔ مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے' ڈر تو مجھے یہ تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ رات کا کھانا جو ہم سب مل کر کھاتے تھے' وہ وقت میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا تھا۔ میرا باپ' میرا ایک ایک نوالہ گن رہا ہوتا تھا۔ ماں جب میری پلیٹ کھانے سے بھر رہی ہوتی تھی' تو وہ اپنی حلال کی کمائی' مجھ پر حرام جانے پر افسوس کر رہا ہوتا تھا۔

اٹھارہ سال کی ہوتے ہی میں کینیڈا سے امریکا آ گئی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ساتھ جاب کرنے لگی۔ ماں ایک مہینہ روتی رہی تھی کہ میں نے کینیڈا کے کالج چھوڑ کر امریکا جانا کیوں پسند کیا ۔لیکن میں اسے کیسے سمجھاتی کہ میرا باپ' ایک ایک سال' ایک ایک دن گن رہا ہے کہ کب میں بالغ ہوتی ہوں اور یہاں سے دفعان ہوتی ہوں۔ اگر پھر بھی میں اس گھر میں ٹکی رہتی تو وہ بہانے سے مجھے دھکے دے کر نکال دیتا جس سے ماں کو تکلیف پہنچتی۔

وہ ماں جو اپنے شوہر کو بہت اچھا انسان سمجھتی ہے۔ جس نے سوتیلی بیٹی کو مجھ سے بڑھ کر پیار دیا ہے کہ وہ بن ماں کی بچی ہے۔ لیکن مجھ بن باپ کی بچی کو' ان کے شوہر بمشکل برداشت کرتے رہے تھے۔

امریکا میں، میں جس فرینڈ کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرتی تھی' اسے میں بیمار روح لگتی تھی۔ اسے میرے کپڑے' جوتے' میرے ہاتھ کا پکا کھانا تو پسند تھا لیکن میں نہیں۔ اسے ہر ہفتے کچھ اُدھار چاہیے ہوتا تھا' جسے وہ کبھی واپس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے وہ مجھ سے جھوٹا پیار اور دوستی جتاتی تھی۔ جس سے میرا دم گھٹتا تھا۔

میں انسانوں سے بھاگ بھاگ کر تھک چکی تھی۔ لوگوں کی سوچ مجھ پر خنجر کی طرح وار کرتی تھی۔ میں جھوٹی محبت کو بھی سچی محبت کا نام نہیں دے سکتی تھی کیونکہ ''سچی محبت'' کا سارا جھوٹ کھل کر میرے سامنے آ جاتا تھا۔ وہ کسی دوست کی محبت ہوتی یا کسی اور رشتے کی۔

امریکا آنے کے ایک سال بعد میں ماں سے ملنے گئی تو ماں کو گلے سے لگاتے ہوئے' مسکرا کر باپ کو سلام کرتے ہوئے' میں پھر سے دکھی ہو گئی تھی۔

''روز ویڈیو کال پر بات کرنے کے بعد بھی، اس کا یہاں آنا ضروری تھا؟'' وہ سوچ رہے تھے۔

''میں صرف دو دنوں کے لیے آئی ہوں۔ سنڈے کو چلی جاؤں گی۔'' میں کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہو' وہ بھی صرف دو دنوں کے لیے۔ یہ کیا بات ہوئی۔'' میرے باپ نے مسکرا کر کہا۔

ماں کا بنایا کھانا، میرے لیے زہر ہو گیا تھا۔ باپ کی نقلی مسکراہٹ اور اصلی سوچ نے میرا دل پھر سے توڑ دیا تھا۔ ایک سال کے بعد آنے پر بھی وہ انسان چند لمحوں کے لیے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔

اگلے سال میری سوتیلی بہن امریکا اپنی فرینڈز کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی فرینڈز ہوٹل میں رکنا چاہتی تھیں لیکن وہ انہیں یہاں لے آئی تھی۔ جب وہ میرا اپارٹمنٹ' میرا کمرا اور میری وارڈروب دیکھ رہی تھی تو وہ یہ طے کر رہی تھی کہ وہ باپ کو جا کر بتائے گی کہ کیسے میری ماں' اس کے باپ کی جمع پونجی اپنی لاڈلی کو بھجوا رہی ہے اور لاڈلی یہاں عیش کر رہی ہے۔

پندرہ دن بعد جب وہ پانچوں واپس گئیں اور میری بہن نے مجھے گلے سے لگایا اور میرا گال چوما تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں اس کی جھوٹی محبت اور سچی سوچوں کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک چکی تھی۔ میں ہنسنا چاہتی تھی لیکن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اپنی ماں تک سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ جن رشتوں کے لیے وہ اپنی جان مار رہی ہیں' وہ اصل میں ان کے ہیں

ہی نہیں۔ میں حقیقت بتا کر ان کی زندگی جہنم نہیں بنانا چاہتی تھی لیکن میری اپنی زندگی جہنم بن چکی تھی۔
سب رشتے، سب تعلق، سب نام' یہ نقلی ہی تو تھے میرے لیے۔ میں تنہا تھی۔ میں کوئی بھی رشتہ بنا ہی نہیں سکتی تھی۔ رشتوں پر جو پردہ ہوتا ہے' وہ میرے سامنے تار تار ہو جاتا ہے۔ انسانوں کا اندر میرے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ پھر میں کسی سے کوئی تعلق کیسے بنا سکتی ہوں؟

☆☆☆

تعلق بننے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ ایک بار وہ مجھے ٹرین میں ملی' دوسری بار سائیکل پر۔ اور بس' بن گیا تعلق۔
آنے والے کئی دن میں اس کیفے میں جاتا رہا جہاں وہ مجھے ملی تھی لیکن وہ دوبارہ وہاں نہیں آئی تھی۔ مجھے اس پر غصہ بھی تھا کہ وہ ہمیشہ ایسے بھاگ کیوں جاتی ہے۔ میں تو بس اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دشمنی، زیادہ دوستی نبھانا چاہتا ہوں۔
''تم تھوڑی چالاک ہو' کچھ مکار ہو' زیادہ اداس ہو۔ کیوں؟''
''تمہاری آنکھیں نیلی ہیں' پیشانی پر غصے کی شکنیں ہیں' کیسے؟'' یہ سوال کرنا چاہتا ہوں۔
شاید وہ مجھے امریکا کے ان لڑکوں جیسا سمجھ رہی تھی جن کے لیے وہ اپنے بیگ میں اسپرے چھپا کر رکھتی تھی۔ جبکہ اگر وہ میرے بارے میں کچھ باتیں جان لیتی تو اتنی خوفزدہ نہ ہوتی۔ مجھ میں کچھ برائیاں ہیں لیکن میں پورا کا پورا — برا نہیں ہوں۔
میں برا سوچتا ہوں تو اچھا بھی سوچ لیتا ہوں۔ میں دوغلا ہوں تو دانا بھی ہوں۔ زیادہ جھوٹا' اور تھوڑا سچا۔ میں پوری طرح سے شریف نہیں ہوں تو غنڈہ اور بدمعاش بھی نہیں ہوں۔ میری نیت میں فتور ہے تو وہ تھوڑی شفاف بھی ہے۔ ہر دوسرے انسان کی طرح، مجھ میں تھوڑا تھوڑا سب کچھ ہے۔
لیکن یہ سب بتانے اور کہنے کے لیے وہ مجھے دوبارہ مل ہی نہیں رہی تھی۔ میں اسے یاد کرنے پر مجبور تھا' کیونکہ اسے بھلانا مشکل ہو رہا تھا۔
''مجھے تمہاری نیلی آنکھیں پسند ہیں اور اداسی ناپسند......'' یہ بتانے کے لیے تھوڑا سا بے تاب۔
جب مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ مجھے دوبارہ کبھی' کہیں دکھائی نہیں دے گی تب ہی وہ مجھے نظر آ گئی۔ شہر کے نواح میں موسم سرما کا ایک چھوٹا سا فیسٹیول ہو رہا تھا۔ وہاں کچھ کھیل تماشے ہونے تھے' کچھ اسٹالز لگے تھے۔
سنڈے کا دن تھا' میں اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی سائیکل ریس بھی ہو رہی تھی۔ میں نے اس ریس میں شرکت تو نہیں کی تھی لیکن میں اسے دیکھنے کے لیے کھڑا تھا۔ اور تب ہی مجھے وہ ذرا دور اپنی سائیکل کے ساتھ کھڑی نظر آ گئی...... مس مائنڈ ریڈر......
''ہیلو مس! شکر ہے کہ تم دوبارہ مل گئیں۔ تمہیں کتنا ڈھونڈا میں نے۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟''
میں نے بھاگتے ہوئے' چلاتے ہوئے' اس کے سامنے ہانپ کر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹ سکیڑ لیے' منہ بنا لیا۔
''خدا کے لیے اب پھر سے غائب نہ ہو جانا۔''
میں نے اس کی سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پہلے میرے ہاتھ کو پھر مجھے دیکھا۔ وہ شاید میرا دماغ پڑھ رہی تھی پھر اس نے جھٹکے سے سائیکل اٹھائی اور اس کا اگلا پہیہ میری ٹانگوں میں مارا۔
''پیچھے ہٹو' ریس شروع ہونے والی ہے۔''
یہ بات وہ مجھے پہیہ مارے بغیر بھی کہہ سکتی تھی۔
وہ بددماغ' ظالم' اور سنگدل لڑکی تھی۔ اس سے کچھ لینا

دینا نہیں تھا۔

"بدماغ سے بات ہی کیوں کرتے ہو تم؟" سائیکل پر بیٹھتے ہوئے اس نے غصے سے کہا۔

میں نے نہیں، میرے دماغ نے اسے ناراض کر دیا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ میں اسے منالوں گا۔

"تم تیسرے نمبر پر آئی ہو۔ مبارک ہو لیکن اس دن تو تم ایسے سائیکل چلا رہی تھیں جیسے دنیا میں تم سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا، اب تم خود دو سے ہار گئیں۔"

میں اسے مبارک باد دینے اس کے پاس آیا۔ اس بار سائیکل سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔

"تم مبارک باد دے رہے ہو یا طنز کر رہے ہو؟"

"میرا دماغ کیا کہتا ہے۔" میں نے انگلی سے اپنے سر کو ٹھوکا اور مسکرایا۔

"شکریہ۔" حیرت انگیز طور پر وہ بھی مسکرادی۔

یہ پہلا شریفانہ لفظ تھا جو اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"تم شکریہ کہہ رہی ہو، مجھے؟ کیوں؟" میں اس کی شرافت سہہ نہیں پایا۔

"کیونکہ تم واقعی مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تمہیں خوشی ہوئی ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"تو میں تمہارا دشمن تھوڑی ہوں۔ اچھا چلو کافی پئیں، پیسے میں دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ پھر سے گم ہو جائے۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔"

"چھوڑ دوں گا لیکن وعدہ کرو تم پھر سے غائب نہیں ہو گی۔"

"ہو بھی سکتی ہوں۔ تمہیں اس سے کیا۔" اس نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔

"تم مجھ سے دوستی نہیں کر سکتیں؟"

"نہیں......" اس نے جھٹک کر میرا ہاتھ دور کر دیا۔ پھر وہ دکھ سے ہنس دی اور اپنا رخ موڑ کر چلنے لگی۔

مجھے لگا کہ اس نے اپنی نم آنکھیں مجھ سے چھپانا چاہی ہیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی برف پر چلنے لگی تھی۔ اس کے پیر برف میں دھنسے جاتے تھے، وہ لڑکھڑاتی تھی، گرنے لگتی تھی، پھر... بھی رکتی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے بھاگ رہی تھی، یا سب انسانوں سے۔

کتنی ہی دیر تک ہم دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ میں جان نہیں سکا کہ میں کیا جاننا چاہتا ہوں۔ میں وجہ نہیں ڈھونڈ سکا کہ میں کیوں بلاوجہ اس کے پیچھے پیچھے ہوں۔ میرا اس سے کیا لینا دینا تھا۔

"جب کچھ لینا دینا نہیں تو میرے پیچھے کیوں آرہے ہو، چلے جاؤ تم بھی۔ تم سب ایک جیسے ہو۔" اس نے گردن موڑ کر نہیں کہا تھا، لیکن اس نے روتے ہوئے ضرور کہا تھا۔

میں بھاگ کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی ناک سرخ ہو چکی تھی اور آنکھیں بھی۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ مجھے یہ گمان ہوا کہ میں کھڑے کھڑے بت بن جاؤں گا۔ وہ سسک رہی تھی اور اس کی سانس، دھواں بن کر نکل رہی تھی۔ اندر لگی آگ، آنکھوں کے پانی سے بجھتی نہیں ہے، بلکہ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا اور پھر اس پر اپنا دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا۔

"تم وہ سب سن لیتی ہو جو میں سوچتا ہوں، اب تم مجھے وہ سب سنادو، جو تم سوچتی ہو۔"

سسکی سی بھر کر اس نے گیلی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "انسان ایک دھوکا ہے اور اس کی محبت ڈھونگ۔"

اس نے یہاں سے بات شروع کی اور اپنی ماں، بہن، باپ اور زندگی میں ملنے والے ہر انسان کی حقیقت پر لا کر ختم کر دی۔ برف سے ڈھکے ہوئے بینچ پر جگہ بنا کر بیٹھے ہوئے، ہم دونوں کو شام ہو چکی تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ مجھے جتنی نڈر لگی تھی، حقیقت میں وہ اتنی ہی کمزور تھی۔

"میں نڈر بننا چاہتی ہوں لیکن حقیقت میں کمزور ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تمہاری کہانی عجیب نہیں ہے، تمہاری صلاحیت عجیب ہے۔ ہم سب انسان ایسے ہی ہیں، تم در گزر کرنا سیکھ لو۔ شور سے ہمارے کان پھٹنے لگتے ہیں تو ہم اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ ہماری سوچ سے تمہارا دل پھٹنے لگے تو تم دل بڑا کر لو۔ اپنے سوتیلے باپ کی وجہ سے تم نے اپنی ماں کو چھوڑ دیا، اپنی ماں کی محبت کی وجہ سے تم اپنے سوتیلے باپ کو معاف کر دو۔

ہم تمہیں منہ پر اچھا کہیں گے اور دل میں گالیاں دیں گے۔ تم اکیلی نہیں ہو جس کے ساتھ یہ ہو رہا ہے، یہاں سب کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہم جان نہیں پاتے اور تم جان لیتی ہو۔ زندگی ایک آزمائش ہے، تم اسے اپنی آزمائش سمجھ لو۔"

اسکول کے بچے کی طرح، یک ٹک وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"کب تک انسانوں سے بھاگو گی۔ تم بھاگ کر اس دنیا سے باہر نہیں نکل سکتیں۔"

اپنی سرخ آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ "مجھے کوئی بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"کیونکہ تم نے ہم سب کو اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قبول نہیں کیا۔ تم فرشتوں کی دنیا میں ––– نہیں ہو رہا! یہ انسانوں کی دنیا ہے۔ یہاں رہنا ہے تو سب برداشت کرنا ہو گا۔ اچھی سوچ بھی اور گھٹیا سوچ بھی۔ اصلی محبت اور نقلی پیار بھی۔"

اس نے ایک گہری نظر مجھے دیکھا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "رات ہونے والی ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔ بائے۔" اس کی چال شکستہ تھی اور انداز دکھی۔

"میں کل تم سے یہیں ملوں گا۔" میں نے پیچھے سے چلا کر کہا۔

☆☆☆

وہ کل کبھی نہیں آئی جب وہ دوبارہ ملتی۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، نہ گھر کا ایڈریس تھا نہ ہی کوئی فون نمبر۔ اس نے مجھے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ وہ کس کالج میں پڑھتی ہے۔ جب بھی ہماری بات ہوئی، سرراہ ہی ہوئی۔ وہ بھاگ جاتی تھی یا چلی جاتی تھی۔ میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ شاید وہ مجھ سے بھی دُور جا چکی تھی۔ میری کسی گھٹیا سوچ کا اس نے اثر لے لیا تھا۔ میری اچھائی کو نظر انداز کر کے اس نے میری برائی پر مجھے سزا دے دی تھی۔

"رہ رہی ہو گی کسی جنگل یا ویرانے میں۔ ورنہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر۔ ہم سب انسانوں سے دُور۔" میں اکثر تلخی سے سوچتا۔ میں اسے تلاش کرنا چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ تھی ہی کون۔ پر وہ جو بھی تھی، میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ جب جب میں واک کرتا، سائیکل چلاتا، صبح اٹھ کر بستر پر بت بن کر بیٹھ جاتا، بھاگ کر یونیورسٹی کی طرف جاتا، لائبریری میں کتاب کھول کر کہنی میز پر ٹکا کر کہیں اور گم ہو جاتا، کوکنگ کرتا، ٹی وی دیکھتا، یا اسی کیفے میں جا کر کافی پیتا۔ وہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ وہ مجھے یاد آتی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ میں ایک اور بار اسے دیکھنا چاہتا تھا......

میں ایک اور بار اسے دیکھ سکتا تھا اگر میں سر اٹھا لیتا۔ ٹرین میں، وہ میرے عین سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چھٹیاں گزارنے کینیڈا خالہ کے پاس گیا تھا اور اب واپس امریکا آرہا تھا۔ اس بار میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس بار میں نے اسے ایک سے نظر نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس عجیب و غریب لڑکی سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

"اس عجیب و غریب لڑکی کو یاد کرنے کے لیے شکریہ۔"

"میں تو بس کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اچھی کتاب ہے یہ۔ میں اسے دوسری بار بھی پڑھوں گا۔"

"مجھے ڈھونڈنے کے لیے بھی شکریہ۔ یہ اچھی کتاب مجھے بھی پڑھنے کے لیے دینا۔"

کتاب کے سب لفظ ہوا میں تحلیل ہونے لگے تھے۔ جیسے وہ ڈانس کر رہے ہوں۔

"الفاظ ڈانس نہیں کر رہے، تمہاری نظر دھندلا رہی ہوگی۔ تمہاری باتوں نے مجھ پر اچھا اثر کیا تھا۔ میں رہنے کے لیے ماں کے پاس گئی تھی۔"

"مس مائنڈ ریڈر، یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہے......"

"کیونکہ مس مائنڈ ریڈر نے بھی تمہیں بہت یاد کیا۔"

"اف جھوٹی...... اف میرا دماغ...... چپ کر جا بھائی...... میری عزت رکھ لے......"

"بالکل سچ بول رہی ہوں...... سچی...... پاپا کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے پاس رہوں۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ بھی تھے۔ بار بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جیسے ہی میری اسٹڈی مکمل ہو میں ان کے پاس واپس آجاؤں۔ میں نے اپنا سمسٹر بھی مس کر دیا ہے۔ وہ مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ امریکا واپس جاتے ہی تمہیں ڈھونڈوں گی اور تم سے خوب ساری باتیں کروں گی۔"

"توبہ توبہ کتنا جھوٹ بولتی ہے یہ۔ جو مجھ سے بھاگتی رہی تھی اب وہ مجھے ڈھونڈتی...... ہونہہ......"

"میں نے تمہیں اسٹیشن پر دیکھ لیا تھا اسی لیے میں بھاگ کر تمہارے پیچھے آئی تھی۔ تم نے دیکھا ہی تھا کہ جب میں یہاں آکر بیٹھی تو میری سانس پھول رہی تھی۔ میں ہانپ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔ وہ بھی کینیڈا میں۔ اگر تم مجھے پہلے مل جاتے تو میں تمہیں ماں سے ملواتی۔ وہ اس انسان سے مل کر بہت خوش ہوتیں جس نے میری زندگی اور میری سوچ کو بدلنے کی ایک اچھی کوشش کی۔"

"اب یہ مجھے جذباتی کر رہی ہے، لیکن میں پھر بھی نہیں بولوں گا۔ میں اس سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

"تم نہ بولو لیکن ایک بار مجھے دیکھ تو لو۔ میں نے بالوں کو سیاہ کروالیا ہے۔ اب میں ان پر کبھی نیلا پیلا رنگ نہیں کرواؤں گی۔"

"جو چاہے کرو، مجھے اس سے کیا...... اف...... میرا دماغ...... چپ کر جا یار......"

وہ تھوڑا سا جھکی اور بڑھ کر میرے ہاتھ سے کتاب کھینچ لی۔ "مجھ سے کبھی بات نہ کرنا، لیکن ایسے ہی میرے سامنے چپ بیٹھے رہنا۔ بولو منظور ہے۔"

وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر اس کے سیاہ بالوں، نیلی آنکھوں اور معصوم مسکراہٹ کو دیکھا۔

"منظور ہے۔" میں نے زبان سے بھی کہا اور دل سے بھی۔

عفت سلطانہ

کیسا دلکش نظارہ تھا......!

پوری وادی بلند و بالا پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی، جن کی چوٹیوں پر سفید برف چمک رہی تھی، فضائی آلودگی اور دھویں سے پاک نیلا آسمان تھا۔

کسی پہاڑ کی چوٹی سے ایک حسین آبشار ایک پیالہ نما جھیل میں گر رہا تھا۔ جھیل کے پانی کا رنگ سورج کی روشنی کے ساتھ ساتھ سارا دن تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ ایک طرف دریائے سندھ موجیں مار رہا تھا،

اس کا بپھرا ہوا پانی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا تو عجیب سا شور پیدا ہوتا تھا۔

تا حد نگاہ سبز قالین کی طرح بچھا ہوا سبزہ تھا، جس سے آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آتی تھی۔ بادام، چیری، اخروٹ، سیب، آڑو، خوبانی اور دوسرے پھلوں کے درخت جا بجا ایستادہ تھے۔ ہر طرف اللہ کی رحمتیں تھیں، نعمتیں تھیں۔ سفیدے کے اونچے اونچے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

سونے چاندی کے ذرات جیسی ریت پر مشتمل صحرا تھا، جس میں کہیں کہیں خوب صورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو دیکھ کر فریال کو بے اختیار علامہ اقبال کا شعر یاد آ گیا تھا۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

یہ روح پرور مناظر دیوار پر لگی ہوئی کسی سینری کے نہیں تھے بلکہ پاکستان کے پہاڑی علاقے میں واقع ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج تھا، اس کالج کے ہاسٹل کی تیسری منزل کی چھت سے یہ مناظر نظر آتے تھے۔

یہاں کھڑی ہو کر فریال قدرت کے ان نظاروں میں گم تھی، اسے ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

''اللہ!! جنت کیا اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگی؟'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں سوال کیا۔

یہ منظر بھی جنّت کا ایک نمونہ ہی تو تھا۔ زمین پر جتنے بھی فیچرز ہوتے ہیں وہ سب یہاں موجود تھے۔ پہاڑ، دریا، صحرا، آبشار، جھرنے، جھیلیں، پھول پھل، پیارے پیارے چہچہاتے پرندے...... کیا کچھ نہیں تھا یہاں۔

ابھی وہ اس جنت نظیر وادی کے منظر میں گم تھی کہ کالج کے چپراسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میڈم! آپ کو پرنسپل صاحبہ نے اپنے آفس میں بلایا ہے۔''

''تم جاؤ...... میڈم سے کہو میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں۔'' وہ جب بھی فارغ ہوتی اکثر یہاں چلی آتی، یہاں آ کر وہ اپنے سارے دکھ درد بھول جاتی تھی۔

''میڈم! پرنسپل نے آپ کو فوراً بلایا ہے، بہت غصے میں ہیں وہ۔ میں سارے کالج میں آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا، وہ کہہ رہی تھیں کہ کوئی ایمرجنسی ہے۔''

''ایمرجنسی ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اللہ خیر کرے، ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی صبح صبح۔ وہ تو اپنا پیریڈ لے کر یہاں آ گئی تھی، وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ابھی اس نے آفس میں قدم ہی رکھا تھا کہ پرنسپل اس پر برس پڑیں، ماتھے پر ہزاروں شکنیں تھیں اور منہ سے تو گویا کف اُڑ رہا تھا۔ غصے میں منہ بھی ٹیڑھا ہو رہا تھا۔

''کہاں غائب ہو جاتی ہیں فریال آپ؟ سارے کالج میں آپ کو تلاش کرتے رہے مگر آپ کہیں نہیں ملیں۔ موبائل بھی آپ نے اٹینڈ نہیں کیا۔''

''میڈم! میرا بیگ تو اسٹاف روم میں تھا اور موبائل میرے بیگ میں رکھا تھا۔'' پرنسپل نے اس کی ایک نہیں سنی، اسی زور و شور سے گرجتی رہیں۔

''ذرا جو احساس ہو لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا، آپ کو پتا ہے نا کہ آج چار اسٹاف ممبر غائب ہیں۔''

''مگر میڈم میں تو اپنا پیریڈ لے کر گئی تھی، اس وقت میں فری تھی۔ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے میں اوپر چلی گئی تھی۔''

''کیا صرف پڑھانے کی ذمہ داری ہوتی ہے، ادارے کے اور بھی کام ہوتے ہیں۔'' پرنسپل کچھ سننے کو تیار نہیں تھیں۔ پرنسپل کا بلڈ پریشر مستقل بڑھا ہوا تھا۔

"آپ مجھے بتا کر چلی جاتیں...... میں تو کبھی آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کرتی۔" پرنسپل نے اس کے منہ پر صاف جھوٹ بول دیا۔

آج جو یہ چار اساتذہ بیک وقت نہیں آئی تھیں تو یہ محض اتفاق تھا۔ ایک کی طبیعت بہت خراب تھی، دوسری ٹیچر کے ہاں فوتگی ہوگئی تھی۔ ایک ٹیچر کے بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ایک کے والدین حج کر کے آرہے تھے، ان کا استقبال کرنے ایئرپورٹ جانا تھا ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کالج کا تعلیمی ماحول بہت اچھا تھا، یہ علاقہ تعلیمی لحاظ سے بہت آگے تھا۔ یہاں کے طالب علم بہت ذہین اور محنتی تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں عہدوں پر کام کررہے تھے۔ یہاں شرح خواندگی بھی بہت بلند تھی۔

"میڈم! اگر باقی ٹیچرز ڈیوٹی سے غیر حاضر ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" فریال نے دبی دبی زبان میں احتجاج کیا۔ اس پر تو پرنسپل نے مزید اشتعال کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں جی سارا قصور، ساری غلطیاں، ساری ذمہ داریاں تو صرف میری ہیں۔ صرف میں ہی تنخواہ لیتی ہوں باقی لوگ تو یہاں مفت کام کرتے ہیں۔"

ہائے!! اوپر کیسے جنت کے مناظر تھے، صرف پرندوں کی مسحور کن آوازیں تھیں یا پانی کا شور تھا اور اس کمرے میں تو دم گھٹ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یکلخت اسے کسی نے جنت سے اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا ہو۔ آلودگی سے پاک اس وادی میں پرنسپل کے کمرے میں اس وقت کتنی آلودگی تھی، شور کی آلودگی...... غصے کی آلودگی...... منفی رویے......

کسی کا غصہ کسی پر نکالنے کا بھلا کیا جواز تھا؟

مگر ہوتا تو یہ ہی تھا اور ہر جگہ پر اسی طرح کی ناانصافیاں ہوتی ہیں۔ سب کا زور صرف کمزوروں پر چلتا ہے۔

فریال کی تو اگر سالانہ چھٹیاں باقی بھی ہوتی تھیں تو پرنسپل اسے آسانی سے چھٹی نہیں دیتی تھیں اور یہ زور آور قسم کی ٹیچرز کس طرح آئے دن چھٹیاں کرتی تھیں۔ ان کی چھٹیاں تو ایس ایم ایس کی لاتعداد پیکیج کی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔

☆☆☆

مسائل تو سب کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن......

ایک تو وہ فطرتاً صلح جو قسم کی تھی، دوسرے اس کے ہاتھ اوروں کی طرح لمبے نہیں تھے۔ وہ بوڑھے والدین کے ساتھ رہتی تھی، شوہر کا ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال ہوگیا تھا۔ چار بچے تھے۔ چوتھا بیٹا تو باپ کے انتقال کے بعد پیدا ہوا تھا۔ قیامت گزر گئی تھی اس پر، اچانک ہی اتنی بڑی اُفتاد آن پڑی تھی اور بچے کی پیدائش کے دن بھی نزدیک تھے، بڑی مشکلوں سے بچوں کی طرح اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔

پھر وقت خود سب سے بڑا مرہم ہے، بوڑھے والدین آئے دن بیمار رہتے تھے، باپ کو بلڈ پریشر رہتا تھا۔ وہ دل کے مریض بھی تھے۔ ماں کو شوگر تھی۔ دونوں کو یہ بیماریاں اکلوتی جوان بیٹی کی بیوگی کے صدمے سے لگی تھیں، اس سے پہلے وہ دونوں اچھے بھلے تھے۔ اکلوتی لاڈلی بیٹی کو اتنا گہرا صدمہ پہنچا تھا، اچانک ہی افتاد آپڑی، ہنستا کھیلتا گھرانہ ماتم کدہ بن گیا تھا۔

تقدیر کا علاج بھلا کس کے پاس تھا؟ وہ تو اللہ کا ہزار شکر تھا کہ اس کی سرکاری نوکری تھی، والدین حیات تھے۔ یہ سب بھی نہ ہوتا تو کیا کرلیتی، وہ تو ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتی تھی، اللہ کی رضا میں راضی تھی۔ عزت کی نوکری تھی، عزت کی زندگی تھی۔

"سنا ہے نئے سیکریٹری صاحب بہت سخت ہیں، موقع پر ہی سخت احکامات جاری کرتے ہیں مگر یہاں تو کسی کو احساس ہی نہیں، کسی کا کیا جاتا ہے جی، جواب دہی تو مجھے ہی کرنی پڑے گی کہ ایک دن

میں کسی ادارے سے بیک وقت چار ٹیچرز کیوں غائب ہیں۔ انہوں نے سخت احکامات جاری کیے ہیں کہ ایک دن میں دو سے زیادہ ٹیچرز کو چھٹی نہ دی جائے۔" پرنسپل بغیر فل اسٹاپ اور کومے کے بولے جارہی تھی، وہ حسب معمول سر جھکائے سن رہی تھی۔

"کتنا کام ہے آج کل کالج میں بی ایڈ کے ٹرینی ٹیچرز کے ماڈل لیسن چل رہے ہیں۔ دوسری کلاسیں ہیں اور سیکریٹری صاحب کی آمد کسی بھی وقت متوقع ہے۔ میری تو جان پر بنی ہے، کیا ہوگا پتا نہیں آج؟"

ابھی میڈم کی گھن گرج جاری ہی تھی کہ کالج کے گیٹ سے سیکریٹری تعلیم کی گاڑی اندر آتی دکھائی دی۔ آفس کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر میڈم بدحواس ہوکر ان کا استقبال کرنے کے لیے اٹھیں۔

سیکریٹری صاحب واقعی بڑے غصے میں تھے تھوڑی دیر ہی پرنسپل کے آفس میں بیٹھے، چائے تک نہیں پی اور بی ایڈ کے ٹیچرز کے ماڈل لیسن کا معائنہ کرنے کے لیے اٹھ گئے۔

ٹریننگ کالج سے ملحقہ ایک اسکول تھا جس میں ٹیچرز کے ماڈل لیسن ہورہے تھے۔

جس پہلی ٹیچر سکینہ کی کلاس میں وہ لوگ داخل ہوئے وہاں کا تو منظر ہی عجیب تھا۔ ٹیچر نے اسکارف پہنا ہوا تھا اور بڑی سی چادر پہنے ہوئے تھی۔ اس میں تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا، وہ پردہ کرتی ہو گی، مسئلہ تو یہ ہوا کہ وہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھا رہی تھی اور نہ جانے کیا پڑھا رہی تھی۔ سارے طالب علم آپس میں باتیں کررہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ جس پر ٹیچر نے ڈنڈا اٹھا کر میز پر زور زور سے مارنا شروع کردیا اور بچوں کو خاموش ہونے کا کہا۔ ٹیچر کے چہرے کے تاثرات بھی بہت خراب تھے، مسکرانا تو دور کی بات تھی اس کے چہرے پر تو اذیت تھی جیسے کوئی اس پر جبر کررہا ہو۔ نہ کوئی چارٹ تھا نہ ماڈل حتیٰ کہ بورڈ تک استعمال نہیں کیا گیا تھا جب کہ ٹیچنگ کی اصطلاح میں بورڈ کو آدھا ٹیچر کہا جاتا ہے اور تو اور وہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب سے پڑھا رہی تھی، بجائے زبانی لیکچر دینے کے۔

ان لوگوں کو دیکھ کر وہ مزید بدحواس ہوگئی، ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب زور زور سے ہلنے لگی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر سیکریٹری صاحب کا غصہ مزید بڑھ گیا، وہ پہلے ہی اساتذہ کی غیر حاضری پر برہم تھے، پرنسپل نے بہت کہا کہ......

"سر! دوسری اسٹوڈنٹس کی کلاسز چیک کرلیں، ہماری ٹرینی ٹیچرز نے بہت محنت کی ہے اور یہ لڑکی بھی بہت اچھی ہے، آج اسے پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ یہ گھبرا گئی ہے۔ لیکچر بھول کر کتاب ہاتھ میں اٹھالی ہے اس نے۔"

لیکن سیکریٹری صاحب کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اسٹاف کے ساتھ میٹنگ کرنے کا حکم دیا۔ سیکریٹری صاحب کا لہجہ بہت تلخ تھا، وہ سب مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموشی سے سن رہے تھے۔

"توبہ توبہ کیا حال ہے اس ادارے......"

انہوں نے خاص طور پر پرنسپل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس طرح کی تیاری کروائی ہے آپ لوگوں نے ٹیچر کی، یہ ٹریننگ دی ہے۔ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز اعتماد ہوتی ہے اور یہ خود اعتمادی آتی ہے اسی وقت ہے جب انسان پوری طرح تیار کرکے آیا ہو۔ جس ٹیچر میں خود اعتمادی ہی نہ ہو وہ کیا خاک پڑھائے گا؟"

سیکریٹری صاحب کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل مزید گہرے ہورہے تھے اور چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔

"ٹاپک کی تیاری ہوتی ہے پہلے سے، کلاس کا ڈسپلن ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے سرگرمیاں تیار کی

جاتی ہیں کہ وہ پڑھائی میں دلچسپی لے۔ ان سب مراحل کی تیاری تو دور کی بات تھی، اس ٹیچر کے تو...... کیا نام تھا اس کا......؟" سیکریٹری صاحب نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"سکینہ سر۔" ٹیچرز نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں ہاں وہی سکینہ، اس کے تو چہرے کے تاثرات ہی اتنے خراب تھے کہ انسان دیکھ کر ڈر جائے...... اور یہ سب اس لیے تھا کہ بچی کو تیاری ہی ٹھیک سے نہیں کروائی گئی تھی۔ ظاہر ہے جس ادارے سے بیک وقت چار، چار ٹیچرز غائب ہوں اس کا تو یہ ہی حال ہوگا۔" ابھی سیکریٹری صاحب کی تقریر جاری ہی تھی کہ بی ایڈ کی ایک طالبہ بغیر اجازت ہی آفس میں داخل ہوئی، بہت گھبرائی ہوئی تھی وہ۔

"میڈم...... میڈم...... وہ سکینہ کے ہاں ابھی ابھی بیٹا ہوا ہے۔" اس انکشاف پر تو وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔

خواتین ٹیچرز کے داخلے کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ حاملہ نہ ہوں۔ کالج میں داخلے کے بعد اس لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی دبلی پتلی تھی اور بڑی سی چادر ہر وقت اوڑھے رکھتی تھی۔ کسی کو شک تک نہیں گزرا۔ اس نے سب سے چھپایا ہوا تھا حتیٰ کہ اپنی دوستوں سے بھی کہ کہیں کالج سے نکال نہ دیا جائے۔

آج اگر وہ یہ ماڈل لیسن دینے نہیں آتی تو اس کا سال ضائع ہو جاتا۔

میڈم تو تقریباً بے ہوش ہونے کو تھیں، باقی سب کا بھی یہ ہی حال تھا۔ سیکریٹری صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ بچہ انتہائی خوب صورت تھا، سرخ و سفید رنگت اور نیلی نیلی آنکھیں، بالکل پلاسٹک کا گڈا لگ رہا تھا۔

سیکریٹری صاحب کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ سب کی خوف سے جان نکلی جا رہی تھی کہ اب وہ کیا سزا تجویز کریں گے مگر ان کا لہجہ یکلخت تبدیل ہو گیا تھا۔ چہرے کے تاثرات بھی بدل رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے۔

"مبارک ہو آپ سب کو......" وہ سب حیرت زدہ رہ گئے سیکریٹری صاحب کی اس بات پر۔

"وہ بچی سکینہ کوئی ماڈل بنا کر نہیں لائی تھی، مگر اس نے تو جیتا جاگتا ماڈل تخلیق کر دیا۔ قدرت کی سب سے حسین تخلیق...... انسان۔ اس نے تو ایسا ماڈل تخلیق کر دیا جو شاید ہی دنیا کے کسی بھی ٹرینی ٹیچر نے ماڈل لیسن کے دوران تخلیق کیا ہو؟"

وہ دور کہیں کھوئے کھوئے سے بول رہے تھے اور ان سب کے خوف زدہ چہرے خوشی سے دمک اٹھے تھے۔

آؤ وہاں چلتے ہیں جہاں
ستارے ہمیں ڈھونڈتے ہیں
نظارے ہمیں ڈھونڈتے ہیں

☆

بشریٰ احمد
اعتبار کے رنگ

دولہا بن کر کیسا بانکا سجیلا لگ رہا تھا عطیب ۔
فائقہ بیگم نے بیٹے کی نظر اتار کر صدقہ ملازمہ کو دیا تھا۔

"فائقہ! آپ کس چکر میں لگی ہوئی ہیں ،جلدی کریں بھئی۔" رضوان صاحب بیوی پر خفا ہوئے تھے۔ بارات روانگی کے لیے تیار تھی اور فائقہ بیگم دیر پر دیر کیے جارہی تھیں۔

"ہاں بس چلیے ۔ یہ کام بھی تو ضروری تھا۔ اللہ میرے بیٹے کو حاسدوں کی نظر سے بچائے ۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"پھوپھو کا موڈ دیکھا ہے امی۔ مستقل آف ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں مین میکھ نکالے جارہی ہیں۔" آئمہ نے ماں کو مخاطب کیا۔

"بس کر دیار آئمہ! اس موقع پر ایسی باتوں کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے آئمہ کے میاں مدثر نے بیوی کو ٹوکا۔

گاڑی میں آئمہ اور مدثر کے علاوہ رضوان صاحب اور فائقہ بیگم موجود تھے۔ عطیب اپنے دوستوں کے ہمراہ روانہ ہوا تھا جبکہ کشف بھی دیگر کزنز کے ہمراہ دوسری گاڑی میں تھی۔

آئمہ، ماں سے پھوپھی کے تیور ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی، جب مدثر نے نرمی سے اسے ٹوکا تھا۔

"یہی بات تو میں بھی کب سے تمہاری آنٹی کو سمجھا رہا ہوں۔ اگر کسی کا موڈ آف ہے بھی تو چھوڑیں، درگزر کریں۔ خوشی کا موقع ہے۔ ہم کسی کے بگڑے موڈ کو لے کر اپنا موڈ کیوں غارت کریں۔" رضوان صاحب تحمل سے بولے تھے۔

"وہ کسی اور آپ کی سگی بہن ہے میاں صاحب! میں نے اپنے عطیب کے لیے اس کی لائبہ کا رشتہ نہیں مانگا' اس کے دل سے ملال جا ہی نہیں رہا۔ کسی نہ کسی بات کو لے کر مستقل طنز کے تیر چلائے جارہی ہے۔ مہندی کا فنکشن کمبائن نہیں کیا، اس بات پر سو طرح کی باتیں بنائیں۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ بی بی ہمارا سدھیانہ بھی ہمارے والے خیالات رکھتا ہے۔ بے جا نمود و نمائش اور اسراف کو ہم بھی خرافات سمجھتے ہیں اور وہ بھی ، بہت سلجھی ہوئی فیملی ڈھونڈی ہے میں نے اپنے عطیب

ناولٹ

کے لیے، معزز، مہذب اور وضع دار لوگ ہیں اور ماشاءاللہ میری بہو تو ایسی ہے کہ دیکھتے کے ساتھ ہی آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتر جائے۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری تو نام کو نہیں۔ آپ کی بہن صاحبہ کی بولتی تو بند ہو گئی لیکن چہرے کے زاویے درست ہونے کا نام نہیں لے رہے۔،، فائقہ بیگم نے نند کے بگڑے تیوروں کا پھر رونا رویا تھا۔

''چلیں امی! ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں ابو! پھوپھو کے رویے کو نظر انداز کریں۔ ان کے چہرے کے زاویوں کی فکر کر کے ہم اپنی خوشی کیوں غارت کریں۔ ہماری زندگی کا تو آج یادگار دن ہے۔'' آئمہ نے اس بار سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔ فائقہ بھی بیٹی کی بات پر قائل ہو گئی تھیں۔ اس لیے جواب میں کچھ نہ بولیں۔

''برہان صاحب کا نمبر نہیں مل رہا۔ کب سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ رضوان صاحب نے سمدھی کا نام لیتے ہوئے کہا تھا۔

''دلہن کے باپ ہیں، مصروف ہوں گے اور آپ کو ایسی کون سی بات کرنی ہے ان سے، اب تو ہم ان کے ہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔'' فائقہ بیگم رسان سے بولیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے تو بس انہیں آگاہ کرنا تھا کہ بارات روانہ ہو چکی ہے لیکن تعجب ہے وہ فون نہیں اٹھا رہے۔'' رضوان صاحب کو جانے کیوں تشویش سی محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے آپ سے بڑھ کر وقت کے پابند ہیں برہان صاحب ہار پھول لیے منتظر کھڑے ہوں گے۔'' فائقہ بیگم مسکرائی تھیں۔

ذرا سی دیر میں بارات منزل مقصود پر پہنچ گئی تھی لیکن توقع کے برعکس استقبال کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ یہ تو شادی والا گھر ہی نہ لگ رہا تھا۔ دلہن والوں کے چہروں پر نگاہ پڑتے ہی احساس ہوا کہ شادی کے بجائے مرگ کا سماں ہے۔ برہان صاحب کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں رضوان صاحب! میری بیٹی نے آج ہمیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ اس نے مجھے آپ سے نگاہیں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا ہے۔'' انہوں نے واقعی رضوان صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''ہوا کیا ہے بھائی صاحب! بتائیے تو سہی۔'' فائقہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسلا۔ کتنے ارمانوں سے وہ اکلوتے بیٹے کی بارات لائی تھیں۔ خدا جانے کیا انہونی وقوع پذیر ہو گئی تھی۔

''فرزین گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ اپنے کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتی تھی۔'' برہان صاحب کے چھوٹے بھائی نے دھیرے سے بتایا تھا۔ فائقہ بیگم کا ہاتھ دل پر جا پڑا — صدمے اور تاسف سے رضوان صاحب بھی گنگ سے ہو گئے تھے۔

''آپ کی بیٹی کے یہ کرتوت تھے۔ کم از کم ہمیں بتا تو دیتے۔

کتنے ارمانوں سے بارات لائے اور یہاں یہ ذلت ہماری منتظر ہے۔'' فائقہ رونے لگی تھیں۔

''بہن جی! صبح سے فرزین کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں سوچا تھا مل جائے گی تو عزت کا واسطہ دے کر اسے نکاح پر راضی کر لیں گے لیکن ایک رقعہ کے سوا وہ کوئی سراغ چھوڑ کر نہیں گئی۔ ہمیں تو جیتے جی مار ڈالا اس لڑکی نے، ایسی کالک مل دی کہ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔'' یہ فرزین کے ماموں تھے جو بھانجی کے عمل پر حد درجہ شرمندہ اور ملول تھے۔

''میرے بیٹے کا کیا قصور، وہ کیوں اس ذلت کا حصہ دار بنے ہم دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' فائقہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوئے جا رہی تھیں۔ بارات کے ہمراہ آئے افراد بھی صورت حال پر

ششدر تھے۔

"سمدھیانے کی نیک نامی اور شرافت کا بہت ڈھنڈورا پیٹتی تھیں فائقہ بھابھی۔ اب چکھ لیں مزہ غیروں میں رشتہ جوڑنے کا۔"

عظمیٰ پھوپھو نے استہزائیہ انداز میں خود کلامی کی۔ آئمہ اور کشف نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم کی شدت سے عقل ماؤف ہوئی جا رہی تھی۔ صرف فائقہ تھیں جو دلہن والوں پر دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں اور وہ بے چارے سب کچھ سننے پر مجبور تھے۔

"میری بیٹی کی وجہ سے آپ کا شملہ بھی نیچے ہوا۔ تلافی کی کوئی صورت نہیں لیکن اگر آپ لوگوں کو مناسب لگے تو میں اپنی چھوٹی بیٹی کا نکاح عطیب میاں سے کرنے پر تیار ہوں۔ ایک مجبور اور بے بس باپ کے اختیار میں اس کے سوا کچھ نہیں۔ فرزین کے کیے کی سزا آپ لوگوں کو کیوں ملے۔ آپ بارات لائے ہیں۔ دلہن رخصت کروا کر لے جانا آپ کا حق ہے۔"

شریف النفس برہان صاحب نے اپنے تئیں تلافی کی کوشش کی تھی۔ فائقہ بیگم کو اس تجویز سے کوئی سروکار نہ تھا ان کا واویلا جاری تھا جبکہ رضوان صاحب سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"آپ لوگ باہمی مشورے سے فیصلہ کر کے ہمیں آگاہ کر دیں۔ ہماری قسمت میں جو ذلت لکھی تھی وہ اب کوئی نہیں مٹا سکتا۔ دنیا کے سامنے آپ لوگوں کا کچھ بھرم رہ جائے بس اس کی کوشش ہی کر سکتے ہیں۔" فرزین کے چچا نے رضوان صاحب کا نشانہ ٹھیک کر انہیں سنجیدگی سے مخاطب کیا پھر اپنی طرف کے لوگوں کو لے کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ مقصد ان لوگوں کو فیصلے پر پہنچنے کے لیے موقع فراہم کرنا تھا۔

"ایک بیٹی گھر سے شادی والے روز بھاگ گئی۔ اللہ جانے دوسری کے کیا کرتوت ہوں گے۔ رضوان بھائی سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا۔" عظمیٰ پھوپھو نے چہرے پر تشویش بھرے تاثرات پیدا کر کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا تھا۔

"تو اور کیا بھئی' ہماری ایسی کیا مجبوری کہ ہم اپنے بچے کا رشتہ ایسی جگہ جوڑیں۔ عظمیٰ تمہاری لائبہ بھی تو ہے۔ بھائی کی عزت کا خیال کرو۔ نازک وقت ہے۔ بارات میں تو چلو گھر گھر کے لوگ ہیں کل ولیمے کا فنکشن ہے' ایک دنیا اکٹھی ہو گی۔ کس کس کے سامنے تقریب ملتوی ہونے کا جھوٹا سچا عذر پیش کریں گے۔ میری مانو تو گھر واپس چلتے ہیں اور ابھی کے ابھی لائبہ اور عطیب کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔"

بڑی تائی نے اپنی دانست میں مسئلے کا حل نکالا تھا۔

"معاف کیجیے گا بھابھی! میری بیٹی اتنی گری پڑی نہیں ہے۔ رضوان بھائی نے پہلے رشتہ مانگا ہوتا تب بھی ہم سو بار سوچ کر اقرار کرتے، یوں کیسے میں اپنی بیٹی کا رشتہ عطیب سے جوڑ سکتی ہوں۔ کسی اور کی دہلیز پر بارات لے کر آیا۔ دلہن نہ نصیب ہوئی تو افراتفری میں میری بچی سے نکاح پڑھوا لیا۔ نہ بابا نہ ہماری کیا مجبوری ہے جو ہم یہ رشتہ جوڑیں۔"

عظمیٰ پھوپھو نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے بڑی بھاوج کو ٹکا سا جواب دیا تھا۔ رضوان صاحب نے لب بھینچ کر چھوٹی بہن کو گھورا مگر کچھ کہنے سے گریز کیا پھر بیوی پر نگاہ ڈالی جو زار و قطار رونے میں مصروف تھیں۔

"رونا دھونا بند کریں بیگم! برہان صاحب کی تجویز ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کی بڑی بیٹی کا فعل اس کے اپنے ساتھ۔ ہم ان کی چھوٹی بیٹی کو عطیب کے سنگ رخصت کروا کر لے جاتے ہیں۔"

صورت حال کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے رضوان صاحب نے دلہن والوں کی تجویز کو سند قبولیت بخش دی تھی۔

"لیکن ابو!" آئمہ نے کچھ کہنا چاہا۔ فائقہ بیگم نے بھی شوہر کی بات پر تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"بیٹا! جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تمہاری ماں نے آدھے شہر کو اکلوتے

بیٹے کی دعوت ولیمہ کے کارڈ بانٹے ہیں' یہ ہماری بھی عزت کا سوال ہے۔'' رضوان صاحب نے بیٹی کا اعتراض سننے سے پہلے ہی اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''دنیا کو تو پھر بھی سب خبر ہو جائے گی۔ ایسی باتیں بھلا چھپتی تھوڑی ہیں۔'' بڑی تائی نے ٹھنڈی سانس بھر کر خود کلامی کی۔ رضوان صاحب نے بھاوج کو بھی کچھ نہ کہا' وہ سوالیہ نگاہوں سے بیوی کو تک رہے تھے۔ فائقہ نے شوہر کی نگاہوں کا پیغام سمجھ کر آنسو پونچھے تھے۔

''عطیب سے پوچھ لیں اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو۔'' وہ دھیرے سے بولی تھیں۔ سب کی نگاہوں کا مرکز اب عطیب بنا تھا۔

وہ بانکا سجیلا دولہا جواب کلاہ اتار کر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ رضوان صاحب نے کچھ کہے بنا بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

''برہان صاحب کو ہاں کہہ دوں نا بیٹا۔'' وہ فرماں بردار بیٹے سے ایسے آڑے وقت میں فرماں برداری کا ثبوت مانگ رہے تھے۔ اس کی تو اپنی عقل بری طرح ماؤف ہو چکی تھی باپ کو کیا جواب دیتا بس خالی نگاہوں سے انہیں تکے گیا۔

''انسان کی زندگی میں بعض اوقات اس سے بھی بڑے بحران آتے ہیں بیٹا۔ اللہ سے خیر کی امید رکھو' یہ مشکل وقت بیت جائے گا۔ اللہ نے تمہارے مقدر میں فرزین کے بجائے برہان صاحب کی چھوٹی بیٹی کا ساتھ ہی لکھا ہو' یہ سوچ کر اپنے دل کو رشتہ جوڑنے پر آمادہ کر لو۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بیٹے سے مخاطب تھے۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں ابو ......!''
عطیب یہ ہی کہہ پایا۔

آدھے گھنٹے بعد فرزین برہان کے بجائے تابین برہان اس کی منکوحہ بن چکی تھی۔ دلہن والوں کے اصرار کے باوجود فائقہ بیگم کھانے کے لیے رکنے پر راضی نہ ہوئیں۔ وہ فوری رخصتی چاہ رہی تھیں۔ کسی کو ان سے بحث کا یارا نہ تھا۔ بڑی سی چادر میں لپٹی تابین کو کشف نے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا تھا۔

فائقہ بیگم اور آئمہ کو تو اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ گھر پہنچ کر بھی کشف نے ہی اسے بیڈروم تک پہنچایا تھا۔ وہ سیج جو شاید بہت ارمانوں سے اس کی بہن کے لیے سجائی گئی تھی اب اس پر بیٹھنا تابین کو پڑ رہا تھا۔ تابین کے بدن پر بھی وہی عروسی جوڑا تھا جو رواج کے مطابق دولہا والوں کی جانب سے پہلے ہی دلہن کے لیے بھجوایا گیا تھا۔

فرزین گداز بدن کی لڑکی تھی۔ اس کے ناپ کے مطابق سلا یہ خوب صورت ترین لباس تابین جیسی نازک اندام لڑکی پر ڈھیلا ڈھالا لگ رہا تھا۔ میک اپ کے نام پر بھی شاید لپ اسٹک ہی ہونٹوں کی زینت بنی تھی۔

بھاری بھرکم عروسی جوڑا' ڈھیر سارے زیور اور ڈھلے' دھلائے چہرے پر فقط لپ اسٹک لگائے وہ انتہائی مضحکہ خیز اور حواس باختہ دلہن لگ رہی تھی۔ کشف کو اس پر جی بھر کر ترس آیا۔ وہ اپنی بہن کے کیے کی ذمہ دار نہ تھی' اس کے باوجود بہن کی غلطی کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔

''آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔ میں آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔'' کشف نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ وہ شاید کشف کی ہی ہم عمر تھی لیکن اب اس کی بڑی بھاوج کے رتبے پر فائز تھی اس لیے اس نے تابین کو آپ کہہ کر ہی مخاطب کیا ورنہ جب ایک' دو بار گھر والوں کے ساتھ فرزین بھابھی کے ہاں جانا ہوا تھا تو اس نے تابین سے بے تکلفی کے ساتھ خاصی گپ شپ لگائی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے صرف ایک گلاس پانی کے ساتھ کوئی پین کلر مل جائے تو۔'' تابین دھیرے سے بولی تھی۔ کشف کے دل کا تاسف مزید بڑھ گیا۔ وہ اس وقت کس ذہنی اذیت میں مبتلا تھی کشف بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

''میں لاتی ہوں۔'' وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ لاؤنج

آباد تھا۔ سب مہمان ابھی تک آج کے واقعے پر ہی اظہار خیال میں مصروف تھے۔

"اے کشف بیٹا! تمہاری ماں تو سر لپیٹ کر کمرے میں بند ہو گئی ہے۔ مہمان بھوکے ہیں کچھ کھانے دانے کا بندوبست کرو بھئی۔" نائلہ ممانی نے اسے مخاطب کیا۔

کھانا دلہن کے ساتھ آیا ہے ممانی! بس تھوڑا انتظار کرلیں۔" اسی وقت آئمہ بھی ادھر آ نکلی تھی جواب اسی کی طرف سے آیا۔

کشف نے گرم دودھ کے گلاس کے ساتھ سر درد کی گولی تابین کو دی اور پھر ماں کے کمرے کا رخ کیا۔ حسب توقع عطیب وہیں موجود تھا۔ آئمہ اسے سمجھا رہی تھی۔

"پہلے ہی بہت جگ ہنسائی ہو چکی ہے عطیب! مزید تماشا مت بنواؤ۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔" آئمہ نرم لہجے میں بھائی سے مخاطب تھی۔

"مزید تماشا سے آپ کی کیا مراد ہے آپی! تماشا لگنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا؟" وہ زہرخند لہجے میں مخاطب ہوا۔ آئمہ نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"میں تمہاری ذہنی کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ ہم آج اس لڑکی کو بیاہ کر لائے ہیں تو یہ کڑوا گھونٹ صرف دنیا والوں کے سامنے اپنے بھرم کی خاطر پیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ مجبوری کے اس بندھن کو ہمیشہ کے لیے اپنے گلے کا طوق بنائے رکھو۔ فی الحال وقت گزرنے دو پھر کوئی فیصلہ کرلیں گے۔ پریشان کیوں ہو رہے ہو" آئمہ نے لاڈلے بھائی کو پیار سے سمجھایا۔ کشف نے شاکی نگاہوں سے بہن کو دیکھا مگر اس وقت ان سے بحث کرنا مناسب نہ تھا۔

"آئمہ ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! اگر آج تابین سے تمہارا نکاح نہ پڑھواتے تو کل دنیا والوں کے سامنے ولیمے کا فنکشن ملتوی ہونے کا کیا جواز پیش کرتے۔ فی الحال صورت حال کی نزاکت کو سمجھو۔ اگر یہ رشتہ نباہنے پر تمہارا من مائل نہ ہوا تو ہم تمہارے فیصلے کی پشت پر ہوں گے۔ شادیاں بھی اسی دنیا میں ہوتی ہیں اور نباہ نہ ہو سکے تو طلاق دینا آج کے دور میں کوئی ایسے اچنبھے کی بات نہیں ہے تم ہرگز پریشان مت ہو، بس کچھ عرصے کے لیے مجبوری کا یہ بندھن برداشت کرلو۔" فائقہ بیگم نے بھی بیٹے کو مطمئن کرنا چاہا، عطیب جواب میں کچھ نہ بولا بس خاموشی سے اٹھ گیا تھا۔

"رکیں بھائی!" جیسے ہی وہ کمرے سے نکلا کشف اس کے پیچھے لپکی تھی۔ عطیب نے سوالیہ نگاہیں اس پر گاڑیں۔

"جو کچھ ہوا اس میں تابین کا کوئی قصور نہیں۔ کسی اور کے کیے کی سزا اسے مت دیجیے گا۔ اس سے نرمی سے پیش آیئے گا۔" کشف نے جھجکتے ہوئے بڑے بھائی کو مخاطب کیا تھا۔

"اپنی عمر سے بڑی باتیں مت کیا کرو کشف۔" عطیب اسے جھڑک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

کشف وہیں کھڑی بے بسی سے لب کاٹتی رہی۔

☆☆☆

وہ اپنے ماں' باپ کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ماں باپ نے اکلوتے بیٹے کو بہت لاڈوں سے پالا تھا لیکن دنیا تسلیم کرتی تھی کہ لاڈ پیار کے باوجود فائقہ اور رضوان نے بیٹے کی تربیت مثالی انداز میں کی ہے۔ خوب صورتی اور ذہانت تو خیر خداداد تھی لیکن سلجھی ہوئی شخصیت یقیناً تربیت کا نتیجہ تھی۔

یونیورسٹی ـــــ اور پھر عملی زندگی میں بہت سی لڑکیاں اس کی شان دار شخصیت کی طرف ملتفت ہوئیں لیکن عطیب نہ تو دوستی میں خود ایک حد سے آگے بڑھا نہ کسی کو بڑھنے کا موقع دیا۔ قریبی رشتہ داروں میں بھی بہت سے لوگ اپنی بیٹیوں کا عطیب سے رشتہ جوڑنے کے خواہش مند تھے۔

رضوان صاحب کی چھوٹی بہن عظمیٰ ان میں سرفہرست تھیں لیکن فائقہ کو نند کی بیٹی کے بے باک سے انداز و اطوار پسند نہ تھے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے

عظمٰی کے میاں کا کاروبار خوب چمک اٹھا تھا۔ دولت کی ریل پیل کے ساتھ ان کے انداز و اطوار ہی بدل گئے۔ بچوں کو بھی بے لگام آزادی مل گئی۔

عظمٰی نے بھائی کے سامنے دبی زبان میں لائبہ اور عطیب کے رشتے کی بات کی تھی لیکن فائقہ کی رضا مندی نہ پا کر رضوان نے چھوٹی بہن سے سہولت سے معذرت کر لی۔ اب سب خاندان والے منتظر تھے کہ فائقہ بیگم اپنے اکلوتے نور نظر کے لیے کیا گوہر نایاب ڈھونڈتی ہیں اور فائقہ کو فرزین کی شکل میں وہ گوہر نایاب مل ہی گیا۔ رضوان صاحب کے ایک دیرینہ شناسا نے دونوں خاندانوں کا آپس میں رابطہ کروایا تھا۔ فائقہ کو برہان صاحب کا گھرانہ بے حد پسند آیا تھا۔

وہ خاندانی اطوار رکھنے والے شائستہ مزاج اور ملنسار لوگ تھے۔ دونوں گھرانوں کی اقدار میں بے حد مماثلت تھی۔ نظریات اور خیالات کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ برہان صاحب کی بیٹی فرزین کے بے پناہ حسن نے فائقہ بیگم کا دل ہی موہ لیا۔ آئمہ کو بھی شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی فرزین بے پناہ پسند آئی تھی۔

فائقہ بیگم نے فوراً ہی ان لوگوں کے سامنے عطیب کے رشتے کے لیے دست سوال دراز کر دیا۔ سوچ بچار کی رسمی مہلت کے بعد وہاں سے مثبت جواب مل گیا۔ منگنی کے بجائے شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ فائقہ بیگم اور آئمہ اٹھتے بیٹھتے فرزین کے حسن اور معصومیت کے قصیدے پڑھتیں۔ عطیب کا دل بھی انوکھی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔

وہ ماں' باپ کے ہمراہ دوبار سسرال گیا تھا۔ فرزین کچھ دیر کے لیے ساس کی سسر کو سلام کرنے ڈرائنگ روم میں آئی تھی اور اس کے ایک جھلک نے ہی عطیب کو سرشار کر دیا تھا۔ ماں نے واقعی اس کے لیے گوہر نایاب ڈھونڈا تھا۔ پہلی بار اس کے جی میں خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے دوستوں کی طرح وہ بھی ہونے والی بیوی سے ٹیلی فونک رابطہ قائم کرلے۔

آئمہ آپی کے سامنے اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔

"پاگل ہوئے ہو عطیب۔ فرزین آج کل کی لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ تو ہم لوگوں سے بات کرتے ہوئے نظریں نہیں اٹھاتی۔ سلام دعا کرنے کے ساتھ ہی کھسک جاتی ہے تم سے فون پر بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی نہ ہی اس کے گھر والے اجازت دیں گے۔" آئمہ آپی نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔

"اور اب تو خیر سے چند دنوں کی بات ہے پھر وہ چاند ہمارے آنگن میں اتر آئے گا۔ فرصت سے اسے تکتے بھی رہنا اور ڈھیروں باتیں کرنا۔"

آئمہ نے بھائی کو پیار سے چھیڑا۔ وہ جھینپ کر ہنس پڑا۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ قسمت اس کے ساتھ کیسا بھیانک مذاق کرنے والی ہے۔ اس کی ہونے والی منکوحہ نے اس کے شخصی وقار' انا اور مردانگی کو کیسی کاری ضرب لگائی تھی۔ نکاح سے محض چند گھنٹے قبل وہ کسی اور کے ہمراہ زندگی کے نئے سفر پر نکل گئی تھی اور وہ لڑکی جو اب اس کی منکوحہ بن کر اس کے بیڈروم میں موجود تھی' عطیب اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا' فرزین نام سے جڑا کوئی حوالہ اسے اب اپنی زندگی میں گوارا نہ تھا۔ لیکن فرزین کی چھوٹی بہن اس کی زندگی کی اٹل حقیقت بن کر اس کے کمرے میں موجود تھی۔

بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھی — ڈری سہمی اور انتہائی حواس باختہ شکل والی اس لڑکی پر عطیب کو ایک پل کے لیے بھی ترس نہ آیا بلکہ اس کے غصے اور جھنجلاہٹ میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ آخر اس نے باپ کی بات مانی ہی کیوں۔ وہ لڑکی ذات تو نہ تھا کہ گھر کی دہلیز سے بارات لوٹتے وقت بدنامی کے خوف سے کسی بھی دستیاب شخص سے رشتہ جوڑنا پڑ جاتا۔ اسے نکاح سے انکار کر دینا چاہیے تھا کچھ عرصے بعد کوئی معقول اور مناسب ساجیون ساتھی مل ہی جاتا۔ اسے فرزین جیسی لڑکی کی بہن سے کوئی رشتہ ہرگز نہ جوڑنا چاہیے تھا۔ اپنی حماقت پر اب رہ رہ کر تاؤ آ رہا

تھا۔

"یوں آنکھیں پھاڑ کر مجھے کیا دیکھ رہی ہو۔ جانتی ہو اس مضحکہ خیز حلیے میں تم اس وقت کوئی کارٹون کریکٹر لگ رہی ہو۔" وہ اپنی ناگواری کا اظہار کیے بنا نہ رہ پایا تھا۔ تابین نے پلکیں جھپک کر آنسو چھلکنے سے روکے تھے۔

"میرا بس چلے تو ایک پل ضائع کیے بنا تمہیں اس کمرے سے بھی بے دخل کر دوں اور اپنی زندگی سے بھی لیکن فی الحال مجبور ہوں۔ میرے ماں' باپ دنیا والوں کی زبانوں سے خائف ہیں، محض ان کے بھرم کی خاطر میں نے یہ رشتہ جوڑا ہے لیکن مجبوری کے اس بندھن سے کوئی توقع لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری زندگی میں تمہاری گنجائش کبھی نہیں نکل سکتی۔ تمہاری حیثیت بتانے کے لیے مجھے تم سے مخاطب ہونا پڑا ہے ورنہ میں تم جیسی لڑکی پر دوسری نگاہ تک نہیں ڈالنا چاہتا۔"

اس نے تنفر بھرے انداز میں تابین کو مخاطب کیا تھا۔ اور وہ اس کی آخری بات سن کر تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"آپ مجھ پر دوسری تو کیا پہلی نگاہ بھی مت ڈالیں۔ بھلے سے مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیں یا اس کمرے سے لیکن میرے لیے تم جیسی لڑکی کے الفاظ استعمال مت کریں۔ فرزین آپی کے کیے کسی عمل کی میں ہرگز ذمہ دار نہیں۔ آپ آئندہ مجھے ان سے کمپیئر مت کیجیے گا۔ اس وقت آپ ان سے جتنی نفرت محسوس کر رہے ہیں، میں ان سے اس سے دگنی نفرت کر رہی ہوں۔ انہوں نے میرے امی' بابا کا سر جھکایا۔ صرف اپنے بابا کے کہے کا مان رکھنے کی خاطر میں آپ سے نکاح پر راضی ہوئی ہوں۔ یہ صرف آپ کے لیے مجبوری کا بندھن نہیں۔ میں آپ سے بڑھ کر مجبور ہوں۔" تابین کے لب کپکپا اٹھے تھے۔

عطیب کو اس حواس باختہ شکل والی لڑکی سے اتنے مدلل جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے تعجب سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا جبکہ تابین بے بسی کے شدید احساس سے دوچار ہو کر گھٹنوں پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی تھی۔

"رونے کا شغل ساری رات جاری رکھ سکتی ہو لیکن آواز کے بغیر' کیونکہ میرے سر میں شدید درد ہے اور میں اب سونا چاہتا ہوں۔" عطیب نے بیزار سے لہجے میں باور کروایا تھا۔ تابین نے گھٹی گھٹی سسکیاں روکنے کے لیے گھٹنوں کے مزید اندر منہ دے لیا تھا۔ عطیب نے اس بار اسے مخاطب کرنا غیر ضروری خیال کیا تھا۔ اس کے اعصاب اس قدر تھک چکے تھے کہ فی الوقت وہ گہری اور پرسکون نیند کا متمنی تھا۔ نیند ہی حالات سے وقتی فرار کا ذریعہ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ واقعی سو گیا تھا۔ تابین نے رات کتنی دیر تک رونے کا شغل پورا کیا عطیب کو نہ تو اس کا علم تھا اور نہ ہی اس سے کوئی سروکار تھا۔

☆☆☆

وہ تابین برہان تھی۔ اپنے ماں' باپ کی سب سے پیاری اور فرماں بردار بیٹی۔ خدیجہ نے اپنے چاروں بچوں کی تربیت مثالی انداز میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس تربیت کا صحیح عکس تابین کی ذات میں ہی جھلکتا تھا۔ فرزین خدیجہ اور برہان کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ دلکش نقوش والی' گوری چٹی' بہت پیاری بچی۔ دادی اور پھوپھیاں اس کے لاڈ اٹھاتے نہ تھکتیں۔ اس لاڈ پیار نے اس کی طبیعت میں تھوڑی سی خودسری پیدا کر دی تھی۔ چار برس تک اسے گھر کا اکلوتا بچہ ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ تابین پیدا ہوئی تو پھوپھیاں بیاہ کر اپنے اپنے گھربار کی ہو گئی تھیں۔

دادا' دادی بھی بیمار اور ضعیف ہو چکے تھے پھر وہ فرزین کی طرح غیر معمولی حسین بھی نہ تھی۔ اسے ددھیال کا بے جا لاڈ پیار نہ ملا' ہاں ماں باپ کو وہ فرزین سے کم پیاری نہ تھی۔ وقت گزرنے اور عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی پیاری عادتوں نے اسے ماں باپ کے دل کے مزید قریب کر دیا تھا۔ برہان دفتر

سے آتے تو وہ خدیجہ کی دیکھا دیکھی سب سے پہلے انہیں پانی کا گلاس پیش کرتی۔ پھران کی چپلیں پاس لاکر رکھتی۔ فرزین کی طرح کبھی بے جا فرمائش یا ضد نہ کرتی۔ اسامہ اور رضا دونوں اوپر تلے کی پیدائش تھے۔ تابین چھوٹے بھائیوں کو سنبھالنے میں ماں کی حتی المقدور مدد کرتی۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود اس نے چھوٹی عمر سے ہی گھر کے کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

"میری یہ بیٹی تو میری کسی نیکی کا انعام ہے برہان صاحب۔" خدیجہ تنہائی میں شوہر کے سامنے بیٹی کی تعریف کرتیں، برہان مسکرا دیتے۔ فرزین بھی ماں باپ سے پیار کرتی تھی۔ اپنے سے چھوٹی تابین سے بھی اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن وہ فطرتاً من موجی اور لا پرواقسم کی لڑکی تھی۔ شعور کی منزل پر پہنچنے پر ماں نے دونوں بیٹیوں کو اچھائی' برائی کا فرق اور صحیح' غلط کی تمیز سکھا دی تھی لیکن وہ سبق جو تابین نے اپنی گرہ سے باندھ لیے فرزین نے ان پر سرسری سا ہی غور کیا تھا۔ مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ اپنے کلاس فیلو کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

اس کا حسن اسے ویسے بھی سب میں ممتاز کرتا تھا۔ گھر سے بہت اہتمام سے پردہ کر کے جاتی لیکن یونیورسٹی پہنچ کر دوپٹہ شانوں پر ڈھلک جاتا۔

دانیال بھی اس کی زلف ـــ کا اسیر ہوگیا تھا۔ دونوں نے مل کر مستقبل کے لیے بہت سے عہد و پیمان باندھے تھے۔ ان ہی دنوں اس کے لیے عطیب کا رشتہ آ گیا' فرزین کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ماں' باپ اتنی جلدی اس رشتے کو سند قبولیت بخش کر شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دیں گے۔ ماں باپ کی ناراضی اور ان کے ممکنہ ردعمل سے خائف ہو کر وہ رشتہ طے ہونے تک انہیں دانیال کا بتا ہی نہ پائی لیکن جب رشتہ پکا ہونے کے بعد شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں تو اس نے ہمت کر کے خدیجہ کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔

خدیجہ تو بیٹی کی زبانی یہ سب سن کر ششدر ہی رہ گئی تھیں۔ اپنے گھرانے کی اقدار اور بچوں کی مثالی تربیت کا مان پل بھر میں ہوا ہو گیا۔ بیٹی کی داستان عشق سن کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ عطیب کے گھر والوں کی آمد پر فرزین کے جس رویے کو وہ شرم و جھجک پر محمول کرتی تھیں۔ اب پتا چلا وہ تو ان کی بیٹی کا اظہار لاتعلقی اور ناپسندیدگی تھا۔ خدیجہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اپنی کوکھ جنی بیٹی کی اداؤں کو کیوں سمجھ نہ پائیں۔ اگر وہ ماں کو پہلے ہی اعتماد میں لے لیتی تو شاید صورت حال اتنی گھمبیر نہ ہوتی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک معزز گھرانے سے رشتہ جڑ چکا تھا۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ایسے وقت وہ کیسے بیٹی کی خواہش پر سر جھکا دیتیں۔

انہوں نے پیار' محبت' ڈانٹ' دھمکی ہر طرح کا حربہ آزما کر فرزین کو زبان بندی پر مجبور کر دیا۔ ان کا خیال تھا یہ وقتی خمار عطیب سے شادی کے بعد اتر جائے گا۔ عطیب میں کس چیز کی کمی تھی۔ پڑھا لکھا' خوبرو' برسر روزگار' خدیجہ تو یہ رشتہ طے ہونے کے بعد سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً شکرانے کے نفل پڑھتی رہتی تھیں جبکہ ان کی عاقبت نااندیش بیٹی کفران نعمت کی مرتکب ہو رہی تھی۔ اپنی دانست میں انہوں نے فرزین کو صورت حال کی نزاکت اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ فرزین نے بھی بظاہر چپ سادھ لی۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ اس کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ شوہر کو ہی اس بارے میں اعتماد میں لے لیتیں۔

شادی والی صبح جب فرزین ان کے منہ پر کالک مل کر گھر سے نکلی تو خدیجہ کو اپنی حماقت کا ادراک ہوا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ صدمے سے چُور برہان صاحب نے سمدھیانے کو اس ذلت میں حصہ دار بنانا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے رضوان صاحب کے سامنے تابین کا رشتہ پیش کر دیا۔ تابین تو ابھی بہن کے دیے ہوئے دھچکے سے نہ سنبھلی تھی کہ یہ افتاد سر پر پڑ گئی لیکن اس کڑے وقت میں وہ باپ

www.urdusoftbooks.com

کی حکم عدولی کی مرتکب نہ ہو سکتی تھی۔
فرماں بردار بیٹی کو اپنی فرماں برداری کا ثبوت دینا پڑا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں والدین سے سخت شاکی تھی۔ بہن کے کیے کی سزا اسے بھگتنی پڑی تھی۔ اپنی زندگی کے سب منصوبے، ساری آرزوئیں امنگوں کا گلا گھونٹ کر اس نے سسرال کی اجنبی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ جانے وہ لوگ اس سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ توقعات کے عین مطابق وہاں اس سے مثالی برتاؤ نہ کیا گیا تھا۔ وہ ان چاہی تھی۔ مجبوری کے عالم میں کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ لوگ اسے بیاہ تو لائے تھے لیکن عطیب سمیت ان سب کی نگاہوں میں حقارت اور بےزاری تھی۔

☆☆☆

وہ لڑکی جو شادی والے روز مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھی آج اس پر الگ ہی روپ چڑھا تھا وہ ہمیشہ سادہ رہتی تھی۔ پہلی بار تیار ہوئی تھی۔ جب ماہر بیوٹیشن نے اس کے سنگھار کو فائنل ٹچ دیا تو وہ آئینے میں اپنا روپ دیکھ کر خود بھی ششدر رہ گئی تھی۔
ولیمے کا جوڑا بھی فرزین کے ناپ کا ہی تھا۔ لیکن مناسب فٹنگ کے بعد اس کے بدن پر خوب جچ رہا تھا۔ جس پارلر میں فرزین نام کی دلہن نے تیار ہونا تھا وہاں اب تابین تیار ہوئی تھی۔ پارلر والوں کو نام کی تبدیلی سے چنداں سروکار نہ تھا۔ ہنر مند بیوٹیشن کے مشاق ہاتھوں نے اس کا پور پور سجا دیا تھا۔ آئمہ اس کے ہمراہ تھی۔ بادل نخواستہ ہی سہی مگر رسم دنیا نبھانے کے لیے ولیمے کی تقریب کے لیے دلہن کے سنگھار سمیت سارے لوازمات پورے کرنا تھے۔
قریبی رشتہ داروں سے بھی استدعا کی گئی تھی کہ دنیا والوں کے سامنے دلہن کی تبدیلی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے گریز کریں۔ بظاہر سب نے ہی ان کی عزت کو پورے خاندان کی عزت قرار دے کر اس معاملے میں زبان بندی کا یقین دلایا تھا۔
رضوان صاحب کا وسیع حلقہ احباب تھا۔ خود فائقہ کے جان پہچان والوں کی تعداد کم نہ تھی۔ عطیب کے کولیگز، یار دوست، پڑوسی غرض ایک بہت بڑی تعداد میرج ہال میں موجود تھی۔ شناسا خواتین فائقہ بیگم کو اتنی پیاری بہو ڈھونڈنے پر مبارک باد دے رہی تھیں، وہ جبری مسکراہٹ چہرے پر سجائے سب کی مبارک بادیں وصول کرتی پھر رہی تھیں۔
"تابین کتنی پیاری لگ رہی ہے نا آئمہ آپی۔ کل تو فرزین کے مقابلے میں بالکل عام سی لگ رہی تھی۔" کشف نے بہن کو مخاطب کیا۔
"اس کی بہن بھی شکل سے کم معصوم نہیں لگتی تھی۔ اللہ جانے اس کے بھی کیا کرتوت ہوں گے۔" آئمہ نے تنفر بھرے انداز میں جواب دیا۔ کشف چپ کی چپ رہ گئی۔
اسٹیج پر دولہا، دلہن، کا فوٹو سیشن جاری تھا اور آئمہ کے دونوں بچوں کے علاوہ گھر کا کوئی فرد اس موقع پر جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کر رہا تھا۔ سات سالہ بیشا اور پانچ سالہ ریان ہی دلہن ممانی کے ساتھ پوز بنوا بنوا کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ دولہا میاں بھی جلد ہی فوٹو سیشن سے جان چھڑا کر اپنے دوستوں کے پاس جا پہنچے تھے۔
"یونیورسٹی میں جو لڑکیاں تم پر مرتی تھیں ان میں سے ایک بھی تو تمہاری دلہن کے پاسنگ نہیں۔ اپنی امی کی مرضی پر چھوڑ کر فائدے میں رہے۔ آنٹی نے بہت پیاری دلہن ڈھونڈی ہے تمہارے لیے۔" نازش جو اس کے بیسٹ فرینڈ عادل کی بیوی اور خود عطیب کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ عطیب کو مسکراتے ہوئے مبارک باد دے رہی تھی۔ عطیب محض مسکرا دیا۔
"کاش ہم بھی ماں کی پسند پر ہی سر جھکاتے۔" عادل نے بیوی کو چھیڑا تھا۔ حسب توقع نازش فوراً خفا بھی ہو گئی لیکن آج عطیب ان کے درمیان ثالثی کروانے کے لیے نہ کودا۔ اس کا کسی سے مخاطب ہونے کو بھی دل نہ کر رہا تھا۔ جی میں دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی کل والی بدمزگی سے

واقف نہ ہو جائے۔

عظمٰی پھوپھو خواتین کے ایک گروپ میں بیٹھی جانے ان سے چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ لائبہ بھی استہزائیہ انداز میں کبھی اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی تابین کو دیکھتی تو کبھی طنزیہ مسکراہٹ عطیب کی جانب اچھال دیتی۔

عطیب بہت مشکلوں سے دلی کیفیت چھپائے مہمانوں سے ملنے میں مصروف تھا۔ تقریب کے تقریباً اختتام پر تابین کے والدین بھی تشریف لے آئے تھے۔ دنیا دکھاوے کی خاطر عطیب کو ان سے سلام دعا کرنی پڑی تھی لیکن خدیجہ آنٹی جس بے قراری سے بیٹی سے ملنے کو بڑھی تھیں۔ بیٹی نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا تھا۔ ماں، باپ سے ملتے وقت اس کے سرد و سپاٹ انداز سے عطیب کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ماں، باپ سے بے تحاشا خفا ہے۔ بیٹی کی سرد مہری محسوس کر کے خدیجہ آنٹی نے بہت مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے پھر عطیب کی جانب متوجہ ہوئیں۔

''جو کچھ ہوا اس میں میری تابین کا کوئی قصور نہیں عطیب! یہ میری سب سے پیاری اور فرماں بردار بیٹی ہے۔ اس کی بہن کے کیے کی سزا اس کو مت دینا۔'' انہوں نے دھیرے سے داماد سے التجا کی تھی۔ عطیب لب بھینچے خاموش کھڑا رہا۔ ساس کی تسلی کے لیے دو بول بولنے کی زحمت بھی نہ کی۔ خدیجہ دل مسوس کے آگے بڑھ گئی تھیں وہ اب فائقہ بیگم سے رسم کے مطابق تابین کو ساتھ لے کر جانے کی بات کر رہی تھیں۔ فائقہ بیگم کے چہرے پر کٹیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کی ڈھٹائی کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ جن حالات میں یہ شادی ہوئی آپ کو ابھی بھی خوش گمانی ہے کہ سب کام ریت، رواجوں کے مطابق ہوں گے۔ شوق سے لے جایئے اپنی بیٹی کو لیکن پھر عطیب اسے واپس لائے گا یا نہیں میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' انہوں نے سمدھن کو دو ٹوک جواب دیا تھا۔

''چلیں، جب عطیب بیٹے کا دل صاف ہوگا، وہ تابین کو ہم سے ملوانے لے آئے گا۔'' خدیجہ دل گرفتہ سے یہ ہی کہہ پائی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد رضوان صاحب نے بیوی کو خفگی سے دیکھا۔

''کیا ہو گیا ہے فائقہ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم بھی عام عورتوں کی طرح بی ہیو کرو گی۔ یوں خدیجہ بھابھی کو طعنے دینے سے کیا حاصل۔ جب انسان کی زندگی کسی غیر معمولی واقعے سے دوچار ہوتی ہے تب ہی اس کے تحمل، حقیقی ظرف اور برداشت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں کسی بھی طرح کے حالات میں تم سے کم ظرفی کی توقع نہیں کر سکتا۔'' رضوان صاحب شریک سفر پر خفگی کا اظہار کیے بنا نہ رہ پائے۔

''میں اس وقت بڑے ظرف کا مظاہرہ نہیں کر سکتی رضوان! میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ان کی بیٹی کی وجہ سے غارت ہوئی ہے۔ میرے بیٹے کی زندگی کو کیسے تماشا بنا دیا گیا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدیجہ بھابھی کو بیٹی کے عمل کی بھنک بھی نہ پڑی ہو۔ اس نے یقیناً پہلے گھر والوں کو منانے کی کوشش کی ہو گی۔ کاش یہ اپنی بیٹی کے ساتھ زور، زبردستی نہ کرتے۔ اس کی پسند کو اپنا لیتے۔ نہ ان کا شملہ نیچا ہوتا نہ یہ تذلیل ہمارا مقدر بنتی۔'' فائقہ ایک بار پھر سسک پڑی تھیں۔

''اچھا چلو اب حوصلہ کرو آنسو پونچھو۔ ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اللہ سے خیر کی ہی امید رکھو۔'' انہوں نے بیوی کو رسانیت سے سمجھایا تھا۔

وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فائقہ نے بھی فوراً ہی آنکھیں صاف کر کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجالی تھی۔ فنکشن اختتام پذیر تھا اور اب انہوں نے مہمانوں کو رخصت کرنا تھا۔ شوہر کی معیت میں وہ آگے بڑھ گئی تھیں۔

☆☆☆

پہلی رات کے بعد نہ عطیب نے اسے مخاطب

کیا نہ تابین کی طرف سے کوئی ایسی کوشش کی گئی۔ وہ ایک چھت تلے اجنبیوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ عطیب تو صرف سونے کے لیے ہی کمرے کا رخ کرتا جبکہ تابین کا سارا وقت کمرے میں ہی گزرتا۔ جب تک کشف گھر میں تھی وہ اس کا خیال رکھنے کی اپنی سی کوشش کر لیتی تھی لیکن اب وہ واپس ہاسٹل سدھار گئی تھی۔ کشف میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی اور دوسرے شہر کے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کی وجہ سے وہیں ہاسٹل میں مقیم تھی۔

آئمہ آپی کا گھر قریب تھا وہ ہر دوسرے، تیسرے دن چکر لگاتی تھیں لیکن تابین پر ایک کٹیلی نگاہ ڈالنے کے سوا اسے مخاطب تک کرنے کی روادار نہ ہوتی تھیں۔ ہاں کبھی سامنا ہونے پر ان کے شوہر مدثر بھائی شفقت بھرے انداز میں اس سے حال احوال ضرور دریافت کرتے۔ دونوں بچوں کی البتہ وہ فیوریٹ مامی تھی۔ وہ آتے کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں گھس جاتے۔ تابین جو انسانوں سے بات کرنے کو ترستی تھی ان بچوں کا دم اسے غنیمت لگتا۔ وہ ان کے ساتھ کارٹون دیکھتی انہیں کہانیاں سناتی اور کبھی کبھار لڈو کی بازی بھی جمتی۔ ریان اور میشا ماں کی ہدایت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس سے بہت بے تکلف ہو چکے تھے۔ اس روز بھی عطیب موبائل کا چارجر لینے کمرے میں آیا تو میشا تابین کا سر کھا رہی تھی۔

"بتائیں نا تابین مامی! آپ نئے نئے کپڑے کیوں نہیں پہنتیں؟ میری بیسٹ فرینڈ کے چاچو کی شادی ہوئی ہے اس کی دلہن چاچی تو اچھے اچھے کپڑے پہنتی ہیں۔ آپ تو لپ اسٹک بھی نہیں لگاتیں۔" میشا کو اس کے نہ سجنے سنورنے پر قلق ہو رہا تھا۔ عطیب نے ایک سرسری نگاہ تابین کے چہرے پر ڈالی۔ وہ اس وقت بھی کاٹن کے سادہ سے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ تو ہر وقت ہی سر پر جمائے رکھتی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز سادہ سا چہرہ۔

"آپ کاپی پنسل لے کر آؤ۔ آج ہم ایک نیا گیم کھیلتے ہیں۔"

اس نے میشا کا سوال ٹالا تھا۔ عطیب چارجر لے کر باہر نکل گیا۔ لاؤنج میں بھی گفتگو کا موضوع تابین کی ہی ذات تھی۔

"اپنی ماں کو سمجھاؤ بیٹا۔ اس بچی پر رحم کھائیں۔ وہ قید تنہائی کے مجرموں کی طرف زندگی گزار رہی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا مجبوری ہے۔ بے چاری رات کو سب کے سونے کے بعد چوروں کی طرح کمرے سے نکلتی ہے اور ذرا سا کھانا پلیٹ میں لے کر پھر کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نہ تمہارے بھائی کو اس پر ترس آتا ہے نہ تمہارے ماں کو۔" رضوان صاحب شاکی لہجے میں آئمہ سے مخاطب تھے۔

"اس سے گھر کے کام کاج کروایا کریں امی! یوں مہارانی بن کر سارا دن چارپائی توڑتی رہتی ہے آپ کو اس سے کیا حاصل۔"

آئمہ کا مشورہ سن کر رضوان صاحب بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ کٹھورپن میں ان کی بڑی بیٹی بھی ماں اور بھائی سے کم ثابت کب ہوئی تھی۔

"اپنے گھر کے کاموں کے لیے میں اس کی محتاج نہیں ہوں، سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اس کی شکل تک دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔" فائقہ صاف گوئی سے بولی تھیں۔

"سو آپ لوگوں کو تو سمجھانا ہی فضول ہے۔" رضوان خفگی سے کہہ کر وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ فائقہ اور آئمہ کو ان کی خفگی سے چنداں سروکار نہ تھا۔

عطیب بھی وہیں بیٹھا اپنے سیل فون پر ای میل چیک کرنے میں مصروف تھا لیکن دھیان بھٹک کر باپ کی باتوں کی جانب جا رہا تھا۔ کیا خوفناک تشبیہات استعمال کی تھیں انہوں نے 'قید تنہائی کا مجرم' 'رات کو چوروں کی طرح کمرے سے نکل کر ذرا سا کھانا پلیٹ میں لینا' کیا واقعی وہ لڑکی مظلوم تھی اور

وہ سب اس کے حق میں ظالم ثابت ہو رہے تھے۔
اس نے سر جھٹک کر ان سوچوں کو دماغ سے نکالا تھا۔

☆☆☆

خاندان میں — دو چار لوگوں نے نئے شادی شدہ جوڑے کو کھانے پر مدعو کرنے کی رسم نبھائی تھی لیکن یہ رسمی دعوت ٹیلی فون پر دی جاتی تھی اور فائقہ فون پر ہی معذرت کر لیتیں لیکن عظمیٰ پھوپھو بنفس نفیس انہیں ڈنر پر مدعو کرنے گھر تشریف لائی تھیں۔
لائبہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔

"دعوت کے تکلف کی کیا ضرورت ہے عظمیٰ! تم جانتی تو ہو شادی کن حالات میں ہوئی ہے۔" عظمیٰ کے اصرار پر فائقہ نے جزبز ہوتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"شادی جن حالات میں بھی ہوئی بھابھی! اب خیر سے تابین آپ کی بہو ہے۔ اب آہستہ آہستہ اسے خاندان والوں سے بھی متعارف کروائیں نا۔ ہم نے تو ولیمے کے بعد اس کی شکل تک نہ دیکھی۔" عظمیٰ کو بھاوج کا بجھا بجھا سا لہجہ بہت مزا دے رہا تھا۔

"اور کیا مامی! بھابھی کو ہمارے ہاں لے کر آئیں نا۔ ہم سے تو ابھی تک ان کا تعارف بھی نہیں ہوا ہے۔"

مسکارے سے بوجھل آنکھیں پٹ پٹا کر بولنے والی یہ لائبہ تھی۔ چست جینز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے وہ اس وقت اپنی دانست میں حسینہ عالم لگ رہی تھی۔

"آپ دن بتا دیں پھوپھو۔ میں اور تابین آجائیں گے۔" عطیب کے منہ سے جیسے خود بخود پھسلا تھا۔

فائقہ نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔ توقع کے خلاف جواب پا کر عظمیٰ اور لائبہ بھی ذرا بدمزا ہوئی تھیں۔ وہ کچھ اور سننے کی متمنی تھیں۔ دعوت کا کھڑاگ کون کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو جسٹ فارا نجوائے منٹ والا معاملہ تھا لیکن اب اپنی بات نبھانا پڑ گئی تھی۔

"دیکھ لو بیٹا! جو دن تمہیں سوٹ کرے۔ کوئی مصروفیت نہ ہو تو سنڈے کو پروگرام رکھ لو۔" عظمیٰ نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بھتیجے کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے پھوپھو!" عطیب نے ان کی تجویز کی تائید کر دی تھی۔

"بھابھی کو تو بلائیں عطیب! پچھلی بار ہم آئے تھے جب بھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔" لائبہ نے اسے زچ کرنے کی اپنی سی ایک اور کوشش کی تھی۔ خاندانی سی آئی ڈی کے نتیجے میں تابین کے اس گھر میں مقام سے سب ہی واقف تھے۔

"وہ سو رہی ہے۔" فائقہ نے اس بار بیٹے کو جواب دینے کی زحمت سے بچا لیا تھا۔

"پچھلی بار بھی سو رہی تھیں۔ کیا انہیں اتنی نیند آتی ہے۔" لائبہ لطف لیتے ہوئے بولی۔ عطیب نے بہت مشکل سے اپنی ناگواری چھپائی تھی۔ چند منٹ ان کے پاس بیٹھ کر وہ بیڈروم میں چلا گیا تھا۔

تابین جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تھے اور بند آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو گالوں پر پھسل رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ فٹافٹ آنسو پونچھے اور پھر جائے نماز ہی سمیٹ دی۔ اس وقت عطیب کی کمرے میں آمد غیر متوقع تھی۔ وہ اسی لیے تھوڑا سا گڑبڑا گئی تھی اور عطیب سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی ہر کام اتنا چوری چھپے کیوں کرتی ہے۔ وہ فجر کی نماز کے لیے بھی بالکل دبے پاؤں اٹھتی تھی لیکن عطیب اتنے دنوں میں اس کے معمولات سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ چاہے چوری چھپے سہی لیکن نماز پورے خشوع و خضوع سے ادا کرتی تھی۔

☆☆☆

عظمیٰ پھوپھو کے ہاں ڈنر پر جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ انہوں نے اپنی کسی ہنگامی مصروفیت کا عذر پیش کرتے ہوئے ڈنر آئندہ کی کسی تاریخ تک موخر

کر دیا تھا۔

"بس اتنی سی بات تھی امی۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کا یہ ہی طریقہ ہوتا ہے آپ اس روز بلاوجہ پریشان ہو رہی تھیں۔" عطیب نے مسکرا کر ماں کو مخاطب کیا۔ فائقہ بھی مسکرادی تھیں۔

عظمٰی کے ڈنر سے جان چھوٹی تو عادل اور نازش نے پیچھا لے لیا۔ وہ نئے شادی شدہ جوڑے کو اپنے ہاں لنچ پر مدعو کرنا چاہ رہے تھے۔ عطیب کو ان کے اصرار کے آگے ہار ماننا پڑی تھی۔

"تابین کو بتادیں امی! کہ کل تیار ہو جائے۔ عادل نے لنچ پر انوائیٹ کیا ہے۔" اس نے تابین کو خود مخاطب کرنے کے بجائے یہ کام فائقہ کے سر ڈالا۔

"ایسے کب تک چلے گا عطیب۔" فائقہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"کیسے...... کب تک ......" وہ واقعی کچھ نہ سمجھا۔

"تمہارے ابو نے میرا پیچھا ہی پکڑ لیا ہے۔ وہ تم سے اور مجھ سے سخت خفا ہیں، کہتے ہیں اگر عطیب یہ رشتہ نبھانے میں سنجیدہ نہیں تو اس لڑکی کو اپنے نام سے جوڑ کر کیوں اپنے گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ یہ تابین کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔ عطیب جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تابین کو اپنا لے اور اگر اس پر راضی نہیں ہوتا تو اسے اس نام نہاد بندھن سے آزاد کر دے۔" فائقہ نے شوہر کا پیغام من وعن بیٹے تک پہنچایا تھا۔ عطیب چپ سا ہو گیا۔

"یہ تو ابو کے الفاظ ہیں نا۔ آپ کیا کہتی ہیں امی۔" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ماں کی رائے چاہی۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں بیٹا! میری تو عقل خود ماؤف ہو گئی ہے تمہارے ابو کی باتیں سن کر میں بھی وقتی طور پر شرمندہ تو ہو جاتی ہوں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں قطعی گنجائش نہیں پاتی۔ حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ جو کچھ ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن فرزین نام سے جڑے حوالے کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے چڑ اور بے زاری کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں ابھرتا۔" فائقہ صاف گوئی سے بولی تھیں۔ عطیب خاموش رہا تھا۔

"لیکن تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو بیٹا۔ تمہارے ساتھ جو زیادتی ہو چکی ہے اب میں کوئی اور زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ سوچ سمجھ کر جو مرضی فیصلہ کرو۔ نہ اپنے ابو کے دباؤ میں آنے کی ضرورت ہے نہ میری رائے کو حرف آخر جانو۔ اپنے دل کو ٹٹولو جس بھی فیصلے پر پہنچو مجھے آگاہ کر دو۔ تمہارا ہر فیصلہ ہمیں قبول ہو گا۔" فائقہ پر اس وقت صرف ممتا بھرے جذبات حاوی تھے، عطیب نے بنا کچھ کہے محض اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ پہلی بار اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے کہیں لے کر جا رہا تھا۔ تابین دعوت کے لیے بہت اہتمام سے تیار نہ ہوئی تھی لیکن عطیب کو دل میں قائل ہونا پڑا کہ اس معمولی سنگھار میں بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ عادل اور نازش نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا اور جب تابین اور عادل کی والدہ کا آمنا سامنا ہوا تو تابین لپک کر ان سے ملنے آگے بڑھی۔ شگفتہ آنٹی نے بھی والہانہ انداز میں تابین کو ساتھ لپٹایا تھا۔

"عطیب میاں! ہمیں تو خبر ہی نہ تھی کہ تم نے میری سب سے چہیتی شاگرد سے بیاہ رچایا ہے۔" وہ مسکرا کر عطیب سے مخاطب ہوئیں۔

عادل کی والدہ شگفتہ جلال مقامی گرلز کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھیں اور یقیناً تابین کو ان کی شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ استاد شاگرد کی اس اتفاقی ملاقات پر عادل اور نازش بھی خوشگوار حیرت سے دوچار تھے۔

"مما! آپ ہمارے ساتھ عطیب کے ولیمے

پر چلتیں تو یہ انکشاف پہلے ہی ہو جاتا کہ بھابھی آپ کی اسٹوڈنٹ ہیں۔" عادل مسکرا کر ماں سے مخاطب ہوا۔

"مجھے کیا پتا تھا بھئی کہ تابین کی شادی عطیب سے ہوئی ہے۔ ہمارے کالج کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ کی یوں اچانک شادی ہو گئی۔ ہمیں تو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ کئی برسوں میں پہلی بار امکان بنا تھا کہ اس بار میڈلز کی دوڑ میں ہمارا کالج بھی شریک ہو سکے گا لیکن جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دے گئے۔

تابین! میں سخت خفا ہوں تم سے تمہیں یوں اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر ماں، باپ نے رخصت کرنے میں جلدی کر ہی دی تھی تو تم شادی کے بعد اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرتیں۔ کتنی بچیاں ہیں جو شادی کے بعد بھی پڑھائی جاری رکھتی ہیں۔" شگفتہ آنٹی خفگی بھرے انداز میں اپنی چہیتی شاگرد سے مخاطب تھیں۔ تابین سے فوری کوئی جواب نہ بن پڑا تھا وہ کچھ سٹ پٹا سی گئی تھی۔ عطیب کا حال بھی قدرے مختلف نہ تھا۔

"افوہ مما! آپ نے بھابھی کی یہیں کلاس لے لی۔ پہلے کچھ خاطر تواضع تو کر لینے دیجیے۔" عادل نے مداخلت کی۔ عطیب نے سکون کا سانس لیا۔ کھانے کی میز پر بھی شگفتہ جلال تابین کی تعریفیں کرتی رہیں۔

"اپنے پورے کیریر میں مجھے تابین جیسے اسٹوڈنٹ، دو چار ہی ملے ہیں۔ ذہانت تو چلو خداداد صلاحیت ہے لیکن اتنی چھوٹی عمر میں اتنی میچور سوچیں۔ ایسی سلجھی ہوئی شخصیت۔"

انہوں نے اپنی چہیتی شاگرد کی شان میں ایک اور قصیدہ پڑھا تھا۔ استاد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر تابین کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں اور یہ جھلملاہٹ عطیب کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی۔ اسے بخوبی یاد تھا کہ سہاگ رات، تم جیسی لڑکی۔۔۔ کے الفاظ سن کر تابین کیسا تڑپ اٹھی تھی لیکن وہ پہلی اور آخری بار تھا جب وہ اپنی ذات کے دفاع میں کچھ بولی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے وجود نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی۔ اس نے عطیب کی زندگی اور اس کے گھر میں اپنی حیثیت کے تعین کے بعد کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی تھی۔

آج ایک معتبر ہستی کے لبوں سے اپنی تعریف سن کر اس کی آنکھوں کا ڈبڈبا جانا فطری امر تھا، یہ اور بات کہ عطیب ان جھلملاتی آنکھوں سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کشف چند دن کی چھٹیوں پر گھر آئی تو گھر میں کسی قدر ہلچل اور رونق کا احساس جاگا۔ وہ تابین کو بھی اس کے کمرے تک محدود نہ رہنے دیتی۔ کھانے کے وقت بھی اسے آوازیں دے کر کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی۔ شام کی چائے کی بعد لاؤنج میں جو محفل جمتی وہ تب بھی تابین کو زبردستی گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے آتی۔ تابین کو فائقہ بیگم کی سرد مہر نگاہوں کا سامنا کرنا آسان نہ لگتا تھا اور اگر آئمہ آئی ہوتی تو اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں بھی تابین کا اعتماد ڈانوا ڈول کر دیتیں۔

تمہارے لیے یہ کہنا آسان ہے کشف! کبھی خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو۔ میری ذات کا وقار، انا، بھرم سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا ہے۔ اپنی بہن کے کیے کی سزا مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ میں فرزین آپی سے علیحدہ شخصیت کی مالک ہوں، لیکن اس گھر میں شاید ہمیشہ مجھے اسی تناظر میں دیکھا جائے گا۔" وہ آزردگی سے بولی تھی۔

"اچھا آئیں میرے ساتھ۔ آج لنچ ہم دونوں مل کر تیار کرتے ہیں۔ عطیب بھائی کو ویجیٹیبل رائس بہت پسند ہیں اور سبزیوں کی کٹنگ سے میری جان جاتی ہے۔ آپ آ کر میری ہیلپ کروائیں۔"

کشف نے اس کا دھیان بٹانا چاہا اور اس کے ساتھ کچن میں کام کرواتے ہوئے تابین کا جی واقعی بہل گیا تھا۔ کشف کے پاس سنانے کو بہت سے قصے

تھے۔اپنے کالج کی باتیں، ہاسٹل لائف کے قصے اور جانے کیسے اس کی باتیں سنتے ہوئے تابین کی انگلی پر گہرا کٹ لگ گیا تھا۔

"اوگاڈ! اتنا گہرا کٹ۔" چھری کافی تیز تھی۔ تابین سے زیادہ کشف اس کی زخمی انگلی کو دیکھ کر بوکھلائی تھی۔

"ایک منٹ تابین بھابھی، میں فرسٹ ایڈ باکس لے آؤں آپ کی بینڈ یج کرتی ہوں۔" وہ فوراً کچن سے نکلی تھی۔ تابین شرمندہ سی ہوگئی تھی۔ سبزیوں کی کٹنگ کوئی اتنا مشکل کام تو نہ تھا جو وہ یہ کارنامہ سرانجام دے بیٹھی تھی

ذرا سی دیر میں کشف نے بینڈ یج کردی تھی لیکن کھانے کی میز پر پٹی بندھی انگلی موضوع گفتگو بن گئی تھی۔ استفسار رضوان صاحب نے کیا تھا، جواب بھی اس کے بجائے کشف نے ہی دیا۔

"اپنی بھاوج کے پھوہڑاپے کا عالم ملاحظہ کرلیا تم نے آئمہ! پھر مجھے مشورہ دیتی ہو کہ میں سارا دن گھر کے کاموں میں کھپتی ہوں۔ بہو بیگم سے بھی کام کروایا کروں۔ پہلے دن کچن میں جانے پر انگلی کٹوالی۔ کوئی اور ذمہ داری ان کے سر ڈالی تو اللہ جانے کیا کارنامہ سرانجام دیں گی۔" فائقہ طنزیہ انداز میں آئمہ سے مخاطب تھیں۔

رضوان صاحب نے ناگواری سے بیگم کو دیکھا لیکن ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کشف، تابین کی حمایت میں بول پڑی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے امی! تابین بھابھی میری ہی ایج فیلو ہیں۔ اور مجھے گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے۔ یہ آپ سب بھی جانتے ہیں۔"

"تم ڈاکٹر بن رہی ہو کشف! گھریلو کام کاج میں طاق نہیں ہو تو اس میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔ خالی خولی بی اے بی ایس کرنے والی لڑکیاں پھوہڑپن دکھائیں گی تو باتیں تو سننے کو ملیں گی نا۔" آئمہ بھی بولے بنا نہ رہ پائی تھی۔

کشف کو افسوس ہوا کہ وہ کیوں تابین کو اس کے کمرے سے باہر نکال لائی شاید اس کی حجرہ نشینی ہی درست فیصلہ تھی۔

رضوان صاحب بیوی اور بیٹی پر تاسف بھری نگاہ ڈال کر اٹھ گئے تھے۔ عطیب خاموش تماشائی تھا لیکن اپنے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی تابین کے جھکے سر کو دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس وقت کچھ کھا نہیں رہی بلکہ صرف آنسو پی رہی ہے۔ عطیب کی بھوک بھی جیسے یکدم مرگئی لیکن باپ کی تقلید میں وہ ٹیبل سے اٹھ کر نہ جاسکتا تھا۔ اپنی پسندیدہ ڈش کھانے لگا۔ تابین بھی جلد ہی اٹھ گئی تھی۔

"نخرے دیکھو محترمہ کے، دو فقرے کیا سننے کو مل گئے۔ کھانا ہی ادھورا چھوڑ دیا۔ ہمیں اس کے خاندان کی وجہ سے آج تک کتنی باتیں سننے کو مل رہی ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں۔" آئمہ نے نخوت بھرے انداز میں تبصرہ کیا تھا۔

"بس کریں آئمہ آپی! پتا ہے اس وقت آپ کیسی نند بن رہی ہیں، بالکل اپنے فیورٹ ڈرامے والی ظالم نند، جس ڈرامے کو دیکھ کر آپ بھاوج کی مظلومیت پر آہیں بھرتی ہیں۔" آئمہ نے بڑی بہن کا لحاظ کیے بنا جتا دیا تھا۔ عطیب جانتا تھا اب آئمہ بھی کشف پر خفگی کا اظہار کرے گی۔

"کشف! کھانا کھا کر مجھے اسٹڈی میں چائے دے جانا۔" وہ اکتا کر اٹھ ہی گیا۔ آئمہ اور کشف خاموش ہوگئی تھیں۔

"ٹھیک ہے بھائی میں ابھی بنالاتی ہوں۔" ماں اور بہن پر جتائی ہوئی خفگی بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے اس نے عطیب کو جواب دیا۔ بیٹے کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر فائقہ دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

رضوان صاحب نے اچانک ہی عمرے پر جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ ضابطے کی ساری کارروائیاں پوری کرنے کے بعد ہی انہوں نے فائقہ کو پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔

''تیاری کرلیں فائقہ بیگم! اس مہینے کی پندرہ کو ہماری جدہ کے لیے فلائٹ ہے۔'' انہوں نے بیوی کو سرپرائز دیا۔ وہ یہ خوش خبری سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ تین برس قبل دونوں میاں بیوی کو حج کی سعادت نصیب ہوگئی تھی۔

''اچانک اس پروگرام کی وجہ؟'' فائقہ نے شوہر کا چہرہ جانچا۔

''وجہ وہی ہے جو آپ سمجھ چکی ہیں۔ عطیب اور تابین کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقعہ ملنا چاہیے۔ ایسا ہونا آپ کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ عطیب کے دل میں بیوی کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے بھی لگے تو آپ کی منفی باتیں سب کچھ ملیا میٹ کردیتی ہیں۔ میرا بیٹا اس وقت بہت ذہنی اذیت میں مبتلا ہے میں اسے کسی بھی طرح کے فیصلے پر پہنچنے کے لیے یکسوئی فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ تابین کو اپنانے کے لیے سنجیدہ ہے تو اسے اس بچی کے تمام تر حقوق پورے کرنے ہوں گے اسے شریک حیات کا رتبہ دینا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ تابین کو اپنے نام سے جوڑے رکھے۔ اللہ اس بچی کو بہتر نعم البدل عطا کردے گا۔'' رضوان صاحب نے صاف گوئی سے بیوی کو جواب دیا تھا۔

''پتا نہیں آپ مجھے اتنا غلط کیوں سمجھ رہے ہیں رضوان میں عطیب کی ماں ہوں۔ اس کی پریشان شکل دیکھ کر میرا بھی جی کٹتا ہے اور میں اس سے کہہ چکی ہوں کہ وہ ہماری پروا کیے بغیر اپنے دل کی بات مان کر کسی فیصلے پر پہنچ جائے۔ مجھے اس کا فیصلہ قبول ہوگا۔'' فائقہ نے شوہر کے سامنے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

''چلیں اگر یہ بات ہے کہ آپ کا بیٹا ہی کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پارہا تو اللہ کے گھر جاکر گڑگڑا کر دعا مانگیں گے کہ ہمارے بچوں کی زندگیاں سکون سے ہم کنار ہوں اور ہمارا گھر بھی پوتے، پوتیوں کی چہکاروں سے گونجے۔''

رضوان صاحب نے اپنی بے ساختہ خواہش کا اظہار کیا تھا اور فائقہ بھی آمین کہے بغیر نہ رہ پائی تھیں۔

☆☆☆

عطیب کی جھنجلاہٹ کا عجب عالم تھا۔ ماں باپ کے جانے کے بعد یہ پہلی صبح تھی۔ وقت پر آنکھ ہی نہ کھلی اور آج آفس میں اہم ترین میٹنگ تھی۔ تابین رات کو ہی گیسٹ روم میں شفٹ ہوگئی تھی۔ ورنہ کمرے میں اس کی آہٹوں سے ہی عطیب کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

وہ سحر خیز لڑکی تھی، دبے پاؤں اپنے کام نمٹاتی پھر بھی اس کے جاگنے کے بعد عطیب بھی زیادہ دیر سو نہ پاتا اور آج وہ نہیں تھی تو اس کی آنکھ ہی نہ کھلی۔ جلدی جلدی نہا دھو کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو محترمہ لاؤنج میں بیٹھی اخبار کی ورق گردانی میں مصروف تھیں۔

''امی بائیس دن کے لیے گئی ہیں تو کیا بائیس دن مجھے بغیر ناشتے کے آفس جانا پڑے گا۔'' اسے تابین کی بے نیازی حد درجہ کھلی تھی۔ تابین نے ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کچن میں چلے جائیے۔ ٹیبل پر ناشتے کے سب لوازمات موجود ہیں۔ کوئی کمی بیشی ہو تو بتا دیجیے گا۔ کل آپ کے کہنے کے مطابق ناشتہ بنا دوں گی۔'' اس نے سپاٹ سے انداز میں عطیب کو جواب دیا تھا۔

وہ پل بھر کے لیے چپ سا ہوگیا پھر تیوریاں چڑھائے چڑھائے ہی کچن کا رخ کیا۔ ''پھوہڑ لڑکی'' کے ہاتھ کا بنا پہلا ناشتہ اسے حیران کر گیا تھا۔ اس کے من پسند لوازمات سے ٹیبل سجی ہوئی تھی، آفس سے دیر ہونے کے باوجود اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا۔ ناشتے کے بعد کچن سے نکلا تو محترمہ نظر نہ آئیں جانے گھر کے کس گوشے میں جا چھپی تھیں۔ ہاں جب وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتا پورچ کی طرف بڑھ رہا تھا تب وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"یہ آپ کا لنچ باکس ہیں نے ناشتے کی میز پر ہی رکھا تھا شاید آپ کی نظر نہیں پڑی۔" اس نے سیدھے، سپاٹ سے انداز میں عطیب کو مخاطب کیا۔ عطیب نے پہلے لنچ باکس کو دیکھا پھر اسے۔

"چکن سینڈوچ بنائے ہیں۔ اگر کل کچھ اور بنوانا ہو تو بتا دیجیے گا۔" وہ اس کی گہری نگاہوں سے قدرے خائف ہوئی تھی۔ عطیب بنا کوئی جواب دیے لنچ باکس اس کے ہاتھ سے لے کر آگے بڑھ گیا۔ بظاہر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے ہوئے وہ لڑکی اس کی پسند سے بھی آگاہ تھی اور معمولات سے بھی۔ تابین کی باخبری نے اسے حیران تو کیا تھا لیکن وہ دل میں سوچے بنا بھی نہ رہ پایا کیا وہ معدے کے راستے اس کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ دل میں جگہ بنانے کے لیے کچھ اندازِ دلبری بھی درکار ہوتے ہیں۔ تابین کے سرد و سپاٹ رویے نے اس کی خوش فہمی کا پل بھر میں ہی خاتمہ کر دیا تھا۔ سب باتوں سے قطع نظر اس کا اپنا دل آج کل عجب لے پر کیوں دھڑکنے لگا تھا۔ وجہ جاننے سے وہ خود بھی قاصر تھا۔

☆☆☆

رضوان صاحب نے جاتے سمے بیٹے کو قطعی انداز میں باور کروایا تھا کہ وہ ان بیس، بائیس دنوں میں اپنے اور تابین کے رشتے کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ جانے کیوں وہ اپنے دل میں جھانکنے سے جھجک رہا تھا۔

ماں اور بڑی بہن کی تابین کے لیے ناپسندیدگی نے بھی اسے عجیب دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔

آئمہ کے دل میں ابھی تک تابین کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا نہ ہوا تھا۔ ماں باپ کی غیر موجودگی میں اس نے یہاں آنا ہی ترک کر دیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک صبح وہ واش روم میں سلپ ہو گئی۔ کلائی کی ہڈی میں فریکچر آ گیا۔ مدثر کو آفس کے کام سے دوسرے شہر جانا تھا۔ اس حالت میں بیوی کو اکیلے چھوڑ کر جانے کو جی نہ مانتا تھا اور آئمہ میکے جانے سے انکاری تھی۔ مدثر نے مجبوراً عطیب سے مدد مانگی۔ عطیب فوراً وہاں پہنچا تھا۔

"کمال کرتی ہیں آپی، اتنی بڑی چوٹ لگا بیٹھی ہیں اور مجھے بتانا تک گوارا نہ کیا۔" وہ سخت خفا تھا۔

"ابو کی تاکید تھی میرے بھائی کہ کچھ دنوں تک عطیب اور تابین کو ڈسٹرب نہیں کرنا۔ میں نے بس اسی لیے گھر کا چکر تک نہ لگایا۔"

آئمہ نے اس سے زیادہ خفگی بھرے انداز میں جتایا۔ بہنوئی کے سامنے اس ذکر پر عطیب کچھ خفیف سا ہو گیا۔

"اچھا چھوڑیں یہ بات۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ مدثر بھائی کے جانے کے بعد یہاں اکیلی کیسے رہیں گی۔" اس نے بہن کو مخاطب کیا۔

"رہ لوں گی۔ میری فکر نہ کرو۔" وہ نروٹھے انداز میں بولی۔

"اگر تم عطیب کی بات نہیں مان رہیں تو ٹھیک ہے میں باس کو تمہاری بیماری کا بتا کر جانے سے انکار کر دیتا ہوں۔" مدثر اسی فیصلے پر پہنچا تھا۔ طوعاً و کرہاً ہی سہی آئمہ چند دن کے لیے میکے جا کر رہنے پر راضی ہو گئی۔

عطیب جانتا تھا کہ وہ تابین کا کسی قسم کا احسان لینا گوارا نہ کرے گی۔ اس لیے اس نے ملازمہ کو خاص ہدایت دی تھی کہ وہ آئمہ کا ہر طرح خیال رکھے۔ جز وقتی ملازمہ نے فوراً فرماں برداری سے سر ہلا دیا تھا لیکن اس کی تیمارداری کی ذمہ داری تابین نے ہی اٹھائی تھی۔ بنا ماتھے پر بل ڈالے وہ گھر کے کاموں کے ساتھ آئمہ اور بچوں کا خیال رکھ رہی تھی۔ ہنستے مسکراتے بچوں کے فرمائشی پکوان پکاتی۔ بچوں نے ہوم ورک بھی تابین مامی سے ہی کروانا تھا۔ بچوں کے ساتھ وہ بہت گھل مل گئی تھی ہاں آئمہ کا سامنا بہت جھجکتے ہوئے کرتی تھی۔ آئمہ یہ خود خاموشی سے اس کے روز و شب نوٹ کر رہی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

وہ لڑکی جو پہلے اپنے کمرے تک محدود رہتی تھی اب پوری جانفشانی سے گھر کی ذمہ داریاں نبھا رہی تھی لیکن اس کے انداز سے مالکانہ پن کا احساس اب بھی نہ جھلکتا تھا۔ بنا جتائے۔ بہت خاموشی سے وہ کام نمٹاتی رہتی۔ کام بہت نفاست اور سلیقے سے کرتی۔ ہاتھ میں ذائقہ بھی تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ آئمہ کا اس کے بارے میں تاثر بدلتا جا رہا تھا۔ پھر ایک دن اس نے کشف کے ساتھ اس کی ٹیلی فونک گفتگو سن لی۔

''یقین رکھیں تابین بھابھی آپ بہت جلد اس گھر میں بھی اپنی جگہ بنالیں گی اور اس گھر کے مکینوں کے دلوں میں بھی، آپ کا خلوص اور خدمت گزاری رائیگاں نہیں جائے گی۔''

''سچ تو یہ ہے کشف! میں یہ سب اس گھر یا گھر کے مکینوں کے دل میں جگہ بنانے کے لیے نہیں کررہی۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنی ماں کی تربیت کا مان رکھ لوں۔ فرزین آپی کے عمل نے ہماری فیملی کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے عمل کو میرے کھاتے میں نہ ڈالا جائے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں بلکہ اپنے والدین کی اچھی بیٹی ہوں۔'' تابین کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی بات سن کر آئمہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''کیا واقعی ہم نے اس لڑکی کے ساتھ بلاوجہ کٹھور رویہ اپنایا۔ کسی اور کے کیے کی سزا اسے دینا کہاں کا انصاف ہے۔'' وہ بات جو کشف اتنے عرصے سے اسے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی مگر سمجھ میں آکر نہ دے رہی تھی۔ اب اپنے دل سے یہ ہی صدا ابھری تو عجیب سی شرمندگی نے وجود کا احاطہ کرلیا۔

تابین سے فوری طور پر بے تکلفانہ اور محبت بھرے روابط استوار کرنا تو ممکن نہ تھا اب تابین کا سامنا ہونے پر وہ اس کی جانب طنزیہ اور سرد مہر نگاہوں سے نہ دیکھتی تھی بلکہ ایک نرم سے مسکراہٹ اس کی جانب اچھال دیتی۔ ہاں تنہائی میں عطیب کے سامنے یہ ضرور تسلیم کیا تھا کہ تابین حقیقتاً اچھی لڑکی ہے اور اب عطیب کو اپنی زندگی میں اس کا جائز مقام دینا چاہیے۔ عطیب بہن کی کایا پلٹ پر ذرا بھی حیران نہ ہوا۔ اس کے اپنے دل کی کایا بھی تو پلٹ چکی تھی۔

اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ دل کا بدلا ہوا فسانہ دل کی مکین کو کیسے سنایا جائے۔ وہ اپنے سارے فرائض تو بخوبی نمٹارہی تھی لیکن عطیب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی روادار نہ تھی۔

مدثر کی واپسی پر آئمہ بھی گھر چلی گئی۔ بیشا اور ریان کی وجہ سے تابین کا خوب جی لگا ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بری طرح اداس ہوگئی۔ رضوان صاحب اور فائقہ کی واپسی میں چند روز باقی تھے۔ عطیب اب بھی اس سے دور تھا۔

آج وہ آفس سے لوٹا تو تابین بیگ تیار کیے اس کی منتظر تھی۔

''اسامہ مجھے لینے آرہا ہے میں اپنے گھر جارہی ہوں۔'' اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیتے ہوئے بتایا تھا۔ اس کی بات اتنی غیر متوقع تھی کہ عطیب چند لمحوں کے لیے کچھ بول نہ پایا۔ تابین نے — نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''زبردستی کے بندھن پائیدار نہیں ہوتے۔ میری آپ سے شادی کی فقط ایک ہی وجہ تھی۔ میرے والدین نے اپنی دانست میں آپ لوگوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ازالے کی کوشش کی تھی۔ فرزین آپی نے ہم سب کے ساتھ بہت برا کیا لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد دونوں خاندانوں کا پھر سے رشتہ جوڑ لینا دانش مندانہ فیصلہ نہیں تھا اگر آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو کسی حد تک ناانصافی میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ مجھے ایسی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے جو مجھ سے سرزد بھی نہ ہوئی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم زبردستی کے باندھے گئے اس بندھن پر نظر ثانی کرلیں۔'' وہ نظریں جھکائے ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"تو تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں؟"
عطیب نے لب بھینچ کر سنجیدگی سے استفسار کیا۔
"میں اس احساس کے ساتھ یہاں نہیں رہنا چاہتی کہ میں آپ پر زبردستی مسلط کی گئی ہوں۔ میں محبت کی طلب گار نہیں ہوں لیکن سر اٹھا کر جینا چاہتی ہوں۔ ذلت کے احساس سے میرا یہاں پر دم گھٹتا ہے۔" ضبط کرتے کرتے بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ تب ہی دروازے پر گھنٹی بجی تھی۔

"اسامہ آگیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے الوداعی نگاہ عطیب پر ڈالی۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔

"کل آنٹی، انکل لوٹ رہے ہیں۔ میں نے دو دن کا کھانا بنا کر فریز کر دیا ہے۔ آپ کے سب کپڑے بھی پریس ہیں۔ پروین کل صبح سویرے ہی آجائے گی تاکہ آپ کے آفس جانے سے پہلے چھوٹے موٹے کام نمٹا دے، اور میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔"

"اٹس او کے۔ جب تم جا رہی ہو تو یہ سب تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔" عطیب نے سپاٹ انداز میں اس کی بات کاٹی۔ وہ لب کچلتی، آنسو پیتی فقط سر ہلا کر رہ گئی۔ عطیب نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیا تھا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ تابین اس کٹھور بندے کی پشت پر شاکی نگاہ ڈالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔ اسامہ باہر گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔ عطیب نے اس سے مصافحہ کر کے اسے بیگ تھمایا تھا پھر واپس مڑ گیا۔ تابین بھی آنکھیں پونچھتی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ آگے قسمت میں کیا لکھا تھا وہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

جس گھر میں قدم رکھتے وقت تابین کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھی آئمہ اور فائقہ کی آنکھوں سے چھلکتی بے زاری اسے شدید ترین خفت میں مبتلا کر دیتی۔ پھر عطیب تھا جو قسمت کے ہیر پھیر سے اس کے مجازی خدا کے رتبے پر فائز ہو چکا تھا۔ سہاگ رات ہی اس نے واشگاف الفاظ میں تابین کو اس کی اوقات بتا دی تھی۔

وہ اس وقت تو اپنے لیے ہتک آمیز الفاظ سن کر تڑپ اٹھی تھی لیکن پھر احساس ہو گیا کہ احتجاج بے معنی ہے۔ وہ صبر کی چادر اوڑھ کر سمجھوتے کی راہ پر چل پڑی تھی۔

مستقبل غیر واضح تھا۔ غالب امکان یہ ہی تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد عطیب زبردستی کے اس بندھن سے خود بھی جان چھڑانے لگا اور اسے بھی آزادی کا پروانہ مل جائے گا لیکن جانے کیوں متوقع آزادی کا احساس بھی اس کے اندر کوئی جوت نہ جگاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے اپنے دلی جذبے اس پر آشکار ہوئے تو وہ ششدر رہ گئی۔ تیکھے اور مغرور نقوش والا شخص تو جانے کب اور کیسے دل کا مکین بن بیٹھا تھا۔ اس سے تعلق ٹوٹنے کا سوچ کر ہی دل میں سناٹا پھیل جاتا۔

وہ صرف اللہ کے حضور فریاد کر سکتی تھی کہ جس شخص سے اس کا نام جڑ چکا ہے اس کے دل میں جگہ بھی بن جائے۔ فی الحال تو اس نے اجنبیت اور گریز کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ کشف اس سے مسلسل ٹیلی فونک رابطے میں تھی وہ اس کی ہمت بھی بندھاتی اور اچھے دنوں کی آس بھی دلواتی۔

"آپ کوشش کرتی رہیں۔ ایک دن آپ خود کو منوانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔" کشف نے اسے تسلی دی۔ پھر فائقہ آنٹی اور رضوان انکل عمرے پر چلے گئے۔ اس نے بخوشی گھر کی ذمہ داریاں نبھانا شروع کر دی تھیں ہاں اپنی ذات کا وقار اور بھرم اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عطیب کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر اس کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ پورے وقار کے ساتھ اس کی زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی اور یہ ہی سوچ کشف کی بھی تھی۔ انکل، آنٹی کی واپسی سے تین دن پہلے

"مبارک ہو بھابھی جان۔ میرے بھیا لائن پر آ ہی گئے ہیں۔ بس وہ یہ سوچ رہے ہیں آپ کو کیسے منائیں۔" کشف نے ہنستے ہوئے آگاہ کیا۔

"منانے کا کیا سوال، میں ناراض کب ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں ناراض نہیں ہیں۔ ہماری اور آپ کی فیملی کے ساتھ جو ہوا، اس کی سب سے زیادہ متاثر فریق آپ ہی ہیں۔ یا تو بھائی کو اس شادی پر راضی ہی نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر راضی ہو گئے تھے تو پھر دل سے اس رشتے کو قبول کر کے نباہ لینا چاہیے تھا۔ آخر وہ آپ کی خوبیوں کے دل سے معترف ہو گئے ہیں۔

آپ کو اپنانا چاہتے ہیں تو انہیں آپ کو مان، عزت اور مرتبے کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوگا۔" کشف ٹھوس لہجے میں مخاطب تھی۔ تابین کی آنکھیں اس کی محبت پر بھیگ گئیں۔

کشف سچ کہتی تھی اسے صرف عطیب کی زندگی میں شامل نہیں ہونا تھا بلکہ پوری عزت اور وقار کے ساتھ اس کی زندگی اور اس کے گھر کا حصہ بننا تھا۔ اس کی واپسی کا سن کر عطیب کی آنکھوں میں بے یقینی سی ابھری تھی۔ تابین کا جی چاہا کہ وہ اسی پل اپنا حق جتا کر اسے روک لے لیکن وہ تو خود اسامہ کو اس کا بیگ تھما آیا تھا۔ اسے اپنی انا عزیز تھی تو وہ خود کیسے اظہار کرتی۔

گھر پہنچ کر اس نے ماں، باپ کو تسلی دی تھی کہ وہ صرف چند دن گزارنے آئی ہے اور عطیب اسے خود لینے آئے گا۔ خدیجہ بیٹی کو گلے لگا کر سسک پڑی تھیں۔

"ہم نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تابین لیکن اب تم پر کوئی زور زبردستی نہیں۔ اپنی زندگی کے متعلق فیصلہ کرنے کا تمہیں پورا اختیار ہے اگر تم واپس نہیں جانا چاہتیں تو میں اور تمہارے ابو تمہارے فیصلے پر تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

انہوں نے نم آنکھوں سے بیٹی کو یقین دلایا۔

"میں واپس جانا چاہتی ہوں امی۔ دعا کریں میرا گمان درست ثابت ہو۔ عطیب مجھے لینے آجائیں۔" وہ ماں سے دل کا حال نہ چھپا پائی تھی۔

خدیجہ نے اسے دوبارہ سینے سے لگا لیا تھا اور آج اسے گھر آئے ہوئے پورے بارہ روز گزر چکے تھے۔

عطیب یا اس کے گھر والوں کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ کشف نے بھی پلٹ کر فون نہ کیا تھا اور خود سے رابطہ کر کے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پوچھنا اسے گوارا نہ تھا۔ اب جب وہ کشتیاں جلا کر آ ہی گئی تھی تو اسے صبر اور حوصلے سے کام لینا تھا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ حوصلہ دم توڑتا جا رہا تھا۔

وہ عطیب کی آنکھوں میں اپنے نام کا عکس دیکھ چکی تھی لیکن اس نے عطیب کی ماں کے بارے میں کیوں نہ سوچا۔ ماں کی رضامندی کے بغیر وہ اسے کیوں کر اپنا سکتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کیوں اتنی خوش فہم ہو گئی تھی، اب تو اسے کشف پر بھی غصہ آتا۔ کاش اس کا مشورہ نہ مانا ہوتا۔ فائقہ آنٹی نے کون سا اسے گھر سے نکال دینا تھا۔ وہ خدمت اور اطاعت گزاری سے ان کے دل میں بھی جگہ بنا ہی لیتی۔ اپنے غلط فیصلے پر رہ رہ کر قلق ہوتا تھا۔

اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا اس کی ذات ہی بگڑے کام سنوار سکتی تھی۔ اس روز بھی وہ نماز کے بعد دیر تک اللہ کے حضور گڑگڑاتی رہی۔ اتنے میں اسامہ نے اندر جھانکا تھا۔

"آپی! نماز پڑھ کر فارغ ہو گئی ہیں تو چائے بنا لیں۔ باقی سامان میں بازار سے لے آتا ہوں۔"

"کوئی آیا ہے کیا؟" اس نے جائے نماز تہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"عطیب بھائی ہیں۔ ساتھ آپ کے ساس سسر ہیں۔

چکن رول اور فروٹ کیک کے ساتھ تیسرا آئٹم کیا ہونا چاہیے۔"

اسامہ کا ذہن خاطر مدارت میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے جیسے اسامہ کا سوال سنا ہی نہیں۔ بے یقینی سے کمرے سے باہر نکلی۔ ڈرائنگ روم کے باہر جا کر قدم تھم سے گئے، اندر سے رضوان انکل کی آواز آ رہی تھی۔ وہ معذرت کا اظہار کرتے ہوئے تابین کو ساتھ لے جانے کی بات کر رہے تھے پھر ان ہی کی بات کو فائقہ آنٹی نے آگے بڑھایا تھا۔

"رضوان صحیح کہہ رہے ہیں خدیجہ بہن! جو ہوا اسے ماضی کا حصہ سمجھ کر بھول جائیں۔ اب ہم تابین

بیٹی کو لینے آئے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اسے گھر میں وہ ہی عزت اور مرتبہ ملے گا جس کی وہ حق دار ہے۔ ہماری اکلوتی بہو جو ٹھہری۔" اسی لمحے ان کی نگاہ تابین پر پڑی تھی۔

"آؤ بیٹا باہر کیوں کھڑی ہو۔ اندر آؤ نا۔" فائقہ بیگم نے اسے محبت سے پکارا۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ میکانکی انداز میں قدم بڑھادیے تھے۔ اسی کھوئے، کھوئے انداز میں ساس، سسر کو سلام کیا تھا۔ فائقہ نے اسے ساتھ لپٹا کر پیار کیا تھا رضوان صاحب نے بھی سر پر ہاتھ پھیر کر دعاؤں سے نوازا تھا۔ سامنے عطیب بیٹھا تھا جو خاموش مگر بہت فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تابین بیٹا! تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" خدیجہ کو آداب میزبانی نبھانے کا خیال آیا۔

"چائے ادھار رہی خدیجہ بھابھی! چائے بھی اور کھانا بھی۔ فی الحال تو ہم اپنی بہو کو لینے آئے ہیں اور آپ لوگوں کو مدعو کرنے آج گھر پر سب رشتہ داروں کو کھانے پر بلایا ہے۔ عمرے کے بعد سے لوگ مبارکباد دینے آرہے تھے۔ ہم نے سوچا ایک بار سب کو اکٹھے ہی کھانے پر مدعو کرلیا جائے۔" رضوان صاحب نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"اچھی بات ہے رضوان بھائی۔ آپ اپنی دعوت نمٹائیں۔ ہم ان شاء اللہ پھر کسی دن چکر لگائیں گے۔ یوں سمجھیں، آپ کی طرف کا کھانا بھی ادھار رہا۔" برہان صاحب نے مسکرا کر سمدھی کو مخاطب کیا۔

"پھر اجازت ہم تابین کو لے جائیں۔" فائقہ پوچھ رہی تھیں۔ شکر گزاری کے احساس سے خدیجہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تابین پر ہم سے زیادہ آپ کا حق ہے۔" وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ فائقہ نے سمدھن کو گلے لگالیا تھا۔

☆☆☆

یہ واپسی کا سفر تھا۔ عطیب ڈرائیو کررہا تھا۔ تابین پچھلی نشست پر ساس کے ہمراہ بیٹھی تھی تب فرنٹ سیٹ پر بیٹھے رضوان صاحب نے مسکرا کر بیوی کو مخاطب کیا۔

"آپ کے صاحبزادے کا بھی جواب نہیں بیگم صاحبہ، معذرت کرنا اس کا بنتا تھا اور یہ وہاں پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔" باپ کی بات سن کر عطیب بھی مسکرایا۔

"صرف معذرت کرنے سے کام نہیں بنتا تھا ابو۔ ابھی اصل مرحلہ تو منانے کا درپیش ہے۔ اب سسرال میں بیٹھ کر روٹھی بیوی کو منایا تو نہیں جاسکتا تھا نا۔"

"ٹھیک ہے برخودار! اور تابین بیٹی تمہیں پوری آزادی ہے گھر جاکر عطیب کے جیسے مرضی کان کھینچنا۔ ہم میں سے کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔" رضوان صاحب نے اب تابین کو مخاطب کیا تھا۔ حیران، پریشان تابین سسر کی بات سن کر سٹپٹا ہی تو گئی تھی۔

"آپ باپ، بیٹا مل کر میری بہو کو پریشان نہ کریں۔" فائقہ نے دونوں کو تنبیہ کی تھی۔ تابین سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن فائقہ اس کی حیرت بھانپ چکی تھیں۔ وہ یقیناً ساس کی کایا پلٹ پر بھی حیران تھی۔

فائقہ کو حیران شکل والی بہو پر پیار آیا۔ وہ اسے کیسے بتاتیں کہ یہ کایا پلٹ ایک دن میں نہیں ہوئی۔ دل اور دماغ کی کشمکش میں تو وہ اول روز سے ہی مبتلا تھیں۔ عطیب نے تابین کو قبول نہیں کیا تھا۔ اکلوتے بیٹے کی بے رونق زندگی کو دیکھ کر ان کا جی کڑھتا تھا۔ حالانکہ وقت گزرنے کے ساتھ انہیں احساس ہوگیا تھا کہ تابین اپنی بہن کے کیے کی ذمہ دار نہیں ہے لیکن اکلوتے بیٹے کی خوشیاں ملیامیٹ ہونے کے بعد وہ اپنے دل میں تابین کے لیے کوئی جگہ نہ پاتی تھیں۔ شوہر کے سمجھانے پر وقتی طور پر ضمیر ملامت کرتا لیکن تابین کو دیکھتے ہی اس وقتی ملامت پر بے زار اور چڑ کا جذبہ حاوی ہوجاتا پھر رضوان انہیں عمرے پر لے گئے۔

وہ مقدس سرزمین جہاں ایک عام مسلمان بھی رقیق القلبی کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی

ایک دن جب وہ حرم پاک کی حدود میں رو، روک کر اپنے رب کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھیں، تو شوہر نے خود کلامی کے سے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

''کتنی عجیب بات ہے انسان، کسی دوسرے انسان کا ناکردہ جرم بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا جب کہ اپنے خالق کے حضور دعا کرتا ہے کہ اس کے کردہ، ناکردہ سب، گناہ معاف کردیے جائیں۔''

شوہر کی بات سن کر وہ جی جان سے کانپ گئیں وہ اپنی غلطی کے ادراک کا لمحہ تھا۔ رضوان کس جانب اشارہ کررہے تھے فائقہ بخوبی سمجھ گئی تھیں۔ ایک بار پھر آنسوان کے گال بھگونے لگے۔

''شاید ہر ماں ہی اولاد کو دیوانہ وار چاہتی ہے رضوان صاحب لیکن عطیب میں میری جان ہے۔ شادی کے باوجود اسے شادی شدہ زندگی کی مسرت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ورنہ آپ جانتے ہیں میں بھی روایتی ساس نہیں بننا چاہتی تھی۔'' وہ بے بسی سے بولی تھیں۔

''اللہ کے حضور دعا کریں بیگم! کہ آپ کے بیٹے کے دل میں بھی اس بچی کے لیے گنجائش پیدا ہو۔ ان شاء اللہ اسے شادی شدہ زندگی کی سب مسرتیں حاصل ہوں گی۔ رضوان صاحب نے انہیں رسانیت سے سمجھایا تھا۔ انہوں نے آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا۔

وطن واپس پہنچنے پر اپنی دعاؤں کی قبولیت دیکھ کر وہ ششدرہ گئی تھیں۔

''ابو نے مجھ سے کہا تھا امی! کہ میں کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں۔ میں تو فیصلے پر پہنچ گیا لیکن آپ کی بہو میرے دل کی بات سنے بغیر اپنے گھر چلی گئی۔'' عطیب نے تنہائی میسر آتے ہی ماں کو منہ بسور کر آگاہ کیا۔ فائقہ نے حیران ہوکر سوالیہ نگاہیں بیٹے کے چہرے پر گاڑیں۔

''تابین بہت اچھی لڑکی ہے امی۔ میں خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے اس جیسی لڑکی کو میرے نصیب کا حصہ بنایا ہے۔ ہمارا ملاپ یوں ہی اتفاقیہ طور پر ہونا لکھا تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

وہ ہمیشہ کی طرح ماں سے دل کی بات نہ چھپا پایا تھا۔

''فکر نہ کرو میرے چاند! میں اپنی بہو کو خود جا کر لاؤں گی۔'' انہوں نے بیٹے کی پیشانی چوم کر اسے تسلی دی۔

آئمہ نے بھی بیتے دنوں کی روداد سنا کر ماں سے تابین کی خوب ہی تعریفیں کی تھیں اور ان کی کشف تو اپنے باوا کی طرح تھی ہی حق اور سچ کی علم بردار۔ وہ جلد از جلد تابین کو دوبارہ اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی تھیں اور آج فائقہ بھرپور مان سے اپنی بہو کو گھر لے جارہی تھیں۔

خاندان والوں کو دعوت پر مدعو کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سب لوگ عطیب اور تابین کی خوشگوار زندگی کی جھلک دیکھ لیں تاکہ بے بنیاد قیاس آرائیوں کا خاتمہ ممکن ہوسکے۔ تابین نے گھر میں قدم رکھا تو آئمہ، کشف اور پیشا، ریان نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ نئی نویلی دلہن کی طرح اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں کشف نے تو بھائی سے نیگ کا مطالبہ بھی کردیا۔

''اپنی بھابی کا چہرہ تو دیکھو۔ لگ رہا ہے دو دن سے منہ نہیں دھویا۔ اگر بجی سنوری بیوی کے ہمراہ گھر میں قدم رکھتا تو تم نیگ کا تقاضا کرتی اچھی لگتیں۔'' عطیب نے بہن کو ہری جھنڈی دکھائی۔

''اپنی بھابھی کو تو ہم آدھے، گھنٹے میں سجا، سنوار لیں گے تم تگڑا سا نیگ تیار رکھو۔'' آئمہ تابین کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ کشف بھی ہمراہ تھی۔

''وقت واقعی کم ہے۔ مہمان بس پہنچنے والے ہوں گے۔ میں نے تمہارا جوڑا پریس کروالیا تھا۔ تم فٹافٹ، چینج کرو، پھر کشف تمہیں تیار کردے گی۔ تمہیں علم ہی نہ ہوگا کہ مستقبل کی ڈاکٹر کتنی ماہر بیوٹیشن بھی ہے۔'' آئمہ نے اسے مسکرا کر بتایا تھا۔

"دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔" ان سب کی محبتیں دیکھ کر تابین کی آنکھیں بھیگتی جارہی تھیں۔

"بس اب ان آنسوؤں پر پہرا بٹھاؤ، اللہ تمہیں ہمیشہ ہنستا مسکراتا اور شاد آباد رکھے۔" آئمہ نے اسے گلے لگا کر دعا دی تھی۔

کشف! اپنا سارا ہنر آزماؤ۔ لیکن ذرا جلدی چندا! میں باہر کے انتظامات دیکھ لوں۔ آئمہ اسے کشف کے سپرد کر کے چلی گئی تھی۔ بہت خوبصورت اور اسٹائلش سا جوڑا۔ میچنگ، زیورات اور کشف کے ہنر مند ہاتھ، سنگھار مکمل ہونے کے بعد تو تابین بھی خود کو پہچان نہ پا رہی تھی۔

"یو آر لکنگ گارجیئس مادام"۔ کشف نے اسے بے ساختہ سراہا تھا۔

"یہ سب کچھ بہت ہیوی نہیں ہو گیا۔ کہیں میں سب کو کارٹون لگوں۔" تابین کو خدشہ ستایا تھا۔ کشف نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"اتنی محنت سے میک اپ کیا ہے۔ مانا آپ بہت حسین ہیں لیکن اس وقت حسین ترین لگ رہی ہیں۔ خوامخواہ میں کانشس مت ہوں اور آپ نے پورے اعتماد سے سب مہمانوں کو فیس کرنا ہے۔ پتہ ہے ہماری پھوپھو......"

کشف کی بات ادھوری رہ گئی تھی اسی وقت دستک دے کر عطیب اندر چلا آیا تھا۔ تابین پر نگاہ پڑنے کے ساتھ ہی وہ مبہوت رہ گیا۔ تابین نے بے ساختہ سر جھکا تھا۔

"اتنی دیر سے یہ میک اوور جاری ہے۔ مجھے بھی چینج کرنا ہے یار کسی کو پرواہ ہی نہیں کہ مجھے بھی کپڑے وغیرہ نکال کر دے۔ اتنے رف حلیے میں گھوم رہا ہوں۔"

"آپ کی پرواہ اب آپ کی بیگم کریں گی۔ ہمیں خود بھی تیار ہونا ہے۔" کشف نے بے نیازی سے جواب دیا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اسے کچھ خیال آیا۔

"تابین بھابھی کو خدشہ ستا رہا ہے کہ کہیں یہ کارٹون تو نہیں لگ رہیں ذرا ان کی تسلی کرا دیں۔" کشف شوخی سے کہتی کمرے سے چلی گئی تھی۔

عطیب مسکرا کر تابین کے قریب آیا۔

"کیوں خدشہ ستایا کہ تم کارٹون لگ رہی ہو؟" اس نے تابین کی جھکی ہوئی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"کیونکہ پہلے ایک بار آپ ہی مجھے کارٹون کریکٹر سے تشبیہ دے چکے ہیں۔" وہ جتائے بغیر نہ رہ پائی۔ عطیب گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا۔ وہ سہاگ رات کا حوالہ دے رہی تھی عطیب کو بخوبی یاد تھا۔

"چلو میری ایک خوش فہمی کا تو خاتمہ ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ میری بیوی دوسری عورتوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے میری ماضی کی غلطیوں کو نظر انداز کر دے گی اور مجھے معافی مانگنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی لیکن تمہارے تیور دیکھ کر تو لگ رہا ہے معافی مانگنے کے ساتھ کان بھی پکڑنے پڑیں گے، بتاؤ پہلے کیا کام کروں۔ معافی مانگوں یا کان پکڑوں۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا جبکہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"میں نے یہ کب کہا۔" تابین بے چاری سٹ پٹا ہی تو گئی۔

"تم نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں کہا لیکن میں آج سب کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" عطیب نے اس بار اسے والہانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ تابین نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس کی محبت لٹاتی نگاہوں کی تاب نہ لا کر گڑبڑا کر پھر سے نگاہیں جھکا لیں۔

"تم میری زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت ہو تابین! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ماضی میں جو ہوا اسے بھول کر تمہارے سنگ، ایک نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں توقع رکھوں کہ تم میری ماضی کی کوتاہیوں کو بھلا کر مجھے اچھا شوہر بن کر دکھانے کا ایک موقع دو گی۔" وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ تابین نے ہولے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اور کیا میں یہ بھی توقع رکھوں کہ اس اظہار محبت کے بعد مجھے تمہارے لبوں سے بھی محبت کا چھوٹا موٹا اعتراف سننے کو مل جائے گا'' وہ اس بار شرارتی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''میں تو جانے کب سے آپ کی محبت میں مبتلا ہوں۔ آپ کی تمام تر بے اعتنائی کے باوجود۔'' تابین کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کان پکڑ کے بنا بات بنے گی نہیں۔'' عطیب نے پھر گہرا سانس اندر کھینچا۔

''سوری عطیب!'' اس نے بوکھلا کر فوراً معذرت کی تھی وہ کھل کر ہنس پڑا۔

''آپ سے ایک بات اور کرنی ہے۔'' کچھ جھجکتے ہوئے اس نے عطیب کو مخاطب کیا۔

''مجھ سے کچھ کہنے کے لیے اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو'' وہ مسکرا کر بولا۔

''فرزین آپی اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہیں۔ انہوں نے محبت کی شادی تو کر لی لیکن ان کے سسرال والوں نے انہیں دل سے قبول نہیں کیا انہیں وہاں بہت ذلت آمیز زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ فرزین آپی بار بار امی، ابو سے رابطہ کر کے معافی مانگ رہی ہیں۔ اب تو امی، ابو کا دل بھی پسیج گیا ہے۔ لیکن صرف میرے بارے میں سوچ کر وہ فرزین آپی کو گھر تک آنے کی اجازت نہیں دے رہے۔''

تابین نے دھیرے سے بتایا تھا۔ اس ادھوری بات سے بھی عطیب اس کا مافی الضمیر سمجھ گیا تھا۔

تابین! تم میری زندگی کی ان مٹ سچائی ہو۔ مجھے تمہارے سوا کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ فرزین تمہاری بہن ہے۔ خون کے رشتے کبھی ختم نہیں کیے جاسکتے اور میں بھی ہرگز نہ چاہوں گا کہ میری وجہ سے تم اپنی بہن یا انکل آنٹی اپنی بیٹی سے تعلق توڑے رکھیں لہٰذا ہر طرح کی ٹینشن دل سے نکال دو۔ میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان اعتماد اور بھروسے کا رشتہ سب سے پہلے استوار ہو۔'' وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا تھا۔

تابین نے ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''آپ بہت اچھے ہیں عطیب''۔ وہ فقط یہ ہی کہہ پائی۔

''اچھا ہوں تب ہی تو اللہ نے مجھے دنیا میں ہی حوروں جیسی بیوی عطا کر دی۔'' اس نے تابین کو والہانہ نگاہوں سے دیکھا۔ حیا کی سرخی تابین کے گالوں پر بکھر گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ عطیب کی اجازت پاکر کشف نے مسکرا کر اندر جھانکا تھا۔

''ڈسٹرب کرنے کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن سب مہمان پہنچ چکے ہیں۔ تقطی پھوپھو تو کئی بار بھابھی کے متعلق پوچھ چکی ہیں۔ لائبہ کے ہونٹوں پر بھی حسب معمول طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ آپ بھابھی کے ہمراہ باہر تشریف لے آئیں۔ اسی صورت میں سب کی تشفی ہو سکتی ہے۔'' عطیب بہن کی بات سن کر مسکرایا پھر تابین کی طرف متوجہ ہوا۔

''چلیے بیگم صاحبہ!'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

''آپ پہلے فریش تو ہو جاتے۔'' تابین نے سٹ پٹا کر اسے یاد دلایا۔

''تمہیں دیکھ کر میں آل ریڈی فریش ہو چکا ہوں۔ جہاں تک میرے حلیے کا تعلق ہے تو آج مجھ پر کس کی نگاہ پڑے گی۔'' عطیب نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور ہاتھ پکڑے پکڑے ہی کمرے سے باہر لایا تھا۔

''میں نروس ہو رہی ہوں عطیب۔ پلیز ہاتھ تو چھوڑ دیں''۔ تابین منمنائی تھی۔ اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اب آئمہ آگے بڑھ کر خاندان والوں کا تابین سے تعارف کروا رہی تھی۔ فائقہ محبت سے بہو کو دیکھ رہی تھیں۔

ذرا سی وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنے سے زندگی کتنی پرسکون اور خوشگوار ہو گئی تھی۔

مہناز نعیم

بھیگی بلی

یہ ہیں میرے میاں جنہیں میں میاؤں سمجھتی ہوں کیونکہ میرے سسرال والے میرے میاں سے میری برائیاں کرتے ہیں اور میاں جی بجائے اس کے کہ گھر والوں کے سامنے میری حمایت میں بولیں، شیر کی طرح دھاڑ دھاڑ کر کھری کھری سنائیں۔ بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگتے ہیں۔

مجھے رمیز کی خاموشی پر شدید غصہ آتا ہے، میں اکثر ان سے کہتی ہوں۔

"شیر بنیے شیر...... جب آپ کے گھر والے میرے خلاف آپ کے کان بھرا کریں تو شیر کی طرح دھاڑ کر میرے حق میں بولا کیجیے تاکہ وہ لوگ آئندہ میری جھوٹی برائیاں نہ کریں۔"

"وہ عائشہ! بات یہ ہے کہ......" میرے سامنے بھی بھیگی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کر کے صفائی دینے لگتے ہیں اور میں مزید بے زار ہو جاتی ہیں۔

میرے سسرال والوں کو جانے مجھ سے کیا بیر ہے، مجال ہے جو کبھی میرا کوئی کام پسند آیا ہو۔

اس روز میری چھوٹی نند چولہے پر سالن رکھ کر کچن سے غائب ہو چکی تھی، میں نے سوچا کہ سالن جل نہ جائے جا کر ہانڈی میں چمچہ چلا دیا پھر سوچا نمک مرچ چیک کر لوں، سالن چکھا تو ہانڈی میں نہ نمک نہ مرچ، پھیکا سالن۔

"بے چاری نند کو ایسا برا سالن بنانے پر ڈانٹ نہ پڑ جائے۔" میں نے تو اچھا ہی سوچا تھا، تھوڑا سا نمک اور تھوڑی سی لال مرچ سالن میں ڈال دیں، لو بھلا کیا برا کیا میں نے، لیکن بھئی سچ بات ہے بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا، میری نند نے رمیز سے شکایت لگا دی۔

"بھائی جان! ابو کے لیے پرہیزی کھانا پکا رہی تھی میں، بھابھی نے سالن میں بھر کر نمک مرچ ڈال دیں۔ اتنی ڈانٹ پڑی مجھے ابو سے۔"

نند آنکھوں میں آنسو بھر کے معصوم بن کر رمیز کو میرے خلاف ورغلانے لگی، رمیز بہن کے آنسو صاف کرنے لگے اور حسب توقع بھیگی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے وضاحتیں دینے لگے۔

اونہہ...... بھلا میرا کیا قصور، اس سے پہلے تو کبھی گھر میں پرہیزی کھانا پکا نہیں۔ اب مجھے الہام ہوا تھا کیا کہ آج سسر جی کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، اس لیے نمک مرچ چھٹی پر ہیں۔ ہر وقت غصہ ناک پر رکھا رہے گا تو بلڈ پریشر تو بڑھے گا ناں، اتنی سی بات پر شکایت لگا دی میری اور شاباش ہے میرے میاں کو، مجال ہے جو بہن کو کچھ کہہ دیں، کم از کم اتنا ہی کہہ سکتے تھے کہ......

"تمہیں عائشہ کو بتا کر جانا چاہیے تھا کہ ابو کے لیے پرہیزی کھانا پک رہا ہے، اس بے چاری کو کیا پتا تھا۔ اس نے تو نیکی ہی کی اور تم اس ہی کی برائی کر رہی ہو۔ خبردار جو آئندہ میری بیوی کے خلاف ایک لفظ بھی بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

اگر رمیز اتنا بول سکتے تو بھلا میں انہیں بھیگی بلی کہتی؟ جی نہیں، شیر کہتی شیر۔ بہرحال اتنا تو میں نے بھی رمیز سے کہہ ہی دیا۔

"سن کر آ گئے میری برائیاں، مجال ہے جو بہن کو کبھی ڈانٹ سکیں، کتنے بزدل ہیں آپ، شیر بنیے شیر۔"

☆❁☆

ساس صاحبہ ملازمہ سے گھر کے پچھلے حصے میں کپڑے دھلوا رہی تھیں، میں نے سوچا چلو جا کر ساس صاحبہ کی مدد کر دیتی ہوں۔

پیچھے آئی تو دیکھا کہ نہ ساسو ماں تھیں اور نہ ہی ملازمہ۔ واشنگ مشین البتہ چل رہی تھی، واشنگ مشین کا ڈھکن ہٹا کر دیکھا تو ساسو ماں کا سوٹ دھل رہا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر واشنگ پاؤڈر تھا مشین میں اور صرف ایک سوٹ۔

"اونہہ بجلی کا نقصان۔" میں نے اردگرد نظر دوڑائی، تمام کپڑے دھل چکے تھے، صرف ایک بڑی چادر بغیر دھلی رکھی تھی۔ میں نے وہ چادر اٹھا کر واشنگ مشین میں ڈال دی تاکہ یہ چادر بھی ساتھ ہی دھل جائے۔ اب اس میں، میں نے کیا غلطی کی مگر شام کو میری ساس نے رمیز سے میری شکایت کر دی۔

"رمیز! عائشہ کام تو کچھ کرتی نہیں ہے اور ہم لوگوں کے کیے ہوئے کام بھی خراب کر دیتی ہے۔ مشین میں میرا سفید کلر کا نیا سوٹ دھل رہا تھا اس نے مشین میں کچے رنگ کی چادر ڈال دی۔ میرے سوٹ پر چادر کا میرون کلر چڑھ گیا، میرا نیا سوٹ بے کار ہو گیا۔"

ساس صاحبہ بہت شدید غصے کے ساتھ میاں

جی کے کان میرے خلاف بھر رہی تھیں اور رمیز
حسب معمول اور حسب توقع وضاحتیں دے کر، امی
کو دو نئے جوڑے دلوانے کا وعدہ کر رہے تھے۔
"اونہہ بھلا میرا کیا قصور...... میں تو ساس
صاحبہ کی کام میں مدد کرنا چاہتی تھی مگر سچ بات ہے،
بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ میری تو کسی کو رتی برابر
بھی قدر نہیں ہے۔" میں نے رمیز سے کہا۔
"کر آئے اپنی ماں سے دو سوٹ دلوانے کا
وعدہ، ذرا ہمت نہیں آپ میں، شیر بنیے شیر۔" مگر
رمیز کو شیر بنانے کی میری تمام کوششیں رائیگاں ہی
جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

میرے کمرے میں کاٹھ کباڑ بہت ہو رہا تھا، اپنے
کمرے سے فالتو سامان نکال کر بیچا تو سوچا دیور کے
کمرے کی بھی صفائی کر دوں۔ دیور کا کمرہ اچھی طرح
صاف کیا، ریک میں ایک طرف نئے سال کی کتابیں
اور نوٹس وغیرہ رکھے تھے۔ ریک کی دوسری طرف پچھلے
سال کی پرانی کتابیں رکھی تھیں، لو بھلا یہ کس کام کی، میں
نے وہ کتابیں بھی ردی والے کو دے دیں۔ جو پیسے ملے
وہ اپنے پاس رکھ لیے۔ ریک بھی خالی ہو کر اچھا اور
صاف ستھرا لگ رہا تھا، سارے دن کی محنت کے بعد بھی
دیور جی کی طرف سے شکایت ہی کی گئی۔

"بھائی! بھابھی نے میری کتابیں ردی والے
کو بیچ دیں، کتابیں مجھے اپنے دوست کے چھوٹے
بھائی کو دینی تھیں اور ان ہی پرانی کتابوں کے درمیان
میرے اس سال کے کچھ نئے نوٹس بھی رکھے تھے،
بہت محنت سے بنائے تھے میں نے۔ وہ بھی بھابھی
نے بیچ دیے۔" دیور جی رمیز سے شکایت کر رہے تھے
اور رمیز حسب توقع، حسب معمول وضاحتی بیان
جاری کرنے میں مصروف تھے۔

اب بھلا میرا کیا قصور، اس سال کے نوٹس
بہت محنت سے بنائے تھے، جھوٹا کہیں کا۔ فوٹو کاپی
تھے اور کہتا ہے محنت سے بنائے تھے، لیے ہوں گے
کسی دوست سے۔ سوچا تھا، اچھا ہے دیور جی کا کمرہ
خالی ہو جائے گا، کباڑ ختم ہو جائے گا، مگر سچ ہے
بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں اور رمیز کو دیکھو کیسے آرام
سے میری برائیاں سنتے ہیں۔
"شیر بنیے شیر۔" میں نے ہر بار والا طعنہ دیا تھا رمیز کو۔

☆❁☆

ساسو ماں اور نند صاحبہ بازار گئی ہوئی تھیں مہینے
کا سودا سلف لینے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی کیلے
کھا رہی تھی کہ تب ہی بڑی شادی شدہ نند اور نندوئی
چلے آئے۔ میں ان بھاوجوں میں سے نہیں جو شادی
شدہ نند کو دیکھ کر منہ بنا کر اپنے کمرے میں گھس جاتی
ہیں۔ مجھے اپنی نند اور نندوئی کو دیکھ کر خوشی ہوئی، کیلے
کھانا چھوڑ چھاڑ میں کچن میں جا گھسی یہ سوچ کر کہ
اپنی نند کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں
گی۔ وہ یہ نہ سوچیں کہ میری ماں، بہن گھر پر موجود نہ
تھیں، بھابھی نے چائے پانی بھی نہ پوچھا۔

ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا پکایا جائے کہ عجیب
وغریب جناتی آواز سن کر دہل گئی۔ میں کچن سے نکل
کر ڈرائنگ روم میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ نندوئی
صاحب کیلے کے چھلکوں پر پاؤں رکھے کتھک رقص
کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور بڑی نند صاحبہ اپنے
بھاری بھرکم وجود کو ہائے ہائے، اوئی اوئی
کرتی صوفے سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ نند صاحبہ اٹھ کر نندوئی کو تھام
پاتیں، نندوئی صاحب رقص میں بری طرح ناکام
ہوتے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔

لو بھئی میرا کیا قصور۔

مگر پھر بھی میری نند نے مجھے ایسے گھورا جیسے
میں نے ان کے شوہر کو دھکا مار کر گرایا ہو۔

اتنے ڈھیر سارے کیلے کے چھلکے نیچے پھینکے تھے
میں نے کہ اندھے کو بھی نظر آ جاتے۔ دو تین چھلکے ہوتے
تو میں مان لیتی کہ غلطی میری ہے مگر سولہ سترہ کیلوں کے
چھلکے بھی نندوئی نہ دیکھ سکے تو میرا کیا قصور۔ اس عمر میں
آنکھوں کی بینائی بھی تو کم ہو جاتی ہے ناں، صرف

گرنے کی وجہ سے تھوڑی نندوئی صاحب چلنے میں تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ عمر کا بھی تو تقاضا تھا ناں، اب اس عمر میں ہڈیوں میں وہ مضبوطی کہاں رہتی ہے۔

''ارے باجی! کہاں جا رہی ہیں، رکیں تو سہی، میں کھانا پکا رہی ہوں۔''

میں اپنی نند کو روکتی رہ گئی مگر وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے میاں کو تھام کر چلتی بنیں۔ سچ بات ہے، نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔

شام کو پھر سے ساس کے کمرے میں ''بہو برائیاں کانفرنس'' ہو رہی تھی۔ میری بڑی نند نے جانے کیا کیا ایک کی دو دو کر کے ساس صاحبہ کو فون پر لگائی تھیں کہ وہ شدید غصے میں تھیں اور میرے میاؤں حسب معمول حسب توقع چپ چاپ میری برائیاں سن رہے تھے۔ مجال ہے جو ایک لفظ بھی میری حمایت میں منہ سے نکلا ہو۔

''سن کر آ گئے میری برائیاں۔'' میں نے رمیز کو غصے سے دیکھا۔

''ارے میں نے کیا شاہد بھائی کو دھکا دیا تھا جو آپ کے گھر والے میری شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ خود ہی لڑھک گئے تھے شاہد بھائی اتنے ڈھیر سارے کیلے کے چھلکے بھی دکھائی نہ دیے انہیں۔ جب نظر کمزور ہے تو نظر کا چشمہ پہننے میں بھلا کیسی شرم مگر نہ بھئی، اپنے آپ کو اس عمر میں بھی ہیرو بنا کے رکھنے کی خواہش ہے اور آپ کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے میری برائیاں سن کر چلے آتے ہیں۔ میرے حق میں بولتے کیوں نہیں۔ اپنے گھر والوں کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں، میں کہتی ہوں شیر بنیے شیر۔'' میں نے ہر بار والا طعنہ دیا۔

''شیر بنیے شیر...... کیا لگا رکھی ہے تم نے۔'' رمیز ایک دم حلق پھاڑ کر دھاڑے اور میں ڈر کر دیوار سے چھپکلی کی طرح چپک گئی۔

''تنگ آ گیا ہوں میں تم سے اور تمہاری حرکتوں سے۔ کوئی کام تم گھر کا کرتی نہیں ہو، گھر والوں کے کیے ہوئے کاموں میں بھی جان بوجھ کر گڑبڑ کر دیتی ہو۔ آج گھر پر کوئی نہیں تھا تو باجی کے آنے پر تم نے جان بوجھ کر کیلے کے چھلکے گرا دیے تا کہ ان کی خاطر مدارت نہ کرنی پڑے تمہیں۔'' رمیز بری طرح برس رہے تھے۔

''میں نے جان بوجھ کر نہیں......'' میرے حلق سے بلی کی میاؤں جیسی آواز نکلی تھی شاید۔

''چپ کرو تم، مجھے پتا ہے یہ سب جان بوجھ کر کرتی ہو تم، تا کہ گھر کے کاموں سے تمہیں نجات ملی رہے مگر آج تم نے حد ہی کر دی۔ اگر کام نہیں کرنا تھا تو نہ کرتیں، امی اور حرا بازار سے واپسی کے بعد خود ہی باجی اور شاہد بھائی کے لیے پکا لیتیں مگر تمہیں یہ ڈراما نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر خدانخواستہ شاہد بھائی کو زیادہ چوٹ لگ جاتی تو میں تمہیں چھوڑتا نہیں۔'' رمیز کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔

''مم مم...... میری بات تو سنیے آپ۔'' میں منمنائی۔

''اب تم میری بات سنو اور غور سے سنو، اس گھر میں رہنا ہے تو شرافت کے ساتھ رہو ورنہ اپنے میکے چلی جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ اپنی امی کے گھر ہی ٹھیک تھیں تم، اپنے آٹھ بہن بھائیوں کے لیے بھر بھر تھال روٹیاں پکاتی تھیں۔ تمہاری چھوٹی بہنوں کی گز بھر کی زبان ہے، صبح شام لڑتے بھڑتے زندگی گزار رہی تھیں۔ یہاں چار افراد کا کام کرتے تمہارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں۔ سارے گھر کا کام میری ماں اور بہن کرتی ہیں اگر یہاں رہنا ہے تو مل جل کر رہنا ہو گا ورنہ راستہ ناپو اپنا۔''

میں جو ہر وقت رمیز کو بھیگی بلی ہونے کا طعنہ دیتی تھی اور شیر بننے کے مشورے دیتی تھی تو واقعی آج میرے میاں شیر بن گئے تھے اور ان کے شیر بنتے ہی میں خود بخود جانے کیسے بلی بن گئی تھی اور وہ بھی بھیگی۔

میں نے گھر کے کام کرنے میں ہی عافیت جانی اور خاموشی سے کچن کی راہ لی، جہاں آج مجھے کام بگاڑنا نہیں تھا بلکہ واقعی کام کرنا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

"جلدی کرو..... جلدی کرو راستہ دو۔" کوئی عجلت میں چلا رہا تھا۔ نیم بے ہوش راضیہ کی ساری یادیں آپس میں گڈمڈ ہوتی چلی گئی تھیں۔ اس کو صرف پہیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہ اس اسٹریچر کے پہیوں کی آواز ہے جس پر ڈال کر اسے ہسپتال کے اندر کچھ ہانپتے کانپتے لوگ دوڑاتے ہوئے لے کر جا رہے ہیں۔ مگر دل کہہ رہا تھا کہ یہ تو گاڑی کے پہیے ہیں..... جس میں اسے بھائی نے پارلر سے بٹھایا تھا اور اب سڑک پر جلدی مچائے "راستہ دو" کی رٹ لگا رہے تھے۔ تا کہ شادی ہال میں پہنچنے میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت اس نے کڑھ کر سوچا تھا دیر تو ہو ہی گئی ہے۔

کتنے ارمان تھے اس کے کہ اس کا دولہا بھی جین آسٹن کے ناولوں کی طرح سفید گھوڑے پر آئے گھوڑے کے لہلہاتے بالوں کے ساتھ اس کا لمبا کوٹ بھی ہوا سے باتیں کرے۔ مگر اس کے نصیب میں تھا شرافت، جس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنا نام شہروز کر لیا تھا۔ فلمی نام اور فلمی کام اس میں اور جین آسٹن کے ہیرو میں ایک ہی مماثلت تھی اور وہ تھی دو سو سال قدیم فیشن سنس، جس میں جلد سے چپکی پینٹ اور قمیص کے نیچے لگے فوم کے کندھے شامل تھے۔ جس کے باعث جب وہ چلتا تھا تو لوگ شکل کے بجائے تجسس

ناولٹ

www.urdusoftbooks.com

سے ٹانگیں دیکھنے لگتے تھے کہ یہ گھٹنے ان کندھوں کو لیے منزل مقصود پر پہنچا سکیں گے کہ نہیں۔

لیکن قصور شہروز کا نہیں تھا۔ وہ کون ساز بردستی اس کے شب و روز کا ساتھی بن رہا تھا۔ قصور اس کے ماں باپ کا تھا جنہوں نے اس کا نام راضیہ رکھا بھلا یہ بھی کوئی نام تھا جیسے پیدا ہوتے ہی قسمت کا فیصلہ کر لیا ہو کہ اس لڑکی کو راضی خوشی ہی رہنا ہے۔ جبکہ اس کی نسل میں راضی خوشی رہنے کا بالکل فیشن نہیں تھا۔ یہ تو وہ قوم تھی جس نے لان کے سوٹوں میں ایسی دلچسپی دکھائی تھی کہ پہلے اگر چار برینڈز تھے تو ان کی مہربانی سے اب چار سو ہو گئے تھے اور ان کے بھی فی موسم چار والیم آتے تھے۔ تو نام بھی راضیہ رکھا اور سیکھ بھی یہی دی کہ ہر ایک کو راضی رکھو چاہے اس میں اپنی کمر کیوں نہ دہری ہو جائے اور وہ ایسی ہی بنی ہوئی تھی جب تک آسیہ خالہ نے اپنے بیٹے کے لیے اس کا سوال نہیں کیا تھا۔ اماں نے بہت سنجیدگی سے اس کو پاس بٹھا کر بلائیں لیں۔

''آسیہ آپا آئی تھیں۔ بہت چاہ سے تمہیں شرافت کے لیے مانگا ہے۔''

اماں نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا تو دوپٹے کا پلو ہونٹوں پہ رکھ کر راضیہ کھل کھل کر کے ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی تو ایسی ہی بے لگام تھی ایک بار جو چھوٹتی تو بریک فیل ہوئی گاڑی کی طرح رکنے کا نام ہی نہ لیتی۔ وہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔ اس کے لیے یہ خیال ہی بہت مضحکہ خیز تھا کہ وہ اور شرافت کبھی زندگی کے ہم سفر ہو سکتے ہیں۔ جب ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں بل پڑنے لگے تو اس نے بستر پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا۔

اسی لمحے اماں نے غصے کے مارے ایک گھونسا بنا کر پیٹ میں ایسا دیا کہ فوراً اس کی کھڑ کھڑ کرتی ہنسی بند ہو گئی۔ جیسے پیٹ میں ہی وہ نلکا تھا جس سے فوارے کی طرح ہنسی پھوٹ رہی تھی۔

''حد کرتی ہو اماں! پچاس روپے سے زیادہ آج تک اس نے عیدی نہیں دی اور ایک دفعہ مکان بننے پر بہت دل بڑا کر کے آپ کو سوٹ دیا تھا اور آپ گڑیا باجی کی شادی پر پہن کر گئی تھیں تو پتا لگا تین اور عورتوں نے ویسا سوٹ پہن رکھا تھا۔ تب بات کھلی کہ آسیہ خالہ تھوک کی مارکیٹ سے تھان لائی تھیں اور خاندان کے بارہ گھروں کو وہی سوٹ ملا تھا، شکر ہے جو بارہ کی بارہ عورتیں وہی سوٹ پہن کر نہیں آ گئیں ورنہ سب کو لگتا کہ زنانہ بینڈ بجانے والیاں بلائی ہوئی ہیں۔''

اب کے اماں نے ایک اور تھپڑ اس کی کمر پر جڑ دیا۔ ''زبان دیکھو اپنی کسی نے رشتہ مانگا ہے تو شکر کرو، سمجھو اعزاز بخشا ہے۔'' اماں سخت خفا نظر آ رہی تھیں۔

''آسمان سے اڑتا ہوا قالین مجھے کوہ قاف کی سیر کرانے کے لیے نہیں اترا جو میں اعزاز سمجھوں۔ شہروز کا رشتہ آیا ہے جو عارف لوہار جیسے ہیئر اسٹائل کے ساتھ خود کو سلمان خان سمجھتا ہے۔ بمشکل ایف اے کیا ہے اور میں ایم۔ اے انگلش ہوں۔''

اس بار جملے کے بیچ میں ہی راضیہ کود کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ تاکہ اماں کو ہاتھ بڑھا کر مارنے میں کامیابی نہ ہو۔

''خدا کا خوف کرو اچھے بھلے لڑکے کو تبصرے کی بھینٹ چڑھا کر جوکر بنا ڈالا۔ کیا فائدہ ایسے ایم۔ اے انگلش کا جس سے صرف لفظوں کی ہیر پھیر ہی سیکھی ہے۔'' بے شک انہوں نے گود میں بٹھا کر نوالے نہیں کھلائے تھے مگر شرافت ان کا بھانجا تھا۔ اس کی برائی ان کے دل کو لگی تھی۔

''پڑھائی میں آگے نہیں گیا کیونکہ اس کو ضرورت نہیں تھی۔ دادا کی جائیداد ہے۔ باپ کا کاروبار ہے۔ جس کو وہ بہت دیانت سے چلا رہا ہے۔'' اماں نے فخر سے جتایا۔

''برتنوں کی دکان ہے ہونہہ کاروبار!''

اس کی ناپسندیدگی کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جب کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی اماں غلط

نہیں کہہ رہیں۔ کپڑوں میں شہروز کی پسند زنانہ حد تک رنگین تھی مگر وہ اوچھے مزاج کا نہیں تھا۔ ذمہ دار بھی تھا جو کم عمری میں کاروبار کی ذمہ داری لے لی تھی۔ مگر یہ ایم اے انگلش اس کے گلے کی ہڈی بن گیا تھا۔ اس کو اب اندرون لاہور کی تنگ گلیوں میں بچپن گزارنے والا اشرافت عرف شہروز پسند کیسے آتا۔

"اب تو ڈیفنس میں دس مرلے کا گھر ہے آسیہ آپا کا۔ بہو آئے گی تو راج کرے گی۔"

ماؤں کی سائیکی بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی خود ہی اپنی آپا کے سادہ فرش پر دستر خوان بچھا کر کھانے والے خاندان کا مذاق اڑاتی تھیں جو بڑے آرام سے خود کھانا کھاتے اور ان کے بچے کھانا برساتے تھے۔ کھانے کے بعد صحن کا ایسا منظر ہوتا تھا گویا لنگر تقسیم ہوا ہو۔ اس لیے جب تک اکٹھے رہے۔ یہی رواج رہا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد صحن دھلتا تھا۔ یعنی جو کھایا ہضم بھی کر لیا۔

اب جب انہوں نے رشتہ بھیجا تھا تو اچانک ہی ان کو سرخاب کے پر لگ گئے تھے اور اماں کے منہ سے تعریفیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

"جس طرح دادا کے مرنے کے بعد انہوں نے جھٹ اندرون کا مکان اور گاؤں کی جاگیر بیچ کر سیدھا ڈیفنس میں چھلانگ لگائی تھی ویسے ہی اپنی نندوں کی منہ پھاڑ کر بولنے والی بیٹیوں کو چھوڑ کر اب میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ یہ سب بھی اسٹیٹس اپ گریڈ کروانے کے لیے کر رہی ہیں۔ مگر جو بھی کر لیں، رہیں گے وہ پینڈو کے پینڈو۔"

اب کے اسے یقین تھا کہ اماں کی فلائنگ چپل اس کا سر پھوڑے گی مگر لفظ پینڈو نے اماں کو حقیقت میں مشتعل کر دیا تھا۔ پینڈو یعنی گاؤں سے ہونا اصولاً ایک پہچان تھی مگر ارتقائے لغت نے اس کو ایسے معنی دے دیے تھے کہ اب یہ لفظ دوسروں کی تضحیک کے لیے استعمال ہونے لگا تھا۔

راضیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی دوسرے کو پینڈو کہہ کر وہ خود اپنی تربیت پر انگلی اٹھا رہی ہے۔ اپنی اماں کی انگارہ آنکھوں کو دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اماں نے سرخ آنکھوں سے اس پر خوب گولے برسائے پھر طوفان کے بعد کی خاموشی کی طرح سب چپ ہو گئے۔

راضیہ بھی جان بوجھ کر اماں کو منانے نہیں گئی۔ یہ تو وہی بات ہو گئی بکرا خود قصائی کو چھری تیز کر کے پکڑا دے۔ لیکن اس چپ کے روزے میں دونوں کو بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔

راضیہ کی سہیلی افروز کی شادی تھی جس کی وہ مہینہ بھر سے تیاری کر رہی تھی۔ اس نے پیسے جوڑ جوڑ کر بڑا قیمتی منقش کا سوٹ تحفے کے لیے خریدا تھا۔ اس نے اور اماں نے رکشوں پر بازار جا کر راضیہ کے نئے اچھے ڈیزائن کے جوڑے بنوائے تھے۔

ان کے گھر ایسا پہلا شادی کا دعوت نامہ آیا تھا جہاں فنکشن فارم ہاؤس میں منعقد ہونا تھا۔ اب تک ان کی نسلوں نے ون ڈش والی ہال کی شادیاں ہی دیکھی تھیں، جن میں سے آدھی شادی میں وہ اچھی کرسیاں ہی ڈھونڈتے رہتے تھے تاکہ اسٹیج پر بیٹھے دلہا دلہن تو نظر آ سکیں۔ اب تو لاہور میں دس بجے ہال کی لائٹیں بند ہونے کی پابندی سے فنکشن شادی کم اولمپکس کی دوڑ زیادہ لگنے لگے تھے۔ اب راضیہ کو مع والدین ایسے فنکشن میں بلایا تھا جس میں وقت اور کھانے کی کوئی قید نہیں تھی۔

اماں تو مہندی والے دن مغرب کی نماز ادا کر کے منہ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ دل ہی دل میں وہ چاہتی تھیں کہ راضیہ آ کر معذرت کرے اور اصرار کر کے ساتھ لے جائے مگر راضیہ پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی نہیں تھی۔ اسے ایسا شوہر نہیں چاہیے تھا جس سے عمر بھر ہیئر اسٹائل پر مقابلہ بازی ہوتی رہے۔ اس لیے چھوٹے بھائی کو ساتھ لیا اور چل دی۔ اس کی اماں نے اس شادی کے لیے خاص اہتمام اس لیے بھی کروایا تھا کیونکہ افروز کی امی نے کئی بار کہا تھا کہ

راضیہ جیسی ہونہار لڑکی کے لیے وہ اپنے جاننے والوں میں بات چلائیں گی۔ اس سے پہلے بھی دو اچھے گھرانوں سے رشتہ دیکھنے لوگ آ چکے تھے۔ مگر ان لوگوں نے راضیہ کو اس عینک سے دیکھا تھا جس سے اب راضیہ شہروز کو دیکھ رہی تھی۔

مہندی کی تقریب واقعی ایسی تھی کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔ پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے گاڑی سے اترتے ہی شروع ہو گئے تھے۔ ڈرائیور گاڑی کی چابی پکڑ کر پارکنگ میں لے گیا اور راضیہ اور اس کا بھائی دوپٹوں اور گلدستوں سے بنی روش پر چل کر اندر پہنچے تو شامیانے سے جتنے فانوس لٹک رہے تھے۔ اتنے ہی قد آدم آئینے زمین پر جگہ جگہ رکھے تھے۔ پھر جب ہلا گلا اور میوزک شروع ہوا تو واہ واہ ہوگئی۔

کان کے پردے پھاڑتے میوزک میں راضیہ کو ساری باتیں بھول گئیں کہ کس طرح وہ امی کے ساتھ آسیہ خالہ کے اندرون لاہور والے گھر دن گزارنے جاتی تھی اور اپنی کزن کے ساتھ چھت پر کھڑی ہو کر جامن کھا کر گٹھلیاں ہمسائیوں کی چھت پر پھینکنے کا مقابلہ کرتی تھی۔ جس کی گٹھلی جتنی دور والی چھت پر گئی وہ جیت گیا۔

راضیہ کو رٹنے کی خداداد صلاحیت عطا تھی۔ ایسا حرف بہ حرف یاد کرتی مانو گھول کر پیا ہو۔ اکثر تو جذباتی ہو کر ایک مصنف کے دو ناولوں کے اوصاف ملا کر لکھ ڈالتی۔ ممتحن اس کو باریک بینی جان کر نمبروں کی برسات کر دیتا۔

یہ پڑھائی میں اچھا ہونے کی مہربانی اس پر نہ ہوتی تو وہ بھی اپنے ماموں کی بیٹی شبانہ جیسی ہوتی، جس کا میٹرک کی چھٹیوں میں شہروز سے موسمی بخار جیسا افیئر چلا تھا۔ شہروز اس کے لیے آتشی گلابی پرس اور ہرے طوطے جیسے رنگ کی نیل پالشوں جیسے تحفے لاتا اور دونوں اکثر کھانے پینے کی دکانوں اور ٹھیلوں پر پائے جاتے۔ چونکہ دونوں کے پاس موضوعات کی کمی تھی اس لیے رشتہ داروں کے ہی گناہ جھاڑتے رہتے۔ پر کسی نصابی سال کی طرح فرسٹ ایئر میں داخلہ ہوتے ہی ان کا تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اب اس کی اماں چاہتی تھیں وہ شبانہ کی ہم پلہ ہو جائے۔

سب کچھ بھلائے اس نے کھانے سے خوب انصاف کیا اور جب تک ویٹر ڈالتے رہے۔ کھاتی رہی پھر فارغ ہو کر اپنی سہیلیوں کو ڈھونڈا جو کونے والے ایک کمرے میں افروز کو گھیرے ہوئے تھیں۔

''ارے تمہاری عزیز راضیہ کدھر رہ گئی مجھے تو آج تک قلفی نہیں کھلائی اور تمہارے لیے بڑا تحفے کا ڈبہ لائی ہے۔'' جس لڑکی نے تبصرہ کیا تھا اس سے راضیہ کی ویسے ہی نہیں بنتی تھی۔

''خیر آگے پیچھے تو میرے لیے بھی سو سے زیادہ کچھ پرس سے نہیں نکلا آج ہی کچھ لائی ہے۔ اپنے اسٹینڈرڈ کا۔'' صبح اس نے کسی کے تحفے کو نیت کے بجائے پیسے سے تولا تھا۔ اب اس کے ساتھ وہی ہو رہا تھا۔

''آج اتنی اچھی تو لگ رہی ہے۔ دیکھا ہے اس کا جوڑا کتنا اسٹائلش ہے۔'' اس کی ایک اور سہیلی نے اس کی طرف داری کی۔

''ہاں بڑی یونیورسٹی سے ایم اے کر لیا ہے۔ اچھے ڈیزائن کے کپڑے بنوا لیے ہیں، پر رہے گی تو پینڈو ہی نا۔''

یہ تبصرہ افروز نے نہیں کیا تھا مگر اس نے کرنے والی کو تائیدی نگاہ سے دیکھا ضرور تھا۔ اس وقت اس شامیانے میں سجے بے شمار آئینوں میں راضیہ کو اپنا عکس نظر آنے لگا تھا ہر زاویے سے واپسی پر گاڑی کے پہیے چلتے رہے تو راضیہ کی سوچیں بھی رواں رہیں۔ پھر پہیے رکے تو ماضی کی سب سوچیں بھی رک گئیں۔

اب وہ اسٹریچر سے بستر پر ڈال دی گئی تھی اور نرسیں اس کے وائٹل لے رہی تھیں۔

''انہیں ہوا کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے قریب کھڑے اس کے شوہر سے پوچھا۔

www.urdusoftbooks.com

"ٹھیک ٹھاک تھیں۔ پھر سر میں درد کی شکایت کی۔ اچانک بے سروپا باتیں کرنے لگیں اور بے ہوشی میں بڑبڑانے لگیں۔" ڈاکٹر نے تفصیل سن کر بستر کے اردگرد پردے کھینچ دیے۔

اس کا شوہر ایمرجنسی سے باہر نکل کر ویٹنگ ایریا آیا جہاں اس کی ماں کا واویلا جاری تھا۔ وہ بار بار جھولی پھیلا کر کہہ رہی تھیں کہ "ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا"۔ کبھی اپنا سر پیٹنے لگتیں تو کبھی سینہ۔ جیسے مریضہ کو ان ہی عوامل سے آرام آئے گا۔

ساتھ ہی اس کی روشنی پھپھو بیٹھی تھیں۔ جن کو آنا فانا نکلنے کی وجہ سے موقع کی مناسبت سے اپنا میک اپ ہلکا کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس لیے نیلے آئی شیڈ اور جامنی لپ اسٹک کے ساتھ بالوں کے جوڑے میں بڑا سا سورج مکھی والا کلپ لگا رکھا تھا۔ اس حلیے میں بوکھلائی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی تیمار دار سے زیادہ دلہن کی ڈولی کے ساتھ جانے والی عزیزہ لگ رہی تھیں۔

اس نے باقی افراد گنے تو احساس ہوا اس کے اپنے بچوں کے ساتھ دو بچے ہمسائیوں کے بھی آ گئے تھے۔ دل ہی دل میں اس نے خدا کی قدرت اور جاپانی گاڑیوں کو خراج تحسین پیش کیا جو اتنے افراد گھر سے اسپتال پہنچ گئے اور رستے میں کسی کا دم بھی نہیں گھٹا پھر خود بھی وہ کونے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"ارے مجھے پتا ہوتا اس کی طبیعت اتنی خراب ہے تو خود بڑے کے قیمے کے کباب بنا کر کھلاتی مگر اس نے تو بھنک نہ پڑنے دی، ایسی ہی ہے جیسے منہ میں زبان نہیں۔ اپنا درد بھی کبھی نہیں کہتی۔ خدایا میری بہو کو صحت بخش۔"

یہ پہلا فیز تھا جس میں وہ بین کرنے کے انداز میں دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ان کی نیت ٹھیک تھی مگر یادداشت کمزور تھی۔ اللہ نے راضیہ کو زبان دی تھی مگر اس کا استعمال ان کو اتنا ناگوار گزرتا تھا کہ راضیہ نے خود ہی زبان کو آرام دینا شروع کر دیا اور یہ اس سب کا ہی نتیجہ تھا۔ جو دل اتنا بھر گیا کہ ضبط دماغ پر چڑھ گیا تھا۔

راضیہ کے شوہر نے کڑھ کر ماں کے بڑے کے قیمے کے کباب یاد کیے۔ اس کی ماں کو سر درد سے لے کر دل کا دورہ پڑنے تک ہر چیز کا علاج بڑے کے قیمے کے کباب لگتے تھے اور اس پر ان کا کچھ ایسا اعتقاد تھا کہ پہلا لقمہ لیتے ہی ہمیشہ بھلی چنگی بھی ہو جاتی تھیں۔

چند منٹ بعد اماں کی تیمار داری کا دوسرا فیز شروع ہوا اور وہ بے آواز آنسو بہانے لگیں۔ اب روشنی پھپھو کو بھی لگا کہ ان کے نمبر کم رہ جائیں گے تو انہوں نے دو منٹ اونچا واویلا کرنے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی جیسے بے ہوش ہو رہی ہوں۔

مگر راضیہ کا شوہر آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے لیے معمول تھا اور ٹھیک اس کے اندازے کے مطابق پندرہ منٹ میں دونوں نند بھاوج مریضہ سے زیادہ کمزوری محسوس کرنے لگی تھیں اور بدقسمتی سے ہسپتال میں بڑے کے قیمے کے کباب دستیاب نہیں تھے اس لیے تمام کنبے کو لے کر کینٹین چلی گئیں۔ یہ فیز تھری تھا جہاں انہیں ہر چیز کو چکھ کر اس میں دس دس خامیاں نکالنے کا فرض ادا کرنا تھا۔

"آپ کی وائف کو ہوش آ گیا ہے۔ آپ اندر آ جائیں۔" نرس نے اچھی خبر سنائی تو وہ فوراً لپکا۔

"تم ......کون؟" راضیہ نے ذہن پر زور ڈالا۔

"میں شہروز تمہارا شوہر۔" اسے اپنی بیوی کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

"شہروز؟" راضیہ نے ذہن پر زور ڈالا۔ "تم میرے شوہر کیسے ہو گئے۔" وہ یوں گرج کر اٹھی کہ نرس کو بھی دونوں کے رشتے پر شک ہونے لگا۔

"کتنے سال ہو گئے ہیں شادی کو؟" نرس نے پوچھا۔

"دس سال ہو گئے۔ تین بچے ہیں ہمارے۔" شہروز کو وضاحت دینا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ارے میری تو کلاس فیلوز میرے لیے ایک

سے ایک ہیرا رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے تم ہی ملے تھے شادی کے لیے جس کا شبانہ سے چاٹ مسالے جیسا افیئر تھا۔"

"ہائیں...... چاٹ مسالہ۔" نرس بھی متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہاں تو کھانے کے علاوہ انہیں آتا ہی کیا تھا۔ دہی بھلے اور گول گپے کھا کھا کر رشتے داروں کے مزاحیہ نام رکھتے تھے۔ عظمیٰ خالہ کے شوہر کا قد ان سے دو فٹ لمبا تھا ان کا نام گلی ڈنڈا رکھ دیا تھا اور ان کے نندوئی کا نام شٹل کاک رکھا تھا جو ماں کی سن کر بیوی کے کورٹ میں جا گرتا اور بیوی کی سن کر پھر ماں کے پاس پہنچ جاتا۔ ایک دفعہ عمران ماموں بھی اس ہی دکان پر گئے تو دکان دار تک ان کے ذکر سے اتنا باخبر تھا کہ فوراً ان کی کرکٹ امپائیر والی ہیٹ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ وہی عمران ماموں ہیں جن کی ہیٹ میں ہم بچپن میں نانی جان کی ریوڑیاں - چرا کر چھت پر لے جاتے تھے۔ شکر ہے دکان دار کو تم دونوں کا نام نہیں پتا تھا ورنہ سب کا بھانڈا پھوٹتا۔" وہ کسی آندھی طوفان کی طرح پتھر برسا رہی تھی۔

شہروز کے لیے اس کے الفاظ سے زیادہ یہ بات حیران کن تھی کہ وہ ایسے بول رہی ہے جیسے دل کا زبان سے براہ راست تعلق ہو گیا ہو۔ وہ تو گن گن کر لفظ بولنے والی خاموش لڑکی تھی۔ شادی کے دس سالوں میں شبانہ کا قصہ کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ اب جب وہ ایک دہائی کے دکھ سکھ بانٹ کر تین بچوں کی پرورش کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے تو اس نے یہ تذکرہ شروع کر دیا۔

"تم بھول رہی ہو ہم بہت خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ میں بہت بدل گیا ہوں۔"

"ہاں شکر تم نے بال کٹوا لیے...... مگر کپڑے اب بھی ایسے چست اور رنگین پہنے ہیں۔ لگتا نہیں کچھ خاص بدلا ہے۔ پھر کہتے ہو، ہماری شادی ہو گئی۔ اگر میں دس دن بھی یہ اورنج اور نیلی قمیص دھو کر استری کروں تو میرا دماغ الٹ جائے۔"

راضیہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا۔ نرس فوراً ڈاکٹر کو بلانے دوڑی۔

"حوصلہ رکھو راضیہ رانی۔" شہروز بھی ایک دم گھبرایا۔ راضیہ رانی کے الفاظ سن کر وہ رکی، اسے واقعی کچھ یاد آنے لگا تھا۔

"تم میرے ساتھ بہت خوش ہو۔ اب تو ہمارے بچے بڑے اسکول میں جاتے ہیں۔ شبانہ کو اگر چاٹ کھلاتا تھا تو تمہیں مہنگے مہنگے برگر کھلائے ہیں۔"

کم عمری میں اس کے منہ سے، ر...... کی جگہ ڑ، کا پھسلنا معمول تھا۔ اس عادت کو وہ بہت حد تک قابو کر چکا تھا پھر بھی اکثر جذباتی ہوتا تو ڑ ساری قیود توڑ کر دیوانہ وار باہر آ دھمکتا تھا۔

اور اس مانوس...... ڑ کے نکلتے ہی راضیہ کی گم شدہ یادداشت حال میں آ گئی۔

"ہائے یہ گڑبڑ...... بڑگڑ۔" وہ بگڑ کر بولی اور پھر بستر پر مچلنے لگی۔

"کتنی بری لگتی تھیں تمہارے گھر میں ہر چار دن بعد بننے والی توریاں اور لوکی مگر ان کو نگلنے سے زیادہ تکلیف دہ تمہارے منہ سے نکلا بڑگڑ اور پاستا ہضم کرنا تھا۔ تم نے تو پہلی بار مجھے ڈونٹ کھلا کر پوچھا تھا کہ بن پسند آئے۔ میں تصحیح کرتی تھی تو تمہیں لگتا تھا اپنی پڑھائی کا رعب جھاڑ رہی ہوں۔ اس لیے تمہاری محبت میں اپنے ایم۔ اے کو میں نے الماری میں بند کر دیا۔"

راضیہ جیسے زبان سے دست و گریبان ہو رہی تھی۔ شہروز بھولا انسان تھا ساری گفتگو میں ایک محبت ہی سنائی دیا تھا۔

"آج سالوں بعد تم نے کہا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ مجھے لگا تھا یہ جذبہ بھی کہیں تالے میں بند ہو گا۔" دس سال میں اس کی فلمی سوچ بھی زیادہ نہیں بدلی تھی۔

"کہتی نہیں ہوں پر کرتی تو بہت ہوں۔" وہ بھڑک کر بولی۔

www.urdusoftbooks.com

''جب ہی تو تمہاری خود کو ڈول سمجھنے والی ڈھول جیسی پھپھو کو اب تک بالوں کا جوڑا بنانے میں مدد کرتی ہوں۔ اتنی اینٹیں دیوار چین میں نہیں ہوں گی جتنی ان کے سر پر پنیں لگتی ہیں اور تمہاری اماں' ایک دفعہ خالو کے بیمار ہونے پر میں نے کہا جنجر (ادرک) اور ہنی (شہد) دیں افاقہ ہوگا تو بگڑ کر کہنے لگیں کہ رہنے دو یہ اپنی فضول ترکیبیں۔ آدھے گھنٹے بعد ادرک کے پانی میں شہد گھول کر پلایا اور دس دن مجھے سنایا کہ ان کے ٹوٹکوں سے ہی آرام آیا اس کے بعد میں نے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔''

راضیہ نے سر پکڑا تو یقین کرنا مشکل تھا کہ یادداشت کے نہ ہونے پر پریشان ہے یا ہونے پر پچھتا رہی ہے۔

''ارے لاں کے ٹوٹکوں کی دنیا معترف ہے۔ تب ہی کوئی بیماری لمبی نہیں ہوتی۔'' اس نے فخر سے کالر اکڑانا چاہا۔

''بیماریاں تو اس لیے لمبی نہیں ہوتیں کہ اپنی مٹی پلیت نہیں کروانا چاہتیں۔ انفلوئنزا کا نام مختصر کر کے فلو تم جیسوں کی وجہ سے رکھا ہے ورنہ انفلوئنجا انفلوئنجا کہہ کر اس کا بھی حشر کر دیتے۔''

''ایمان سے آج یوں پٹر پٹر بولتی بہت اپنی اپنی لگ رہی ہو۔'' شہروز خود سے ہم کلام ہوا۔

راضیہ ایسی ذہنی کیفیت میں ڈول رہی تھی جیسے کسی ساز کی ساری تاریں عیاں پڑی ہوں۔ جس تار کو چھوا اس کا سُر بجنے لگا۔ اس لیے شوہر کی بات سن کر مسکرانے لگی۔

''ارے آپ کی نہیں ہوں گی تو کس کی ہوں گی۔'' وہ لجاتے ہوئے شوہر کو ایسے دیکھنے لگی جیسے نو بیاہتا جوڑا پارک میں تفریح کر رہا ہو۔

''اپنے اپنے سے لگے ہمیں جب دیکھا پہلی بار تمہیں۔'' اب وہ کبھی چھت اور کبھی شہروز کو دیکھ کر گانا گا رہی تھی۔

جب ڈاکٹر آئی تب وہ مسلسل منہ سے پاں پاں ٹن ٹن کی آوازیں ایسے نکال رہی تھی جیسے ساز بج رہے ہوں' ڈاکٹر نے فوراً سکون آور انجکشن لگایا تو راضیہ نے زوردار آں کہتے ہوئے تان سین کی طرح الاپ کیا اور فوراً سو گئی۔

''ان کے ذہن پر دباؤ ہے' وہ سخت ٹینشن میں ہیں' وہ خود نہیں جانتیں وہ کیا کہہ رہی ہیں۔''

نرس ویٹنگ ایریا میں شہروز کو بتا رہی تھی۔ ''ایسی حالت میں انسان کے سارے خوف اس پر غالب آ جاتے ہیں' وہ اپنے سب سے قریبی انسان کو ہی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔''

نرس بتا کر چلی گئی۔ شہروز فکرمندی سے مڑا تو سب لوگ کینٹین سے آ چکے تھے اور نرس کی باتیں بھی سن چکے تھے۔ بچے ہاتھوں اور منہ میں چپس لیے اسے ایسے گھور رہے تھے جیسے وہ موت کا پروانہ ہو۔

''ہائے میری بھانجی میری بچی راضیہ۔'' اس کی اماں نے ایک بار پھر جھولی اٹھا کر واویلا کرنا شروع کر دیا۔

شہروز جانتا تھا کہ اب تیمارداری کے تینوں فیز دہرائے جائیں گے۔ اس لیے خاموشی سے بیٹھ گیا۔

شہروز کو نرس کی بات ماننے میں ذرا تامل نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ جو پنڈورا بکس راضیہ نے کھولا ہے۔ وہ بیماری کے پیش نظر تھا۔ حقیقت میں وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ راضیہ خود وقت کے دھاگوں میں الجھ کر بھول گئی تھی کہ چاہے اس رشتہ کے آنے پر اس نے واویلا کیا تھا مگر جب ماں کے سامنے اس کو قبول کرنے کی رضامندی دی تھی تو کسی بھی سمجھوتے کی نیت سے نہیں دی تھی بلکہ سو فیصد گھر بسانے اور رشتہ قائم کرنے کی نیت سے دی تھی۔ شادی ہال جاتے ہوئے لمحہ بھر کو دل گھبرایا ضرور تھا لیکن وہ ہر دلہن کے ساتھ ہوتا ہے۔

گھر والوں کے طور طریقے ابھی نئی دلہن کی جھکی نظروں سے پوشیدہ ہی تھے جب شہروز نے ماں سے ضد باندھ لی۔

''ابھی کل ولیمہ ہوا ہے اور آج تم مری جانے کا

پلان بنا کر بیٹھ گئے۔"

اس وقت شہروز کو کاروباری آدمی ہونے پر سخت افسوس ہوا۔ وہ نوکری پیشہ ہوتا تو کم از کم یہ بہانا بنا سکتا تھا کہ چھٹیاں ختم ہو جائیں گی مگر اب کڑوا سچ ہی واحد راستہ تھا۔

"ابھی تو محلے والیاں آئیں گی' سلام کرائی ہو گی۔ میٹھا پکے گا۔"

"اماں! میں صبح اٹھتا ہوں تو رشتہ داروں کے سارے بچے ٹکٹکی باندھے دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں کہ نئی دلہن کا دیدار کر سکیں۔ درجن بھر بچوں کو جواب دے دے کر میری تو وعلیکم سلام کرائی بھی ہو گئی ہے۔ باقی دن کی کسر یہ بڑی بوڑھیاں پوری کر دیتی ہیں، صبح سے شام تک ہر ایک باری باری راضیہ کا انٹرویو کرتی ہے۔"

ابھی اس نے لحاظ میں زبان روک لی ورنہ جب رات کو اس کے کمرے کی ایک طرف سے ٹی وی لگا کر چائے پیتے ہوئے رشتہ داروں کے قہقہے سنائی دیتے جو جلد ہی تو تو...... میں میں...... میں بدل کر لڑائی میں ڈھل جاتے تھے اور دوسری طرف سے نوجوان نسل کے کرکٹ کھیلتے ہوئے دوڑنے کی اور ایک دوسرے کو صلواتیں سنانے کی آوازیں آتیں تو اس کا دل بہت کڑھتا تھا۔

"لو جی...... یہی تو شادی کے رونق میلے ہیں ہم نہیں گئے تھے اوکاڑہ شادی کے بعد۔ ہفتہ بھر رہ کر آئے تھے۔ آج تک یاد آتے ہیں وہ دن۔"

"بس اب یہ رشتہ دار آپ کی ان ہی باتوں کا بدلہ مجھ سے لے رہے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

خوش قسمتی سے راضیہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اس لیے آسیہ بیگم جانتی تھیں۔ شہروز جو کہہ رہا ہے اپنے ذہن سے کہہ رہا ہے۔ اس لیے انہوں نے کوئی جذباتی رونا دھونا نہیں کیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ مکلاوے کی اگلی صبح ہی وہ دونوں چل پڑے تھے اور حقیقت میں لگ رہا تھا کہ ان کی زندگی کا سفر شروع ہو گیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو جان رہے تھے سمجھ رہے تھے اور اپنا رہے تھے۔

"یہ کیا بات ہوئی ہماری تو کوئی پسند نہیں ملتی۔"

ڈنر کے بعد ہوٹل جاتے ہوئے راضیہ نے اپنا دوپٹہ سر پر دوبارہ ٹکایا جو بار بار ہوا سے اڑ رہا تھا۔

"بہت سے لوگ ہیں دنیا میں جن کی پسند نہیں ملتی۔" شہروز نے ہاتھ کے اشارے سے گلابی لچھے کے لیے منع کیا جو راضیہ اس کی طرف بار بار بڑھا رہی تھی۔

"لیکن ان بہت سے لوگوں نے زندگی ساتھ نہیں گزارنی ہوتی۔ ہم نے گزارنی ہے۔" وہ افسردہ سی ہو کر لچھے کا لفافہ اچھالنے لگی۔

"پگلی ذہنی ہم آہنگی ایک جیسی پسند ہونے سے تھوڑی ہوتی ہے۔ بلکہ جن کی ناپسند ملتی ہے ان کی آپس میں زیادہ بنتی ہے۔" شہروز انیس سال کی عمر سے کاروبار کر رہا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملا تھا۔

"کیا سچ میں؟" راضیہ نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

"آزما لو...... ایسی کون سی چیز ہے جو دنیا میں سب کو پسند ہے پر تمہیں نہیں۔" شہروز کی بات پر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

"پانی کے فوارے۔" راضیہ پہلے بولی تھی۔

"کتنا سنتے ہیں پانی بچاؤ، پانی قیمتی ہے پھر نمائش کے لیے خود ہی ضائع کرتے رہتے ہیں۔" جملہ مکمل کر کے اس نے شہروز کو دیکھا۔

"مجھے پانی کے فوارے پسند......" اس نے تجسس پیدا کرنے کے لیے جملہ لمبا کیا۔ "نہیں ہیں۔ اس لیے کیونکہ اسکول میں لڑکوں نے شرارت سے مجھے ایک دفعہ فوارے میں دھکا دے دیا تھا۔ تب سے لگتا ہے فوارے وہی اچھے ہیں جو بند ہیں۔"

راضیہ خوشی سے مسکرائی تھی۔

"چلو ایک چیز تو ملی اور......" وہ دوبارہ سوچ

میں غرق ہونے لگی تو شہروز نے ٹوک دیا۔
"اتنا نہ سوچو پہلے یہ لچھا کھالو۔" راضیہ نے اپنے ہاتھ میں موجود پیکٹ کو دیکھا جسے وہ بہت دیر سے لیے پھر رہی تھی۔
"وہ شہروز! یہ لچھا مجھے پسند نہیں ہے۔ آپ ہی کھالیں۔ آپ شوق سے لے کر دے رہے تھے تو میں نے آپ کا دل رکھنے کے لیے لے لیا تھا۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔
"میں تو کھاتا ہی نہیں۔ عجیب چپ چپے ہوتے ہیں۔ مجھے لگا تمہیں پسند ہیں۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔"
"خوب صورت کہا تھا لذیذ نہیں۔" اس بار دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور ہنستے ہنستے راضیہ کا پاؤں لمحہ بھر کو پھسلا مگر شہروز نے سنبھال لیا۔
"شکریہ۔" وہ ممنون ہو کر پھر اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔
"یہ پہن لو۔" شہروز نے اپنی ٹوپی اتار کر راضیہ کے سر پر پہنا دی۔ تاکہ دوپٹہ سر سے نہ اترے۔ پھر وہ ایسے ہی سہارا دیے چڑھائی چڑھنے لگا۔
اس وقت راضیہ کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ جو بلا شبہ اس کے ذہن میں رہ جانے والی شہروز کی سب سے پہلی یاد تھی۔ وہ آسیہ خالہ کے گھر آئے ہوئے تھے۔ جب سب نے مل کر برف کا گولہ کھانے کا پلان کیا۔ وہ اور شبانہ بھی ہاتھ پکڑے بڑے بہن بھائیوں کے پیچھے پیچھے بھول بھلیوں جیسی گلیوں سے گزرنے لگیں۔ جب سب گولہ کھانے لگے تو محلے کے کچھ شرارتی لڑکوں کی جھڑپ ہو گئی اور لڑائی میں انہوں نے ہتھیار کی جگہ ایک دوسرے پر برف کے گولے برسانے شروع کر دیے۔ راضیہ بھی واپسی کے رستے کی طرف دوڑی اور راستہ بھٹک گئی۔ جب وہ ایک تنگ گلی میں زمین پر بکھرے ہوئے برف کے گولے کے پاس بیٹھی رو رہی تھی تو شہروز اسے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔
"ارے رونے کی کیا بات ہے میں تمہیں نیا دلوا دیتا ہوں۔" وہ اسے راستہ دکھانے لگا۔
"میرے کپڑے بھی گندے ہو گئے۔" اس نے آستین سے ناک صاف کی۔
"چلو اب رونا بند کرو، اب تو میں آ گیا ہوں نا۔" پھر اس نے راضیہ کو جوس لے کر دیا تھا۔ اب جب راضیہ کو یہ قصہ یاد آیا تو وہی ہوا جو خاندان میں ہونے والی ہر شادی میں ہوتا ہے۔ راضیہ کو لگنے لگا کہ اسے تو شہروز سے محبت۔۔ اسی وقت بچپن میں ہو گئی تھی۔ جو ایک بھولی ہوئی یاداشت کی طرح اب شادی کے بعد لوٹی ہے۔

☆☆☆

شادی کے فوراً بعد جو گل و گلستان کھلتے ہیں ان کی میعاد تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ جب معمولات زندگی بحال ہوئے اور راضیہ کا پالا آسیہ خالہ اور روشنی پھپھو سے پڑا تو اس کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔
شہروز نے تو دوڑ دھوپ کر کے شناختی کارڈ بدلوا لیا تھا۔ مگر پھپھو کے شناختی کارڈ پر اب بھی اصل نام رشیدہ درج تھا۔ اماں ابا کی زندگی تک آبائی گھر قصور میں ہی رہتی تھیں۔ پھر بھائیوں کے پاس اندرون لاہور والے گھر آ گئیں تو کسی ناول میں پڑھ کر نام روشانے کر لیا جو کسی کے بھی منہ پر نہ چڑھا اس لیے جلد روشنی میں بدلوا لیا۔ کم عمری میں حسین بھی تھیں مگر اب عمر، چہرہ خدوخال سب کچھ روشنی کی جگہ تاریکی میں ڈھل چکا تھا۔ مگر وہ یہی پسند کرتی تھیں کہ انہیں روشنی نام سے پکارا جائے۔ کیونکہ رومانٹک لگتا ہے۔ آخر کو وہ ابھی تک کنواری تھیں۔
راضیہ کو تو اپنی ہم عمر سمجھتی تھیں...... چاہتی تھیں وہ دونوں مل کر دن بھر انڈین فلمیں دیکھیں اور گپیں لگائیں۔ راضیہ کھلے دل کی تھی۔ کئی دن ان کی تنہائی کی ساتھی بنی، ان کی توقعات پر پوری اترتی رہی۔ تو روشنی کو ہلکا پھلکا اپنی عمر کا اندازہ تھا۔ وہ راضیہ کی اس مہربانی سے بالکل ہی ذہن سے نکل گیا۔
چند دن بعد ہی راضیہ کے کپڑوں کی نقل میں

انہوں نے اونچا فراک اور سیدھا ٹراؤزر سلوا کر پہن لیا۔ چار دہائیوں سے دیسی غذا پر پلا وہ جسم ایسا لگ رہا تھا جیسے لوہے کے موٹے سریے کی چھتری بنا دی گئی ہو۔ آسیہ خالہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ روشنی کو آتا دیکھ کر بوکھلاہٹ میں چھری ہاتھ سے گر گئی اور اچھا ہوا جو گر گئی ورنہ ہاتھ کٹ جاتا اور روشنی پھپھو کا حسن یوسف حاصل ہونے پر یقین پختہ ہو جاتا۔

''کیوں بھئی کیا سرکس میں کرتب دکھانے کا ارادہ ہے؟'' وہ بھابھی تھیں جو سالوں سے نند کو برداشت کر رہی تھیں۔ لحاظ مروت عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔

''آپ کو کیا پتا فیشن کیا ہوتا ہے۔ اماں مرحومہ نے میرے جہیز کے لیے جامہ وار کی ساڑھی رکھی تھی آپ نے اس کے صوفوں کے کشن بنا لیے تھے۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔'' وہ کود کر تخت پر بیٹھ گئیں۔

''ارے میں نے تو اس لیے پوچھا کہ جمناسٹک کرتے ہوئے ایسے کشش ثقل کو مات دینے والے، جلد سے چپکے کپڑے پہنتے ہیں، جن میں الٹا بھی کھڑے ہو جاؤ تو مجال ہے جو ذرہ برابر بھی سرکیں، پر خدا کے واسطے تم یہ تجربہ نہ کرنا تم ان میں سانس ہی لے لو مہربانی تمہاری۔'' انہوں نے پھر چھری اٹھائی اور سبزی کاٹنے لگیں۔ روشنی پھپھو نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''سبزی کٹی نہیں اور جلن سے ہانڈی پہلے جل گئی۔ یہ تو راضیہ بتائے گی میں کیسی لگ رہی ہوں۔'' شکر انہوں نے راضیہ کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اٹھ کر لٹو کی طرح گھوم گھوم کر اپنا فراک دکھانے لگیں۔

''میں تو انارکلی جیسی لگ رہی ہوں ہے صدا ہوں اپنے پیار کی۔''

اور ساتھ ہی گنگناتے ہوئے ایک دائرہ گھوم کر انہوں نے کتھک ڈانس کی طرح تالی بجائی تو فراک کی بھی ہمت جواب دے گئی اور وہ بغلوں سے چرنے لگی۔ کپڑا پھٹنے کی آواز سے روشنی پھپھو نے کمرے کی طرف دوڑ لگائی اور یقیناً اس دوڑنے کے عمل میں فراک کے بقیہ بخیے بھی ادھڑ گئے تھے جو دوبارہ خوش قسمتی سے اس فراک کی شکل دیکھنی نہیں پڑی۔ اس کے بعد سے راضیہ نے ان سے ذرا فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

آسیہ خالہ وہ ساس تھیں جو چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں۔ ان کے لال مہندی سے سرخ بالوں کو دیکھ کر راضیہ کی چھٹی حس شروع میں ایسے ہی چکرائی تھی جیسے ایمبولینس کے اوپر لال بتی خطرے کی اطلاع دے رہی ہو مگر ان سے دوری رکھنا راضیہ کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ بھولپن میں کچھ زیادہ ہی اپنائیت دکھانے لگی۔

''خالہ جی! آج کل اتنے رنگوں کے ڈائی آ گئے ہیں۔ صرف براؤن رنگ کے ہی پندرہ شیڈ ہوتے ہیں۔'' اس نے بات ایسے پہنچائی کہ خالہ کی دل آزاری نہ ہو۔

''ارے ان انگریزی ڈائے کی مجھے کیا ضرورت، میرے تو قدرتی گھنے سیاہ بال ہیں یہ تو ذرا خشکی ہو جاتی ہے اس لیے مہندی لگا لیتی ہوں۔'' راضیہ نے سر پکڑا، وہ سمجھتی تھیں ان کے علاوہ دوسروں کی آنکھوں میں روشنی نہیں ہے۔

ایک دفعہ شناختی کارڈ بنوانے نادرا کے دفتر گئیں تو بندے نے بڑے ادب سے پکارا۔ ''اماں جی کیا عمر ہے؟ بچے کتنے ہیں؟''

''عمر تیس 30 سال پانچ بچے ہیں۔'' آدمی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''کیا کہا اماں جی؟ کتنے سال ہو گئے شادی کو؟''

''بیس سال ہو گئے ہیں شادی کو۔'' آدمی خود پینتیس کا تھا۔ اس کی نظر اور حساب بھی معقول تھے اس لیے ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے کئی دلائل دیے یادداشت بحال کروائی مگر آسیہ خالہ اپنے بیان سے نہیں مکریں۔ آخر نادرا والے کو اپنی عقل اور حسیات پر سمجھوتا کر کے اماں جی کی عمر والی عورت کو خود سے چھوٹا تسلیم کرنا پڑا۔

شادی کے بعد راضیہ جب کچھ دن کے لیے میکے رہنے گئی تو گھر کا ماحول ماں کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"خبردار جو یہ باتیں کبھی ان سے کہیں۔ تم پرائی ہوا بھی، دل میں بال آ جاتا ہے ایک دوسرے کی خامیاں گنوانے سے، خاص طور پر شہروز سے اس کی پرانی عادتوں کا ذکر ہرگز نہ کرنا۔"

ماں نے تجربے کی بنیاد پر جو سکھایا وہ راضیہ کے حق میں غلط ثابت ہوا۔ سسرال کا ماحول جتنا بے ڈھنگا تھا اتنا ہی ہلکا پھلکا بھی تھا۔ راضیہ ڈھول پیٹ پیٹ کر بھی ان کی برائیاں بتاتی تو وہ شام کی چائے کی طرح منٹوں میں ہضم کر لیتے۔ ان کا آدھا دن ایک دوسرے کی برائیاں گنوانے اور اپنی برائیوں کا انکار کرتے گزرتا تھا۔

راضیہ بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتی۔ مگر اب دانستہ طور پر خیالات پر جو تالا لگانا تھا اس نے ابتدا سے اس میں اور دوسروں میں پردہ حائل کر دیا تھا۔ باقی سب کے ساتھ یہ پردہ خاص معنی نہیں رکھتا تھا۔ مگر شہروز زندگی کا ساتھی تھا اس سے سب کہہ سن لینے کی خواہش فطری تھی۔ خاص طور پر وہ شبانہ کے متعلق ہر بات کھل کر کر لینا چاہتی تھی۔ مگر ماں کی تاکید آڑے آ گئی۔

دس سال بعد وہ تمام باتیں پنڈورا باکس کی طرح نکل تو گئی تھیں لیکن ان کا نتیجہ آنا باقی تھا۔

☆☆☆

ماں سے منافقت کا درس پڑھ کر وہ گھر پہنچی تو دیکھا ساس صحن کے نلکے کنارے بیٹھی اس کی کنڈیشنر کی بوتل انڈیل انڈیل کر سر پر مل رہی تھیں۔ اس نے جھپٹ کر بوتل پکڑ لی تو خالی ہو چکی تھی۔

"خالہ جی! بس کریں اتنا ملیں گی تو مہندی دھل جائے گی پھر سے سر سفید ہو جائے گا۔" اس نے جل کر کہا۔

"ذرا جھاگ نہیں بنے تمہارے شیمپو سے، میں

نے کہا۔ بڑی پڑھی لکھی ہو، دیکھ بھال کر چیز لائی ہو گی۔" وہ شرمندہ ہونے کے بجائے اس پر ہی چڑھائی کرنے لگیں۔

"خالہ جی! یہ انگریزی چیزیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ حسن کے لیے بڑا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس شیمپو سے جھاگ نہیں بنتے اور جو کریمیں ہوتی ہیں ان سے جلد ایسے جلتی ہے جیسے لال مرچوں کا لیپ کیا ہو۔ ایسے تو میمیں اتنی گوری چٹی نہیں ہوتیں۔ یہ موا مائیکل جیکسن یہی چیزیں استعمال کر کے تو ایسا ہو گیا ہے۔"

اس نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور ایسا ڈراؤنا منظر پیش کیا کہ آئندہ اس کی چیزوں کو دیکھ کر ہی آسیہ خالہ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو پڑھنے لگتیں۔ ہاتھ لگانا تو دور کی بات۔

جہاں برائیاں تھیں وہاں اچھائیاں بھی تھیں۔ راضیہ پر کام کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا جلد ہی اس کی بیٹی ہو گئی تو اس کی ذمہ داریوں کا زاویہ بالکل ہی بدل گیا۔ پھر بھی وہ دل سے گھر کی آرائش اور رہن سہن میں اپنا حصہ نبھاتی رہتی۔ ایک روز کچھ مہمان کھانے پر آئے تو راضیہ نے بہت محنت سے تہہ دار میٹھا بنایا۔ نیچے بسکٹ پھر کریم پھل کسٹرڈ ڈال کر سجاوٹ کے لیے بادام کاٹنے لگی تو آندھی طوفان کی طرح آسیہ خالہ آ دھمکیں۔

"صبح سے لگی ہو ابھی تک میٹھا نہیں بنا۔ اے آج کل دی کڑیاں وی ناں۔" انہوں نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے چمچہ اٹھایا اور ڈونگے میں ایسے چمچہ چلایا جیسے حلیم گھوٹ رہی ہوں۔ بڑے کے قیمے کے کباب کھا کھا کر بنائی صحت کی مدد سے دو منٹ میں راضیہ کے فروٹ ٹرائیفل کی ساری تہیں تہہ و بالا کر کے ڈونگا فرج میں رکھ دیا۔

"لو جی ایک چیز تو تیار ہوئی۔" راضیہ کی محنت کا ستیاناس کر کے وہ یہ جا وہ جا ہوئیں۔

دو منٹ تلملا کر راضیہ بھی لاپروا ہو گئی۔ آنے

والے مہمان بھی ان ہی کی طرح تھے جو اپنے مہمانوں کو سیدھی پلیٹوں میں شوربے والا سالن کھلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ناشتے میں فرائی آملیٹ کھایا ہے۔
راضیہ کے لائے سجاوٹ کے رنگین ماربلز سے ان کے بچے کھیلنا شروع ہو گئے تو آسیہ بی بی نے ذرا لحاظ نہ کیا اور بڑھ کر ایک بچے کا کان مروڑ دیا۔
''لحاظ کرو آسیہ! معصوم بچے کا کان نکالو گی؟ پیار سے سمجھا دو۔'' اس عورت نے جھٹ اپنا بچہ پکڑا۔
''لاتوں کے بھوت ہیں' یہ باتوں سے ماننے والے ہوتے تو تمہارے نہ ہوتے۔'' آسیہ بی بی نے مرغ مسلم کی ٹانگ غصے سے توڑ کر دانتوں کے نیچے رکھی۔
''بہت فرماں بردار ہیں' تم کیا جانو۔'' مہمان خاتون نے نان کو چیر پھاڑ کر جانے والے انداز میں توڑ کر لقمہ لیا۔
''تمہاری فرماں برداری میں تو یہ بدتمیزیاں سیکھی ہیں۔ ایسے تو نہیں ساس نندوں سے جان چھڑائی تم نے۔'' اور یوں ایسی لڑائی ہوئی کہ میٹھا کھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔
راضیہ خوب محظوظ ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا جو بھی حالات ہوں اچھا ہی ہو گیا جو شادی ہو گئی ورنہ اس کا بھی وہی حال ہوتا جو روشنی پھپھو کا ہوا تھا۔ کبھی ان کے بھی دل اور نگاہوں میں ان کے نام کی طرح کے ہی دیپ جلتے تھے۔ مگر وہ خود کو کوہ قاف سے آئی ایسی پری سمجھتی تھیں جس کے لیے زمین پر کوئی شہزادہ ہی پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے ایک کے بعد ایک رشتہ ٹھکراتی گئیں۔
''یہ تو سارا قصور اس قصور شہر کا ہی ہے۔ جو اماں ابا لاہور میں آ کر رہتے تو میرے رشتوں کی لائن لگی ہوتی۔'' اب بھی اکثر دل جیسی شکل کا بلش آن لگاتے ہوئے وہ یاد کرتی تھیں۔
اس دعوے میں کچھ حقیقت تو تھی کیونکہ رشتوں کی لائن اب بھی لگی تھی۔ جس میں گویا ایک ہی شخص موجود تھا مگر جتنی مستقل مزاجی سے وہ سالوں سے منتظر تھا اس سے اسے لائن ہونے کا شک شبہ دیا جا سکتا تھا۔
اور وہ آدمی تھا مجاہد عرق گلاب والا۔ وہ اندرون لاہور کے دنوں میں ان کا ہمسایہ تھا اور روشنی پھپھو کو اس کم سنی کی عمر سے پسند کرتا تھا۔ جب آئی بروز بنانے کے لیے جنون میں روشنی پھپھو نے بال صاف کرنے والی کریم منہ پر لگا کر ایک آئی برو ختم ہی کر ڈالی تھی۔
پھر مہینہ بھر آدھے چہرے پر بال ڈال کر پھرتی رہی تھیں۔ پر روشنی پھپھو نے مجاہد کے رشتے کو انکار کرنے میں لحہ نہیں لگایا اور اتنی دفعہ منع کیا کہ رشتہ بھیجنے والا حساب بھی بھول گیا۔ مجاہد نے آخر کہیں اور شادی کر لی تھی۔ اب بیوی فوت ہو چکی تھی۔ دونوں بیٹیاں بیاہ کر ملک سے باہر رخصت کر دی تھیں تو اس نے سلسلہ وہاں سے ہی جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

''یہ دیکھیے آپا! میرا بنایا ہربل تیل اور ابٹن ان کی مارکیٹ میں بڑی ڈیمانڈ ہے۔'' اس نے اپنے نئے پراڈکٹ کے تحفے آسیہ خالہ کی خدمت میں پیش کیے۔
''واہ مجاہد! تم نے تو بڑی ترقی کر لی۔ میں بادام ساڑ (جلا) کر مہاسوں کے لیے جو لیپ بناتی ہوں وہ بھی شیشوں میں بھر کر بیچنا شروع کر دو ایمان سے ہماری پارٹنر شپ سے دگنی چاندی ہو گی۔ منافع آدھا آدھا کر لیں گے۔'' آسیہ خالہ کی تجویز پر مجاہد سٹپٹا گیا۔ یہ تو اور ہی قسم کی پارٹنر شپ سوچ رہی تھیں۔
''ہاں ہاں آپا! یہ بس چھ مہینوں کی شیشیوں اور بھروائی کا سودا ہو گیا ہے اگلے سودے سے پہلے بتاتا ہوں۔ آخر اب آپ ہی تو میری خیر خواہ ہیں۔ میری تنہائی کا حل آپ نے ہی اپنے ''آس پاس'' ڈھونڈنا ہے۔''
اس نے ٹال کر مزید مکھن لگایا اور کئی دن لگاتا رہا۔ مگر دال نہ گلی۔
''چھوٹا قد، گنجے سر والا یہ آدمی کیا سمجھتا ہے اس عمر میں شادی کرے گا اور میں ہاں کر دوں گی۔'' روشنی پھپھو نے اتنا بلند و بانگ انکار کیا کہ کچھ

آوازیں مجاہد کے کانوں میں بھی پڑ گئیں۔ اس نے دیسی ٹوٹکوں میں وقت برباد نہیں کیا اور چند ہی دنوں میں اونچے سے نقلی بال ایسے لگوائے کہ قد میں یقینی دو انچ کا اضافہ ہو گیا۔

اس تبدیلی سے بے خبر راضیہ شربت کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی تو وحید مراد کے انداز کے بالوں والے مجاہد کو دیکھ کر اس کی ہنسی پھر سے بریک فیل ہوئی گاڑی کی طرح چل پڑی۔

''کھانسی رہتی ہے اسے' وہی حلق میں پھنس گئی ہے۔'' آسیہ خالہ نے اس کی کمر پر تھپڑ مار کر ٹرے پکڑی۔

راضیہ دوڑ کر لاؤنج سے نکل گئی اور باہر جا کر خوب ہنسی۔

''مجھ پر بھی جوانی آئی ہے کہ آگ لگے گی کہیں نہ کہیں۔'' ایک پرانا گانا راضیہ طنزیہ گانے لگی تو پیچھے سے روشنی پھپھو کو بیچ میں آگ ہی لگ گئی۔

''میں تو تمہیں معصوم سمجھتی تھی مگر تم تو گھنّی نکلیں۔ نظریں بچا کر دوسروں کی مجبوریوں پر ٹھٹھے لگانا تمہیں خوب آتا ہے۔'' وہ تین سطروں کا کڑوا جملہ کہہ کر چلتی بنیں مگر اس رائی کے دانے جیسے واقعہ سے راضیہ کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔

اب تک ہونے والا ہر واقعہ رائی جیسا معمولی تھا مگر اس کو دل میں رکھ کر وہ رائی کے دانے جمع کرتی رہی تھی اور دس سالوں میں جو پہاڑ بنا تھا وہ روشنی پھپھو کے اس آخری جملے سے دھڑ دھڑ زمین بوس ہو رہا تھا۔ راضیہ پہلے چکرائی پھر بے سدھ یا بولنے لگی اور اب اسپتال میں پڑی تھی۔

☆☆☆

''ابو! باتھ روم جانا ہے۔'' شہروز بچوں کو باتھ روم لاتے لے جانے کے لیے اسپتال کے فرش پر اتنے چکر لگا چکا تھا کہ باتھ روم کا رستہ اس کے قدموں کے نشان دیکھ کر ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ اس لیے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بچوں کو گھر لے جانے کو کہا۔

''ایسے کیسے جاؤں اپنی راضیہ کی صورت نہ دیکھ لوں تب تک نہیں جا سکتی۔''

اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں تو شہروز نے ڈاکٹر سے خاص گزارش کی اور اماں کو بڑی تاکید کی کہ دور سے دیکھ آئیں۔ راضیہ کو تنگ نہ کریں۔

مگر آسیہ خالہ اور ان کا پیار' جاتے ہی دونوں ہاتھوں سے مریضہ کو جھنجھوڑ دیا۔

''اٹھو راضیہ! آنکھیں کھولو۔'' ایسے زلزلہ صفت جھٹکوں سے تو مردے بھی اٹھ جاتے وہ تو پھر نیند میں تھی۔

''آ گئیں میرے جہیز کا سوٹ سلوا کر۔'' اس نے خالہ کا دوپٹہ اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر آنکھوں کے پاس کیا۔

''ارے بیٹا! تم نے خود ہی تو دیا تھا۔'' وہ دوپٹہ چھڑا کر شرمندگی سے بولیں۔

''جس طرح کم بخت نیوز چینل والے ہر آدھے گھنٹے بعد بریکنگ نیوز کی لال پٹی چلا دیتے ہیں ویسے آپ بھی نئے انداز میں پرانی خبر دینا شروع ہو گئی تھیں کہ یہ سوٹ مجھ پر کن وجوہات کی وجہ سے اچھا نہیں لگے گا۔ میں نے خود سلوا کر یہ خبرنامہ لمبا نہیں کرنا تھا اس لیے آپ کو دے دیا۔'' راضیہ نے پھر نیند میں جانے کی کوشش کی۔

''ارے بچی! ایسے ہی غلطی سے ایک آدھ بار کہہ دیا ہو گا۔ ورنہ تمہیں تو پتا ہے میں کسی کی ذاتیات میں دخل ہی نہیں دیتی۔ میری تو عادت ہی نہیں۔'' انہوں نے ہنس کر ماحول ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

''اللہ کو مانیں۔ صداقت کا رشتہ لے کر پچھلے دنوں جو گئی تھیں۔'' راضیہ نے اپنے دیور کا ذکر کیا۔

''اتنا تو پولیس والے تفتیش کرتے پر انٹرویو نہیں لیتے جتنا آپ نے لے لیا تھا۔ کتنا خواہش مند تھا وہ کہ کولیگ سے شادی ہو جائے۔ اگر آپ پسند کی شادی پر مان ہی گئی تھیں تو زبان چھوٹی رکھنی چاہیے تھی اور دل بڑا کرنا تھا۔''

''وہ تو بالکل انجان لوگ تھے چھان پھٹک تو

کرنا بنتی تھی ناں۔" انہوں نے ہاتھ پھیر کر راضیہ کے بال سنوارنے کی کوشش کی۔

"جاتے ہی آپ نے لڑکی کی ماں کی عمر پوچھ لی اور عمر جان کر کہا کہ میاں آپ کے چھوٹے لگتے ہیں۔ وہ تو اتفاق سے میاں عمر میں چھوٹے ہی تھے اور یہ ان کی عمر بھر کی دُکھتی رگ رہی تھی۔

پہلی ملاقات میں ہی ان کا ہم سے دل کھٹا ہو گیا۔ پھر بھی وہ بیٹی کی محبت میں ہمارے گھر آئیں۔ وہ بے چاری زیادہ ہی تردّد سے تیار ہو کر ساڑھی پہن آئیں تو آپ کہے بغیر نہ رہیں کہ آج کل عورتیں خوب صورت لگنے کے بوٹاکس کے انجکشن لگواتی ہیں۔ آپ نے لگوائے ہیں؟" یہ باتیں سن کر انہوں نے کہاں پلٹ کر رابطہ کرنا تھا۔" راضیہ آج حقیقی معنوں میں اس ہی گھر کی بہو لگ رہی تھی۔

"تو تم بھی کھڑ کھڑ کر کے ایسے ہنس رہی تھیں کہ ان سے چائے کے کپ بھی ختم نہ ہوئے۔" بے شک بیمار تھی پر ان کی تو بہو تھی۔

جذبات میں آکر راضیہ تیز انگلش بولنا شروع ہو گئی اور اتنے زناٹے دار انگلش سن کر آسیہ بی بی کی حالت غیر ہو گئی۔ راضیہ نے انگریزی میں اپنی ساس کو ایسی سنائیں کہ اگر کوئی اس زبان کو سمجھنے والا سنتا تو زمین میں گڑ جاتا۔ وہ تو بھلا ہوا آسیہ بی بی کے پلے ایک لفظ نہ پڑا بلکہ اور ترس آیا کہ بہو کی حالت بہت نازک ہے۔ دوسری طرف راضیہ کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

ignorance is a bliss کا صحیح مطلب اسے آج سمجھ میں آیا۔ آسیہ بی بی اس پر دم کرتی رہیں کہ بہو پر کوئی فرنگی جن آ گیا ہے۔

راضیہ بول بال کر پھر بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے جو دردناک نقشہ کھینچا تھا آسیہ بی بی کو حالت اس سے کہیں زیادہ ہی گمبھیر لگی۔ اس رات انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کیا تو حیرت کے مارے باقیوں کی بھوک ختم ہو گئی۔

سب کو مزید حیرت زدہ کرتی آسیہ بی بی خاموشی سے اٹھیں اور صداقت کا رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والی خاتون کو نہ صرف خود فون کیا بلکہ ایسے تہذیب سے بات کی کہ اردگرد والوں نے ایک دوسرے کو چٹکیاں کاٹ کر یقین دلایا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔

بات کرتے ہوئے وہ کسی سرکاری نیوز چینل کی اینکر کی طرح لگ رہی تھیں۔ جو حکومت بدلنے سے چند ماہ پہلے تک چند کارندوں کے گُن گاتی خبریں پڑھتی ہیں۔ پھر اپوزیشن میں آتے ہی ان ہی کارندوں پر کیچڑ اچھالتی خبریں بھی اسی سکون سے پڑھ کر پروفیشنلزم کی انتہا کر دیتی ہیں۔

ویسی ہی ڈپلومیسی سے بات سنبھال کر انہوں نے صداقت کے رشتے کی ڈوبتی ناؤ کو کنارا دکھایا۔ پھر پُرسکون ہو کر سو گئیں مگر ان میں آئے بدلاؤ کو دیکھ کر روشنی پھوپھو کی نیندیں ایسی اڑیں کہ ایک رات میں سوچ سوچ کر پانچ کلو وزن کم ہو گیا۔

صبح اٹھ کر انہوں نے اسی فکر سے دس کلو کا ناشتہ کیا تو سکون ملا۔ انہیں یقین تھا کہ آسیہ بی بی نے جس فرنگی جن کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ نہایت پہنچا ہوا ہو گا جس نے ان کی ۔ ایسی کایا پلٹ دی۔ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر خاموشی سے رکشہ کر کے اسپتال پہنچ گئیں۔

راضیہ کی حالت میں اب بھی سدھار نہیں تھا۔ اس لیے ڈاکٹر نے شہروز کو ایک بہت بااثر انجکشن کی تلاش میں بھیجا ہوا تھا۔ پھپھو کے لیے میدان صاف تھا سیدھا راضیہ تک پہنچ گئیں۔

"بابا جی! میرے لیے کوئی حکم ہے؟"

راضیہ تو ویسے ہی گولہ باری کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔

"بابا جی؟..... کیا کہا میں بابا ہوں یاد ہو جس کو تم نے سالوں اپنے گھر کے چکر لگانے پر مامور کیا ہوا ہے۔ جس نے تمہاری خاطر نولاکھ بال لگوا کر سر پر نولکھا ہیر اسٹائل تک بنوا لیا پر تم سے فیصلہ نہ ہوا۔"

رضیہ کی گرج پر پھپھو مزید سہم گئیں۔

"بابا جی دو بیاہی لڑکیوں کا باپ ہے۔ آج شادی کروں گی تو فوراً نانی بھی بن جاؤں گی۔ فیصلہ کیسے کرلوں۔"

"ریڈی میڈ فیملی ملے گی ایک بیٹی سعودیہ میں ہے تو دوسری کینیڈا میں، کھلا آپشن ہے، چاہو تو دین سنوار لو یا دنیا......اب اس عمر میں کون سا دوسرا رشتہ آئے گا جو انتظار کرو۔"

باتوں میں ایسا کڑوا سچ تھا کہ روشنی پھپھو کو شک تک نہ گزرا کہ بولنے والی راضیہ خود ہے۔

"رشتے کا ارمان اب کہاں۔" انہوں نے خود کو بچانے کے لیے کہا۔

"نہ بی بی! یہ جھوٹ نہ بولو۔ یہ چم چم کپڑے فرلانگ بھر کا گلاب کے پھول والا کلپ اور مٹھی بھر بھر پاؤڈر جو تم لگاتی ہو۔ یہ دل کے ارمانوں کا پول کھول کر رکھ دیتے ہیں۔"

"سالوں سے بھائی کی سرپرستی میں بیٹھی ہوں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلوں۔" روشنی پھپھو نے جتنے دبے لفظوں میں کہا راضیہ اتنی ہی بھڑکی۔

"آ گئی نا دل کی بات زبان پر، بھائی کے گھر میں ہاتھ ہلائے بغیر جو ہر چیز مل رہی ہے تو ایسا ہی لگے گا کہ من وسلویٰ اتر رہا ہے۔ مگر اعمال کی جگہ چربی چڑھنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے رزق میں کھوٹ ہے۔ نہیں کرنی شادی تو اس عرق گلاب والے کو امید تو نہ دلاؤ، کتنی محبت سے اس کا کینیڈا والا داماد جھریاں مٹانے کی خاص کریم تمہارے لیے ڈھونڈ کر لایا تھا اب وہ ہر ایک کے لیے تو یہ نہیں کرتا ہوگا۔ پر سب تمہارے لیے کیا تاکہ اس کے سسر کا گھر بھی بسے۔ اس کی بیوی بچے بھی سال میں ایک دفعہ تو جا کر ننھیال کی شکل دیکھیں۔"

"لیکن بابا جی۔" روشنی پھپھو سہمی کھڑی تھیں۔

"سر کا تاج بناؤ یا سر سے اتار پھینکو مگر فیصلہ کرو۔"

☆☆☆

سالوں کا جمع کیا غبار دھونے کا سنہری موقع ہر ایک کو نہیں ملتا راضیہ کو ملا تو اس نے بے خیالی میں ہی اس کا ایسا فائدہ اٹھایا کہ دس سالوں کی کسر پوری کر دی۔ نادان ڈاکٹر یہی سمجھتی رہی کہ اس بار اثر انجکشن سے راضیہ کی طبیعت سدھری۔ حقیقت تو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔

"یہ لو بیٹا ہمت کرو کھالو۔" وہ گھر آئی تو آسیہ بی بی نے سلسلۂ تیمارداری بڑے کے قیمے کے کباب سے ہی جوڑا۔

"کیسی پیلی رنگت ہو رہی ہے۔ اس روز اسپتال میں تو لال چہرہ ہو گیا تھا اور ایسی عجیب عجیب باتیں کیں میں تو پریشان ہوگئی۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے بڑی مشکل بیماری تھی وہ تو اللہ نے بچایا۔"

آسیہ بی بی پھر جو راضیہ کی کہی باتیں سنانے لگیں تو راضیہ کو یقین نہ آیا کہ غنودگی میں وہ یہ سب کہہ بیٹھی تھی۔ پھر باقی قصہ روشنی پھپھو کی زبانی سنا تو دل ہی دل میں ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

قسمت سے اس کو اپنی بیماری کا حال کچھ یاد نہیں تھا اور اگر یاد رہتا بھی تو صاف مکر جاتی۔ اب اتنے سالوں میں کچھ تو سیکھنا تھا اپنے سسرالیوں سے۔ آسیہ خالہ پہلے سے سلجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ روشنی پھپھو نے بھی عمر کے حساب سے بناؤ سنگھار کر رکھا تھا اور راضیہ منہ پر آئی ہنسی روکے صرف دل میں ہنس رہی تھی جہاں ایک کے بعد دوسرا قہقہہ بلند ہو رہا تھا۔

ایک شہروز تھا جو کچھ نہیں بھولا تھا اور یہ بات اس کی خاموشی اور نظریں چرانے سے واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

راضیہ دوائیوں کے اثر میں بہت گہری نیند سوئی اور صبح اٹھی تو شہروز کو دیکھ کر سر چکرا گیا۔

وہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہا تھا۔ کئی شرٹیں دیکھنے کے بعد اس نے ایک لال شرٹ نکالی جس پر سفید رنگ کے ڈاگ فلاورز بنے تھے۔

چلتے پھرتے تو وہ شرٹ بے ضرر سی پھولوں والی شرٹ لگتی تھی مگر جب اسے پہن کر بیٹھا جاتا تھا تو ڈاگ فلاورز کے اوپر ایسی سلوٹیں پڑتی تھیں کہ لگتا تھا خونخوار کتے بنے ہوئے ہیں جن کی چیر پھاڑ سے شرٹ ایسی لال بھبوکا ہوگئی ہے۔

راضیہ کا دل چاہا شہروز کو ٹوک دے۔ پر گلا خشک ہو گیا تھا۔

یہ شرٹ اس نے چار سال سے نہیں پہنی تھی راضیہ کو پوری امید تھی کہ اب بڑھی ہوئی توند کے اوپر والے بٹن بند ہی نہیں ہوں گے۔ شہروز نے بغور راضیہ کی اڑتی ہوئی رنگت دیکھی اور کمال سکون سے شرٹ پہن کر پہلا بٹن بند نہیں کیا۔

''حد ہوگئی اگر مجھ پر نہیں اچھی لگ رہی تو کہہ دو' نہ بولنے سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔''

''اگر بولی تو سننے والے کی صحت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔'' راضیہ نے یاد کروایا۔

''جانتا ہوں۔ شروع میں تم اصلاح کرنا چاہتی تھیں تو میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا تھا پر اب تو ہم وہ مرحلے طے کر چکے ہیں۔ تنقید نہ کیا کرو صحیح کر دیا کرو راضیہ رانی۔'' شہروز محبت سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''مجھے یہ پتا ہی نہیں تھا کہ کتنے ارمان اور خواہشیں تھیں۔'' شہروز کچھ جذباتی ہوا۔

''بولنے کا نقصان بھی تو ہے۔ لگتا ہے بے خیالی میں آپ کا دل دُکھا دیا ہے۔'' راضیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کئی برائیاں گنوائیں پر ایک فائدہ بھی ہو گیا۔ تم نے سالوں بعد محبت کا اظہار بھی کر دیا۔ ہاں بس اظہار محبت میں دلائل کم اور ثبوت زیادہ تھے۔'' شہروز دل کا بہت اچھا تھا اب بھی مثبت پہلو دیکھ رہا تھا۔

''تو آپ خفا نہیں؟'' اس نے تسلی کی۔

''نہیں اور آئندہ بھی نہیں ہوں گا۔'' شہروز نے دلاسا دیا۔

''اچھا آزماؤں؟ بولیں مستنصر حسین تارڑ۔''

راضیہ نے پرکھنا چاہا تو شہروز کھسیانا ہوا۔

''اس کو رہنے دو، پہلے میری انگریزی بہتر کروا دو۔ پھپھو نے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے اور مجاہد انکل سے منہ دکھائی میں کینیڈا کا ویزا مانگا ہے۔''

راضیہ اس خبر پر خوشی سے اچھل ہی پڑی۔

☆☆☆

''میں نے مجاہد کا اتنا بڑا کام کروایا ہے۔'' آسیہ بی بی نے دونوں ہاتھ روشنی پھپھو کی جسامت جتنے کھول کر بڑے کی وضاحت کی۔ ''میں تو ان سے سونے کے کڑے لوں گی۔''

روشنی پھپھو نے شرماتے ہوئے اپنی اماں مرحومہ کے سنبھالے کپڑوں کی تہہ کھولی تو فنائل کی دو گولیاں گود میں آ گریں۔

''اور میں سونے کی پازیبیں لوں گی۔'' ہائے رے ارمان عمر کے ساتھ مزید بڑھ جاتے ہیں۔

''لوبلی کے گلے میں گھنٹی چاہیے ہوتی ہے۔ ہتھنی کے پیروں میں پازیبیں نہیں ہوتیں ۔ ان قدموں کی دھمک سے زمین لرز کر خود ہی بتا دیتی ہے کہ تشریف آوری ہے۔'' آسیہ بی بی نے تمسخر اڑایا۔

''جتنا مرضی جل کڑھ لو بھابھی۔ میرے نصیب میں شگنوں کی مہندی بھی لکھی ہے اور گھوڑی پر بارات کا آنا بھی۔'' وہ ذہنی طور پر ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔

''نہ بابا! اب گھوڑی کی فرمائش نہ کر دینا پتا لگے گھوڑی دولہا کو لے کر آگے دوڑ گئی اور دولہا کے بال پیچھے ہی رہ گئے۔''

راضیہ پاس ہی بیٹھی تھی فوراً بولی۔

''میں تو سوچ رہی ہوں جوتا چُرائی کی جگہ وگ چرائی کروالیں تو زیادہ منافع ہوگا۔''

بے اختیار بول کر اس نے ڈر کر دونوں بزرگ خواتین کو دیکھا۔ آسیہ بی بی ہنس دیں اور روشنی پھپھو نے گھور کر دیکھا پھر رات آئی بات گئی ہوگئی۔

✿

"ایک... دو... تین..."
ننھی معصومہ نے جب نئی نئی گنتی سیکھی تو پہلی چیز
جو اس نے گنی، وہ تھیں اس کے باپ کے ماتھے کی
سلوٹیں۔ نجانے کیوں اسے سب سے پہلے یہی چیز
قابل توجہ لگی۔ شاید اس لیے کہ اس نے ہوش
سنبھالتے ہی ماں کو گھڑی کی سوئیوں اور باپ کے ماتھے
کی سلوٹوں کے حساب سے حرکت کرتے دیکھا۔ وہی
دو نفوس تھے جو اس کے کورے کاغذ سے دماغ کے لیے

تختۂ سیاہ بھی تھے اور کتاب کا پہلا ورق بھی۔

اس نے سنا وہ اپنی ماں سے مشابہ ہے تو آئینے کے آگے جم گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، لیکن نقوش مشابہ ہونے کے باوجود کہیں کچھ کمی سی لگی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ وہ بلا اجازت، بے وقت ماں کے کمرے میں داخل ہونے کی جسارت کر بیٹھی۔ اس کی ننھی کوری آنکھوں نے جو دہشت ناک منظر دیکھا، اس نے اس کے معصوم چہرے پر وہی نقش چسپاں کر دیا جو اس نے ہمیشہ اپنی ماں کی رنگت میں گھلا دیکھا تھا۔ پہلی بار وہ تشدد کے مفہوم سے آگاہ ہوئی تھی۔

پہلا نقش پہلے تاثر کی طرح دائمی ہوتا ہے۔ وہ کمی جو اسے اپنے اور ماں کے چہرے کی مشابہت میں نظر آیا کرتی تھی، وہ پوری ہو گئی۔ تب اس نے جانا کہ وہ کمی خوف کی تھی۔ اس کی ماں نے اسی وقت پلٹ کر اپنے وجود کا حصہ بنے خوف کو اس کے معصوم وجود تک کا سفر کرتے دیکھ لیا۔ لیکن بے بسی اس کا مقدر ٹھہری۔ وہ یوں اچانک نہ آتی تو باپ کے غضب ناک تیور اور ماں کے بے بس آنسو سب راز ہی رہتے۔

معصومہ کا دائرہ فکر ماں کے چہرے سے پھیل کر باپ کے چہرے تک پہنچا تو تب وہ پہلی بار اس کے ماتھے پر استری سے جمائی لکیر کی مانند پڑی پکی سلوٹوں سے متعارف ہوئی۔ تین موٹی سلوٹیں، جو بڑھ کر پانچ چھ تو ہو جاتیں، لیکن گھٹ کر دو ہوتے یا معدوم ہوتے دیکھنے کی اس کی خواہش، حسرت ہی بن گئی۔

اس روز سے اس نے اپنی زندگی کی پہلی پہلی کتاب کے اوراق پلٹنے شروع کر دیے۔ وہ روز ایک نیا ورق پڑھتی اور ایک نیا درس لیتی۔ اسے نصابی کتب سے زیادہ گھر میں چلتی پھرتی ان دو ضخیم کتب میں دلچسپی تھی کیونکہ نصابی کتب آسان اور بچکانہ تھیں اور وہ تو بچپن میں ہی بڑھاپا جھیل رہی تھی۔ وہ اکثر سوچتی کہ جب دنیا میں رنگینی نہیں تو نصاب بنانے والے کیوں کتابوں میں اتنی رنگینیاں بھر کر بچوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔

اس نے تو اپنی حقیقی زندگی میں صرف دو ہی رنگ دیکھے تھے۔ ایک سنہرا، دوسرا سیاہ۔

✲ ✲ ✲

جب سورج طلوع ہوتا اور اس کا باپ دفتر چلا جاتا تب گویا ہر شے پر سورج کا سنہرا پن بکھر جاتا۔ ہر شے نکھری ستھری، پرسکون اور آرام دہ حالت میں نظر آتی۔ یوں لگتا جیسے سورج کائنات کی ہر شے پر الگ الگ طلوع ہوا ہو۔ تب اس کی ماں کی گندمی رنگت میں بھی سنہرا پن گھل جاتا اور وہ سونے ایسی چمکنے لگتی۔ اسے سورج کے طلوع و غروب کا منظر افق سے زیادہ اپنی ماں کے چہرے پر دیکھنا بھلا لگتا۔ وہ خاموش لب لیے کبھی کام کاج کرتی، کبھی فرصت سے بیٹھی موتیا کے گجرے بناتی، کبھی کتابیں رسالے پڑھتی، لیکن معصومہ کو لگتا وہ گنگنا رہی ہے۔ اسے ماں کی چال میں رقص کے رمز چھپے نظر آتے۔

نہ جانے یہ حقیقت تھی یا اس کے تخیل کی پرواز، لیکن جوں جوں سورج اپنی اگلی منزل کی جانب جھکتا جاتا تو زمین پر چادر کی طرح تن جانے والی سیاہی اتنی ہی تیزی سے اس کی ماں کے چہرے پر بھی بسیرا کرتی جاتی اور وہ سارا دن یہ مناظر دیکھتے نہ تھکتی۔ اسے ٹی وی سے زیادہ ماں باپ کے چہروں کی اسکرین دلچسپ لگا کرتی جن پر وہ سراب بھری رنگینیوں کے بجائے حقیقت کی سیاہی دیکھا کرتی۔ حقیقت بے رنگ و بے کشش ہونے کے باوجود اسے اپنی جانب کھینچتی۔ ماں کے چہرے پر بدلتے موسم اور باپ کے ماتھے کی بڑھتی سلوٹیں اس کے دماغ پر تربیت کے نقش جماتی رہتیں۔

لیکن پھر وہی سورج چھٹی کے روز گرہن زدہ لگتا۔ اس روز نہ تو وہ اس کے گھر کو منور کرتا نہ اس کی ماں کے چہرے کو۔ اس روز باپ کے ماتھے کی سلوٹیں گھٹا کی صورت پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتیں۔ وہ سوچتی رہتی، الجھتی رہتی، لیکن اس گتھی کو سلجھا نہ پاتی کہ آخر ایسا ہوتا کیوں ہے۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کی سمجھ میں آتا گیا کہ ماں کے چہرے کے بدلتے موسموں کے پیچھے اس کے باپ کا ہاتھ ہے۔ ماں کے چہرے کو باریک بینی سے پڑھتے رہنے کی تو اسے بچپن سے عادت تھی پر اب وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ پرکھنے کا کام بھی کرنے لگی۔ وہ سورج کا ڈھلنا نہیں تھا جو اس کی ماں کے چہرے کو تاریک بنا تا تھا' وہ دراصل اس کے باپ کی گھر آمد کا شاخسانہ ہوتا تھا۔ اس سے وہ سنہری کے بعد آنے والے سیاہ رنگ سے ملاقات کرتی جو اس کی ماں سمیت اس کے چہرے کا دیدہ دلیری سے احاطہ کرلیتا۔ پھر وہ چوری چوری باپ کے چہرے کو پڑھنا شروع کرتی۔ دونوں کے چہروں میں ایک فرق تھا اور ابھی وہ سمجھ داری کے اس درجے پر نہیں تھی کہ فرق کی نوعیت کو جان پاتی۔ وہ بس فرق کا ہونا محسوس کرتی تھی۔

یوں ہی پڑھتے اور بڑھتے وہ کالج پہنچ گئی۔ تب اسے ان دونوں کے چہروں میں موجود فرق کی نوعیت بھی سمجھ میں آ گئی۔ ماں کے چہرے کے خوف زدہ تاثر سے وہ بچپن سے آشنا تھی لیکن جب وہ نئے نئے الفاظ سے روشناس ہوئی تب اس نے جانا کہ اس کے باپ کے چہرے پہ سجے تاثرات کو نفرت' بے زاری اور نخوت کہتے ہیں۔ اس کی ماں تو ان جذبات کا نشانہ بنی رہی اس لیے واقف تھی' لیکن وہ نا آشنا اس لیے تھی کیونکہ اس کا اور باپ کا تعلق ان جذبات کا نہیں تھا۔ ان کے مابین بس ایک تعلق تھا۔ اجنبیت کا۔ جب وہ جذبات اور چہروں کو پرکھنے کی حدود سے نکل کر رشتوں کو پرکھنے کی سطح پر آئی تب اس نے جانا کہ اس کے ماں باپ کے علاوہ جتنے بھی لوگ ازدواجی تعلق میں بندھے تھے' ان کے بیچ نظر آنے والا ربط اس کے ماں باپ کے بیچ ندارد تھا۔

لاکھ وہ سمجھ دار ہو گئی لیکن اپنے باپ کے اس ناروا سلوک کی وجہ نہ سمجھ پائی جو وہ اس کی ماں کے ساتھ رکھتا تھا۔ جتنی دیر وہ گھر میں گزارتا' اس کی ماں کی سیاہ آنکھوں کے سفید فرش نم رہتے اور چہرہ مرجھائے

ہوئے گلاب جیسا سیاہی مائل۔ ان کے بیچ عام میاں بیوی جیسا تعلق کیوں نہیں؟ وہ بے تکلفی اور التفات کیوں نہیں؟ بے زاری اور دوری کیوں ہے؟

یہی سوالات اس کے دماغ میں چک پھیریاں کھاتے رہتے۔

اماں کوئی بھی بات کرنے سے پہلے سو بار سوچتیں پھر ڈر ڈر کر مدعا بیان کرتیں مگر نتیجہ پھر بھی شیر کی دھاڑ اور نفرت آمیز جواب کی صورت نکلتا۔ ساتھ کچھ گالیوں کوسنوں کا تڑکا اور نصیبوں کا رونا اضافی ہوتا۔ باپ کا موڈ اچھا بھی ہوتا تو بھی ماں کی کسی بات پر یوں بگڑ جاتا جیسے اسے بہانے کی تلاش ہو۔ جیسے وہ اچھے مزاج سے رہنا ہی نہ چاہتا ہو۔

گزرتے وقت کے ساتھ اس نے ایک اور عجیب بات نوٹ کی۔ اپنی بیوی کے سوا دوسری ہر عورت کے ساتھ اس کے باپ کا رویہ انتہائی شائستہ اور مہذب ہوتا۔ دوسروں کے سامنے اپنی بیوی سے بھی شائستگی سے پیش آتا۔ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور انداز اتنا دلکش ہوتا کہ وہ اسے دیکھتے دیکھتے کھو سی جاتی۔ اسے گمان ہوتا کہ اب وہ اسی انداز میں بات کیا کرے گا لیکن منظر بدلتے ہی سب کچھ پھر پہلے جیسا ہو جاتا اور وہ مزید الجھ جاتی۔ اس کے اندر "کیوں" کی تکرار بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے باپ کا اصل چہرہ کون سا تھا؟ اور وہ ہر وقت اپنی اصل میں کیوں نہیں رہتا تھا۔

اس کے باپ کا غصیلا چہرہ صرف گھر والوں کے لیے کیوں تھا؟

اس کا دلکش چہرہ صرف باہر والوں کا مقدر کیوں تھا؟ جبکہ یہ حق تو گھر والوں کا تھا۔

حق.....؟؟

ہاں وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ حق کو پہچاننے لگی تھی۔ اب تک وہ صرف فرائض کو سمجھتی پہچانتی اور پورا کرتی تھی لیکن اب اسے حقوق کا ادراک بھی ہونے لگا تھا۔ وہ دن دور نہیں تھا جب وہ حق کے لیے آواز بھی بلند کرلیتی۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کی

مکمل زبان بندی کا انتظام کر لیا گیا۔
اس کی ماں نے جانچ لیا کہ اب معصومہ کے سوالات آنکھوں سے نکل کر لبوں پر آیا ہی چاہتے ہیں اور اسے اپنی رسوائی گوارا نہ تھی اس لیے اس نے معصومہ کی شادی طے کر دی۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ لیکن یہ اس کی ماں کی خام خیالی تھی کہ وہ یوں اسے گھر سے نکال کر ممکنہ سوالات سے بچ جائے گی۔ بچپن سے جو خوف کا بیج اس کے اندر نمو پا رہا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا تھا اور اس کی نکلتی شاخوں کو دنیا میں سامنے کے لیے وضاحت کا میدان درکار تھا۔ ورنہ درخت جل جاتا پر پھل نہ دیتا۔

✡ ✡ ✡

معصومہ بھی ماں کے آگے تن کر کھڑی ہو گئی کہ وہ تب تک شادی نہیں کرے گی جب تک وہ شادی کے بندھن کی اصل روح سے واقف نہیں ہو جاتی۔ آخر اس نے بچپن سے شادی کے نام پہ گھر میں جو ڈراپا چلتا دیکھا تھا' وہ بھی اس کا مرکزی کردار بننے جا رہی تھی تو اس کے لیے خاصی ہمت درکار تھی جو حقیقت جانے بنا ممکن نہیں تھی۔ وہ لمحہ پھر بھی عفریت بنا اس کے سامنے آکھڑا ہوا جس سے وہ بچنا چاہتی تھی لیکن حقیقت سے فرار نادانی کے سوا کچھ نہیں۔
"اگر شادی ایسے بندھن کا نام ہے جیسا آپ اور بابا کے بیچ میں ہے تو ایسی شادی سے میں کنواری ہی بھلی۔"
معصومہ کے الفاظ اتنی پختگی تک کب پہنچے اسے خبر نہ ہو سکی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟" یہ سوال کرتے ہوئے اس کی ماں کی آواز بیٹھ سی گئی۔
"امی! میں آج تک جان نہیں پائی کہ شادی کیسا تعلق ہے؟ وہ جیسا آپ اور بابا کے بیچ ہے یا وہ جو ساری دنیا کے جوڑوں کے بیچ ہے؟ میرا دماغ اس بندھن کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ مجھے ایسی کوئی منطق دیں جو مجھے اس بندھن کو اہم سمجھنے میں مدد دے۔"
وہ یوں جرح کرتی وہ پہلے والی معصوم سی معصومہ تو ہرگز نہ لگ رہی تھی۔
"میری پوری دنیا آپ دونوں تھے' ہیں' اور رہیں گے اور میری دنیا روز اول سے بے رنگ و نور رہی۔ مجھے لگتا ہے باقی لوگ جن کی زندگیاں بظاہر رنگین اور خوش باش نظر آتی ہیں گھروں کے اندر پرائیوسی میں وہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے آپ دونوں۔ میری دنیا نے مجھے بتایا کہ زندگی بدصورت اور ہولناک ہے۔ زندگی صرف آنسو دان کرتی ہے۔ زندگی میں سیاہ اور سنہری کے سوا کوئی رنگ نہیں۔ اصل زندگی صرف وہ ہے جو لوگ دوسروں کے سامنے ——— پوز کرتے ہیں۔ میری دنیا نے مجھے زندگی کے اتنے متضاد پہلوؤں سے متعارف کرایا کہ میں آج تک دنیا میں عورت کے وجود کا مقصد اور اہمیت سمجھ نہیں پائی امی۔ میں سمجھ نہیں سکی کہ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں۔"
اس کی آواز میں زمانوں کے دکھ لیے ہوئے تھے۔
ماں کے چہرے پر پہلی بار اسے ایک تیسرا رنگ نظر آیا۔ سفید..... جسے رنگوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ موت کی علامت ہے اور اس کی ماں بھی موت کی سی کیفیت سے ہی گزر رہی تھی۔ عمر کی نقدی لٹ رہی تھی۔ بیٹی کے سامنے سنبھال سنبھال کر رکھی گئی عزت خاک ہونے جا رہی تھی۔
"ساری دنیا کے مرد ایک سے نہیں ہوتے نہ ہی ہر ایک کی ازدواجی زندگی ایسی ہوتی ہے' بہت سے لوگوں کی زندگیاں ویسی ہی خوب صورت ہوتی ہیں جیسی دنیا کو نظر آتی ہیں۔ اسفندیار بھی ایسا نہیں۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔" اس نے بمشکل تمام یہ الفاظ جوڑے لیکن معصومہ کے اگلے جملے نے اس کے حوصلے توڑ ڈالے۔
"تو کیا بابا اچھے مرد نہیں؟"

جوان خون لاجواب کر دیتا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری مگر پھر بھی ہونٹ خشک رہے' بے جان سے اس کی ہمت کی طرح۔

"یوں سمجھو تمہاری ماں ہی اچھی عورت نہیں۔"
یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں پچھتاووں کے ہزار رنگ جھلکے۔

"چلیں مان لیا اسفندیار ایسا نہیں ہو۔ تو پھر آپ دونوں ایسے کیوں ہیں؟ اس سوال کے مناسب جواب پر ہی میرے فیصلے کا دارومدار ہے۔ میری زندگی آپ جیسی نہیں ہو گی اس کے لیے مجھے کوئی تو گارنٹی چاہیے۔"

"رشتوں کی گارنٹی نہیں ہوتی بیٹا' لیکن اپنے رویوں کی ہوتی ہے۔ تمہاری اچھی زندگی کا دارومدار تمہارے اپنے رویے پر ہے، جو تمہاری اگلی زندگی میں شامل رشتوں کی بقا اور خوب صورتی کا ضامن خود ہو گا۔"

"تو کیا آپ کا رویہ اچھا نہیں تھا بابا سے؟" اس کے الفاظ و انداز کی کاٹ نے اس کی ماں کو لہولہو کر دیا۔

"یوں ہی سمجھ لو....."

بالآخر پچیس برس بعد اس نے زبان پر لگی چپ کی مہر اپنی بیٹی کی خاطر توڑ ڈالی۔ کیونکہ اب معاملہ اس کی ذات کے دائرے سے نکل کر اس کی اولاد تک جا پہنچا تھا۔ جو چیز ان دونوں کے رشتے کے بیچ کشیدگی اور تناؤ کا باعث بنی رہی' ماں نے وہ اچھی طرح اسے سمجھا دی۔

وہ قائل ہوئی یا نہیں البتہ شادی کے لیے قائل ہو گئی۔

اسفندیار واقعی اچھا مرد تھا۔ لیکن وہ اسے باپ کے ہی ترازو میں رکھ کر تولتی اور جب آئینہ دیکھتی تو اپنے چہرے میں ماں کا چہرہ تحلیل ہوتا ہوا پاتی۔ خوف زدہ' زرد اور کبھی سیاہ۔ اسفندیار کا مزاج دوستانہ تھا' وہ اس کے باپ جیسا بالکل بھی نہیں تھا' اسے دوست مانتا تھا لیکن وہ بچپن کے خوف میں یوں مقید تھی کہ اس پر بھروسا کر لینے کے باوجود خول سے نکل نہ پاتی۔ ایک قدم اس کی جانب بڑھاتی تو دو قدم اس کا دل پیچھے ہٹنے لگتا۔ وہ بے حد فرمانبردار بیوی بنی' ایک آواز پہ بھاگی چلی آنے والی۔ ایک پکار پہ لبیک کہنے والی اور اضافی خوبی یہ کہ..... ایک نگاہ پہ اپنا آپ نچھاور کرنے والی۔ خواہ وہ تھکی ہوئی ہوتی یا بیمار ہی کیوں نہ ہوتی۔

کبھی کبھی اسفندیار کو اس پہ کٹھ پتلی کا گمان ہوتا۔ وہ اس کی ابرو کے اشارے پر چلتی لیکن اس فرمانبرداری میں محبت کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ باندی کے تکمیل حکم جیسا انداز ہوتا۔ جو اسفندیار کو خوشی کے بجائے عجیب سی شرمندگی میں مبتلا کر دیتا۔

دیکھا جاتا تو وہ آئیڈیل بیوی والے تمام اوصاف سے مالا مال تھی لیکن جیسے کسی قفس کے پنچھی کی مانند۔ کسی زر خرید کی مانند۔ وہ چاہتا کہ وہ خود کھلے لیکن وہ منہ بند سیپی بنی رہتی۔

اس نے بے اعتنائی بھی برتی لیکن معصومہ نے نچھاور ہونا ترک نہیں کیا۔ معمول میں شامل کسی فرض کی طرح۔

اسے اس کی محبت درکار تھی' رٹے ہوئے سبق جیسا پیار نہیں' جو بچہ استاد کے ایک اشارے پر سنانا شروع کرتا ہے تو مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اسے معصومہ کا التفات ایسا ہی لگتا۔ وہ چپ چپ رہنے لگا۔

یہی وہ دور تھا جب معصومہ کو اس کے چہرے میں اپنے باپ کا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس کے شفاف ماتھے پر نادیدہ بل نظر آنے لگے۔ وہ مزید اس کے قریب ہونے لگتی اور وہ مزید دور ہو جاتا۔ تب اسے اپنی سیاہ بختی کا یقین ہو گیا۔

آسان نہیں ہوتا باندی بننا یا بیوی بننا۔ اسے دونوں منصب مترادف لگتے۔

وہ ماں جیسی نہیں بننا چاہتی تھی اور اس سعی میں خود کو مار رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ماں کیوں دکھی رہتی تھی۔ پہلی بار اسے ماں سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"یہ بہت مشکل ہے امی۔" وہ روئی۔

"ہاں لیکن ناممکن نہیں۔" وہ کہتیں۔

اور وہ شکوہ کناں نگاہیں ماں کے آنگن میں بو کر پھر سے وہی روز و شب جھیلنے آ جاتی۔ جانے وہ ماں کی عینک آنکھوں پر جمائے کیوں بیٹھی تھی۔ وہ ایک دن بھی اپنی بصارت کو زحمت دیتی تو معاملات مختلف ہوتے۔ ماں کی سوچ کی چادر اوڑھے وہ چند ماہ میں ہی تھکنے لگی۔ جس کام میں محبت شامل نہ ہو وہ لمحوں میں

تھکا دینے کا کمال رکھتا ہے۔

جس روز اسے اپنے وجود میں نئی کونپل کے پھوٹنے کی خبر ملی وہ ادھ موئی ہو گئی۔

"کیا ایک اور معصومہ کا جنم ہونے جا رہا ہے؟"

اس کے خوف کا دھارا سمت بدل گیا۔ اب وہ سارا سارا دن نئی روح کے مستقبل کا نقشہ بناتی اور روتی رہتی۔ ماں کے پڑھائے اسباق بھلائے وہ اپنے نئے غم میں ڈوب کر اسفندیار کو فراموش کر گئی۔ نہ اسے اپنے کھانے پینے کا ہوش رہا نہ اسفندیار کے۔ نہ اپنے سکھ چین کی فکر رہی نہ شوہر کے سکون قلب و جاں کا ہوش۔ وہ لحہ لحہ بکھرنے لگی۔

اسفندیار نے اس کی توجہ کا محور بھٹکتے دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ اسے عادت تھی اس کے التفات کی خواہ زبردستی کا ہی سہی۔ اسی کیفیت میں لکا چھپی کھیلتے کھیلتے دن رات گزرنے لگے۔ اس روز بھی جب رات نے اپنا پھن پھیلایا تو اسے کمرے میں جانے سے وحشت ہونے لگی۔

زبردستی کی محبت جتانا آسان نہیں ہوتا۔ دو دھاری تلوار پر چلنے جیسا ہوتا ہے۔ ماں کے پڑھائے سبق میں الجھ کر شادی کر بیٹھی لیکن اب نبھانا محال تھا۔ وہ مہیب تاریکی کا حصہ بننے کی خواہش دل میں لیے تاریک برآمدے میں بیٹھی آسمان پر ٹکے مقیش کے دانے گن رہی تھی جب اسفندیار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور کمرے میں لے جا کر ہی چھوڑا۔ اس کے چہرے پر بے زاری دیکھ کر اسفندیار کے چہرے پر الجھن ابھری۔ معصومہ کے معصوم چہرے پر اسے پہلی بار اپنے لیے نفرت دکھائی دی تھی۔ وہ بری طرح الجھا۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے معصومہ' کیوں میرا امتحان لے رہی ہو؟" اس کے انداز میں بے بسی تھی۔

"تھک گئی ہوں میں یہ ناٹک کرتے کرتے بس کر دو اب۔" وہ جیسے آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑی۔ اسفند کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں۔

"کیسا ناٹک؟"

"یہ پیار محبت کا ناٹک۔۔۔۔ روز آزماتے ہو' اب معاف کر دو مجھے اس محبت سے۔ یہ میرے مزاج کا حصہ ہی نہیں۔ اگر شادی اسی بندھن کا نام ہے تو مجھے معاف کرو خدا کے لیے۔" اسفندیار کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ کیسا زہر بھرا ہے تمہارے اندر۔ تم محبت کو کیا سمجھتی ہو' تم شادی کو ـــــ سودا سمجھتی ہو؟ میں تو تم سے سچی محبت کرتا ہوں اور بدلے میں اسی پاک جذبے کا طلب گار ہوں۔ کیا تم نے اس بندھن میں پاکیزہ محبت محسوس نہیں کی؟ کیا تمہیں صرف ایک ہی عنصر نظر آیا؟ اگر صرف یہی رخ ہوتا محبت کا تو کیا میں تمہارے چہرے کی پریشانی کو اپنے دل میں چبھتا محسوس کرتا؟"

معصومہ اگر آئینہ دیکھتی تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کا چہرہ ہزار رنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جن میں سب سے نمایاں استعجاب کا رنگ تھا۔ اس کے لیے اسفندیار کے جملے انوکھے تھے غیر متوقع اور ماورائی۔

"کیا محبت بھی ہوتی ہے اس بندھن میں؟" اس کی آواز جیسے کنویں میں سے برآمد ہوئی۔

"محبت ہی تو ہوتی ہے معصومہ! تم نے اپنے اور میرے بیچ ایسی دیوار کھڑی کر رکھی ہے جس کے پار میں تمہیں چھو کر بھی دل سے محسوس نہیں کر پاتا۔ ایسا کیوں ہے معصومہ؟ میں تمہیں اپنے دل میں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم ایسا نہیں چاہتیں؟" اس نے نرمی سے معصومہ کے ہاتھ تھامے۔ وہ کھوئی ہوئی تھی۔

"کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟ کیا مرد' عورت سے محبت بھی کرتا ہے؟ کیا اس بندھن میں محبت کی گنجائش بھی نکل آتی ہے؟"

اسفندیار اس کا مسئلہ سمجھ کر مسکرایا۔

"محبت نہ ہوتی تو مرد شادی ہی کیوں کرتا۔ اپنے دل سے پوچھو۔"

اس کے والدین اس کا ماضی تھے' شوہر حال بھی تھا اور مستقبل بھی۔ وہ جو نقش جماتا وہ آخری اور دائمی ثابت ہوتا۔ ہمیشہ پہلا تاثر دائمی نہیں ہوتا۔ وہ اس آخری نقش کو اپنے دل پر کندہ ہوتا محسوس کر رہی تھی۔

ناولٹ

"وقت کتنی جلدی گزر گیا ناں زہرہ باجی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ بلقیس باجی کی شادی ہو گئی، اذکار بھائی محکمہ ٹیکس میں بہت اچھی پوسٹ پر ہیں، بلقیس باجی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کنیز باجی بینک میں — ہیں، اب تو زونل منیجر ہو گئی ہیں۔ جس دن باجی کو پروموشن لیٹر ملا اس دن ابا خوش تھے۔

خیر...... میں یہ بتانے آئی تھی کہ میری شادی ہے اگلے ماہ۔

"ہاں بولو۔" زہرہ نے فون ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"اماں کہہ رہی ہیں کہ آپ آجائیں تو فاطمہ کے لیے ایک دو رشتے ہیں، ان کو بھی فائنل کر لیں۔ فاطمہ کا بھی یہ ایم بی اے کا آخری سال ہے۔"

"اچھا دیکھو، میں جلدی آنے کی کوشش کرتی ہوں۔" زہرہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

☆❁☆

نازیہ رزاق

"اچھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"زہرہ باجی! میری شادی میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں اور آپ ابھی تک نہیں آئیں۔ شادی کے فوراً بعد تو میں اور صائم اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ چلے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں آپ آئیں تو ہم دل بھر کر باتیں کریں۔"

"اچھا اور یہ جو روز فون پر اتنی باتیں کرتی ہو وہ کیا ہے؟" ریسیور کے دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

"بھاء! سامنے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنا اور ہے اور فون پر اور...... اچھا آپ باجی کو فون دیں۔" اس نے کہا۔

"لو بھئی اپنی باجی سے بات کر لو تم۔" اس نے ریسیور زہرہ کو دیا۔

"کنواریاں والا" میں غروب ہوتا سورج ارغوانی و نارنجی رنگ سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا جب "زہرہ شہباز وسیر" اپنی سکھی زرینہ کی شادی سے تھکی ہاری گھر لوٹی، وہ زہرہ تھی...... زہرہ۔

کسی عرب شاہ زادے کے محل میں آراستہ تمام کلیوں سے خوب صورت کلی...... زہرہ۔

کسی برف سے ڈھکی چوٹی پر کھلے اکلوتے پھول جیسی، زہرہ۔

قدیم یونانیوں کے مہ خانوں میں منہ تک بھرے مشروب کے مٹکوں سے زیادہ ساحرہ۔

کنواریاں والا کی سنہری زرخیز مٹی اس گواہی کے حق میں تھی کہ اس پر آج تک زہرہ سے زیادہ حسین کنواری نے پاؤں نہیں دھرا۔

شہباز دیسر کے گھر جس دن وہ پیدا ہوئی، مغرب سے سرخ گھٹا اٹھی، گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے جھاڑو چارپائیوں اور نواڑی پلنگوں کے نیچے دبا دی۔ ایک بوڑھی زہرہ کی ماں سے کہنے لگی۔

"نی تاجاں (زرتاج) نی کی آفت جمی (پیدا کی) اے، کنواریاں والا میں اج پہلی (پہلی) وار سرخ گھاٹ چڑھی اے توبہ توبہ۔"

مگر نومولود زہرہ نے بڑی بوڑھیوں کی زبان تالو سے چپکادی۔ چمپئی رنگت پر شربتی آنکھوں اور عنابی ہونٹوں والی زہرہ کے ملکوتی حسن میں رہی سہی کسر تین کنواری پھوپھیوں نے پوری کردی۔ کوئی آٹے کی لوئی بنا کر چہرے اور بدن سے رواں صاف کرتی، کوئی ہاتھ اور کلائیاں ہاتھوں سے دباتی۔ پاؤں کپڑے سے باندھ دیے جاتے، ماتھے پر وزن دھرا جاتا۔ گزرتے وقت نے بھی اس کے حسن کو بڑھاوا ہی دیا، چلتی تو کنواریاں والا کی زمین اپنے دامن میں موجود ہر لعل کو اس کے پیروں کے اطراف انڈیل دیتی۔ رک جاتی تو فطرت اسے دیکھنے کو جھک آتی، ہنستی تو گاؤں کی بوڑھیاں منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگتیں۔ مناجات کی تعداد اور ——— بڑھا دیتیں، ایسی ہی تھی وہ...... بے پناہ حسین، بے فکر، بے نیاز اور...... بے نصیب۔

☆❁☆

زہرہ نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی کے پھاٹک کو مخالف سمت دھکیلا، وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بہت بڑا آنگن تھا، آنگن کے بیچ و بیچ لگا سکھ چین کا گھنا درخت۔ پکی مٹی سے لیپا ہوا صحن، جس پر سارا دن بھی لوٹتے رہو تو مٹی کا ذرہ نہ لگے۔ پھاٹک سے چند فرلانگ دور نصب ہاتھ والا نلکا اور غسل خانہ، جب کہ آنگن کے انتہائی سرے پر موجود، قطار میں بنے چار رہائشی کمرے، ان کے آگے برآمدہ، یہ ہی تھا دیسروں کا محل۔

زہرہ نے چہار اطراف نظر گھما کے معمولات کا جائزہ لیا، وہی یکسانیت، جیسے جوہڑ کا جمود زدہ پانی' سٹراند پیدا کرتا ہوا۔ زہرہ سے چھوٹی بلقیس، پڑھائی کی شوقین، کتابوں کی رسیا، گاؤں میں موجود اکلوتے پرائمری اسکول سے پانچ جماعتیں پاس کرنے کے بعد گھر میں خود ہی اگلی جماعتوں کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ زہرہ سے سات سال چھوٹی تھی، ابھی بھی وہ کوئی کتاب کھولے سکھ چین کے درخت کے نیچے رکھی چارپائی پر بیٹھی تھی۔

قریب ہی چوتھے نمبر والی سکینہ سیاہی کی دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر تختی کو رنگتی جا رہی تھی۔ تیسرے نمبر کی کنیز جو کہ چوتھی میں تھی، سب سے چھوٹی فاطمہ کے ساتھ بیٹھی پانچ عدد ٹھیکریوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

تاجاں سرسوں کے تیل میں بینگن اور کالے چنے ڈالے تیز تیز ڈوئی چلاتی، ہانڈی بھون رہی تھی۔ پاس ہی بیٹھی نسیم چاچی بڑی سی مٹی کی پرات میں مل مل کے آٹا گوندھ رہی تھی جب کہ مہر بانو پھوپھی تنور میں بھڑ بھڑ چٹختی لکڑیوں کو مضبوط لکڑی سے نیچے کیے جاتی۔ سکھ چین کے نیچے بلقیس کے پاس ہی شہر بانو جسے وہ سب سے بڑی پھوپھی کہتی تھیں، بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ سارا دن کھیتوں میں بھنڈی توری توڑنے سے اس کے ہاتھوں پر گہرے زخم ہو گئے تھے مگر گھر آتے ہی وہ اپنے رب سے ہم کلام ہونا زیادہ پسند کرتی تھی۔

اور چھوٹی پھوپھی زر بانو یقیناً دودھ دوہنے گئی ہوئی تھی، گھر کا اکلوتا سرپرست ارباز دیسر تو کئی کئی دن گھر میں قدم نہ دھرتا۔ وہ مرد تھا، اوپر سے ذات کا دیسر، اس کی سیری کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی مہر بانو کی طرف گئی، بچپن سے ہی ہر دکھ سکھ کی سانجھ مہربانو پھوپھو سے ہی تھی۔

"آ گئی میری دھی۔" مہر بانو اپنے ماتھے پر پسینہ دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"مڑ گئی جنج (بارات) تیری سکھی کی؟"

"آہو جنج گئی...... ہائے پھوپھی! تجھے کیا بتاؤں جنج کے ساتھ آئی کنواریوں نے ایسے تیز رنگ

پہنے کہ دیکھنے والے اندھے ہونے کو ہو گئے۔ پر "وری" (بری) بوت چنگی تھی، ماتھا پٹی چڑھائی ہے جینا کو۔ جینا بھی آج منہ دھو دھلا کے گزارے لائق لگ رہی تھی' ویسے نائی نے آج زردے میں میٹھا بہت ہی گھٹ رکھا بالکل سواد نہیں آیا۔"

وہ جو شادی کی روداد سنانا شروع ہوئی تو چھوٹی بہنیں بھی تنور کے گرد جمع ہو کر سننے لگیں۔ چھوٹی پھوپھی دودھ والا گڑوا (برتن) نیچے رکھ کے رومال سے ڈھانپ کر اپنی دھوتی سمیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"نیوندرا (نیوتا) کتنا دِتا ای؟"

"تین سو...... گن کے پورے۔ جانجی حیران، خالہ بختاں صدقے واری۔ سندھوؤں کی نیلو بڑی تھانیدارنی بن رہی تھی دو سو دے کے، یہ اماں اتنی چپ کیوں ہے؟" بالآخر ماں کی خاموشی چبھی۔

"کچھ نہیں۔" اماں کا انداز بڑا کسیلا سا۔۔ تھا ڈوئی زور سے سالن میں گھمائی، سالن سوں سوں کی آواز کے ساتھ احتجاج کرنے لگا۔ نسیم چاچی چپکے سے اٹھی اور اندر سے کچھ سامان لا کر چارپائی پر ڈھیر کر دیا۔ ایک کمبل، زیتون کے تیل کا ایک بڑا گیلن، دو استریاں، ایک جوسر۔

"بلے بھئی بلے آ گئی ابا کو ہماری یاد۔" وہ اشتیاق سے سامان دیکھنے لگی۔

"یاد نہیں آئی اسے، یاد کروایا ہے۔ مجھ بد بخت کو کہ میں نے پانچ دھیوں کو جنا ہے، اری میں کیا کروں ان کمبلوں، استریوں کا۔ کون سا اس گھر سے کسی کا داج (جہیز) جانا ہے۔ یہ سب بھیجتے ہوئے وہ کیوں بُھل (بھول) جاتا ہے کہ اس کی دھیاں، کنواریاں والا، ساری کی ساری بدبختی ماتھے پر لکھوا کے آئی ہیں۔ ہائے نی زہرہ تیرا حسن دی اس پنڈ سے سیاہی نہ مٹا سکا۔"

اماں اپنا میلا سا دوپٹہ منہ پر ڈال کی سسکنے لگی، مہربانو تنور میں لکڑیاں ہلانے لگی، کندھے سے رگڑ کے آنسو صاف کیا۔ چھوٹی پھوپھو دو بالشت کی جھاڑن سے زمین رگڑنے لگی۔ زہرہ بے بس سی ہوئی۔

"اماں تُو تھکتی نہیں رو رو کے، ویں وروں (بیس برس) سے رو رہی ہے۔ تو یہ بات وی چنگی طرح جانتی ہے کہ کنواریاں والا کی ہر کنوار کے بخت ایسے ہی سیاہ ہیں۔ بس ہُن تُو چھڈ دے اس غم پر رونا، خوش رہا کر۔ اس وار کے سیال (سرما) میں یہ کمبل تُو مینوں نکال دینا۔ جہیڑے دو پچھلی بار آئے تھے وہ نکیوں کو (چھوٹیوں کو) اور یہ جو بتالی ہزار آئے ہیں ناں اس کا تو اور میں کل وڈے شہر سے سودا لاتے ہیں دو تِن مہینے دا۔ بوتا سارا خوشبوئی صابن دی، داج تو بنانا نہیں ان پیسوں سے، خوشبوئی صان کا چاہ تو پورا کریں ناں کیوں فاطمہ؟" وہ کھلکھلائی، فاطمہ کو پیار کیا، گھڑے کا پانی پی کر پراندہ جھلاتی کمرے میں گھس گئی۔ ادھر شہر بانو نے قرآن پاک سنہری غلاف سے ڈھانپتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یا ربا تُو رحیم تُو کریم...... انت کر دے اس اندھیر کا۔ جے اے عذاب ہے تو اٹھا لے اس عذاب کو، جے اے پرکھ ہے تے پورا کر دے اسے۔ ان مسلمانوں کے دل دی مسلمان کر دے مولا! میری زہرہ، میری بلقیس، کنیز، نکیاں مولا اے رنج اوہناں کوں ناں دیویں......"

شہر بانو کے جھریوں بھرے چہرے پر آنسو لہریں بناتے، باغی ہوئے اپنی حدود پیچھے چھوڑتے جاتے۔ "کنواریاں والا" کے ہر گھر کی کوئی نہ کوئی کنواری بوڑھی افق پر نظریں ٹکائے، کسی معجزے کی منتظر، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں رب کے حضور عرض لیے کھڑی تھی۔

ایسے میں شبیر لوہار کے ہتھوڑے کی آواز ہر گھر میں سُنی جاتی۔ دادو کھوجی کی گندم پینے والی چکی کی ٹک ٹک بین کرتی محسوس ہوتی اور...... دور گندم اور

مکئی کے کھیتوں میں بیٹھے گاؤں کے مرد تاش کے پتے پھینکتے ایک دوجے کو ماں بہن کی گالیاں دیتے' ٹھٹھے لگاتے رہتے۔ ملائک اداس نظریں اس خطے پر جمائے "حکم" کے منتظر رہتے۔

رات اپنے پنجے تیز کیے باقی ماندہ روشنی پر حملہ آور ہوتی اور کامیابی لہولہان ہوئی اس کے قدموں سے لپٹ جاتی۔

☆❁☆

اس خوب صورت پارک کے کونوں کھدروں میں چھپا اندھیرا دبے پاؤں وہاں موجود لوگوں کے پہلو میں آن بیٹھا تو وہ پہلو پر پہلو بدلتی سامنے گراؤنڈ میں موجود اپنے شوہر کو فٹ بال کے حصول کے لیے بے تحاشا دوڑتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کھیل کے دوران جب کوئی گرتا تو دوسرے کھیل چھوڑ کے اس کے چھکے چھڑانے پر مُصر نظر آتے۔ کھیل ختم ہوا، اس کا شوہر رومال سے چہرہ رگڑتا اس کی جانب چلا آیا۔

"آؤ چلیں۔" وہ آگے پیچھے چلنے لگے۔

"کیسا کھیلا میں نے؟"

"ایویں لتا ٹیم ضائع کیتا۔" رائے کے بجائے تبصرہ کیا گیا، وہ ہنس دیا۔ ایسے ہی بے مقصد سر کو جھٹکنے جیسے ہنسی۔ تھوڑی رفتار گھٹا کے قدم ہم سفر کیے، گردن ترچھی کر کے اس کے نقرئی مغرور حسن کو ایک بار دیکھا پھر بار بار، پھر سے ہنسا۔

"تو ہنس کیوں رہا ہے؟" تنک کے سوال کیا۔

"ڈر لگ رہا تھا۔" دھیمے لہجے سے سوال کیا گیا، مقابل کی آنکھوں کے حفاظتی بند ٹوٹنے لگے۔

ہم سفر نے خاموشی سے ہاتھ تھام کے اپنے ہونے کا یقین دلایا، ہاتھ ہمیشہ کی طرح چھڑا لیا گیا۔ بدن کی لرزش واضح ہوئی، وہ بغور دیکھ کے رہ گیا۔

"ارے جی پی یہ تم ہو؟" خوش کن آواز اس سے بھی دلکش شخصیت، خوب صورت اور طرح دار۔

"جی میڈم! کیسی ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر، یہ کون ہیں؟"

"میری مسز ہیں میڈم!" تعارف ہوا۔

"مائی گاڈ، کس قدر گارجیئس ہے یہ، کہاں سے اٹھا لائے ہو؟"

'گارجیئس' نے زرد رنگ کے ساتھ ان میڈم اور مخاطب جے پی کو دیکھا۔

"دیکھو جے پی! تم ابھی مجھ سے پرامس کرو کہ کل تم لوگ ڈنر ہمارے بنگلے پر کرو گے۔"

وہ تذبذب کا شکار نظر آیا پھر مانتے ہی بنی، پھر گھر کو چل دیے۔ کوارٹر نیم تاریک تھا، کھانا کھا کے دونوں اسی لاتعلقی سے سونے چل دیے۔ باہر اندھیرا سیاہ پوشاک پہنے اک قدرتی دھن پر جذب کے عالم میں فضا میں تیرتا پھر رہا تھا۔

☆❁☆

"چاچی کہتی ہے محبت تمباکو کے پودے پر اُگنے والے ست رنگ پھول سے زیادہ ساحر ہوتی ہے، یہ بھی ذہن کو ایک ہی نقش پر جما دیتی ہے۔ آنکھیں بند کروا دیتی ہے اور بند آنکھوں کے اس پار ایک ہی چہرے کو جما دیتی ہے مگر میں نے آنکھیں کھلی رکھیں اور ذہن تابندہ۔ سارے حساب کتاب کیے، جمع تفریق، ضرب، تقسیم تب میں نے جانا محبت حسب خواہش نتائج بھی دے سکتی ہے یا شاید ہم لے سکتے ہیں۔

پر سارے حساب کتاب کے باوجود میں یہ نہ جان سکی کہ محبت کوئلے جیسی بھی ہوتی ہے اگر یہ حسب خواہش نتائج دے بھی دے تو بھی اپنے ہونے کے نشان چھوڑ ہی جاتی ہے۔ روح پر سیاہ جلتے ہوئے نشان، میرا سودا تو پورا ہو گیا پر محبت کی تجارت میں تو نقصان ہی ہوا تاں حالانکہ میں تو سارا حساب کر کے بیٹھی تھی، جمع تفریق......

☆❁☆

"زہرہ نی زہرہ...... اٹھ جا۔ کیوں اپنے نصیبوں کی طرح سوتی رہتی ہے۔"

تاجاں نے دیسی کھیس کھینچتے ہوئے اسے

جھنجوڑا۔ زہرہ نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ روشنی کی لکیر نے اپنے نوکیلے سرے اس کی آنکھوں میں گاڑ دیے تو اس کی آنکھوں کے شربتی رنگ میں سنہری تاریں جا ملیں، تاجاں نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"اٹھ میری دھی، شاواش چھیتی کر (جلدی کر)۔ مہر بانو دے نال باڑے ہو آ میری دھی۔"

وہ زہرہ کو کندھوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے خود چوکی پر بیٹھ جلدی جلدی پیڑے بنانے لگی۔

"میں نہ جاؤں باڑے، مجھ سے نکمی تھاپا جاتا گوبر آخ، بلقیس کو بھیج دے اماں۔" وہ منہ بسور کے بیٹھ گئی۔

"تو کج نہ کرنا بس اوپلوں کو لین سے (لائن میں) رکھتی جانا۔"

مہر بانو کے یقین دلانے پر وہ چپل گھسیٹتی، منہ پر چھپاکے مار کے پھوپھی کے پیچھے چل دی۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے، گاؤں کے بچے آگے پیچھے بھاگتے، ایک دوجے کو دھکے لگاتے، سینوں سے سپارے لگائے مسجد کے احاطے سے باہر نکلتے۔ انہیں گھر جانے کی جلدی ہوتی کہ ان کی مائیں پیڑوں میں تازہ مکھن ڈال کے خستہ روٹیاں بناتیں جنہیں وہ دہی میں ڈبو ڈبو کے گھنٹوں میں کھاتے۔ (روزانہ اسکول جانا بچوں کے لیے کیسا عذاب ہوتا ہے، یہ کوئی ان سے پوچھے)۔

باڑے کا بڑا سا احاطہ دس، بارہ چھوٹے بڑے جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ زہرہ کے باڑے کے ساتھ سندھوؤں کا باڑا تھا، ان کے باڑے سے بھی بڑا اور ایک بہت پرانا برگد کا پیڑ' اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ برگد کا درخت زہرہ کو کوئی سبز پوشاک پہنے، سر نیہوڑائے بیٹھا بزرگ محسوس ہوتا۔ زہرہ کا باڑا بھی اس بزرگ کی سبز پوشاک تلے رہتا۔

زہرہ نے بھوسے پر کپڑا ڈالا اور کسل مندی سے وہیں بیٹھ گئی اور نظریں اوپر برگد کی شاخوں پر ٹکا دیں، جہاں بگلے چونچوں سے اپنے پیروں کی انگلیاں کریدتے، پر رگیدتے، کوے برگد کا لیس دار پھل، بھنبھوڑتے اس کی طرف اچھالتے۔ زہرہ کو کچھ بھی سکون نہ دیتا تھا، جب سے شعور کی پہلی منزل پر قدم رکھا، سکون طویل رخصت پر چلا گیا۔ وہ سوچتی نہیں تھی، سوچنا چاہتی بھی نہیں تھی مگر سوچیں اس پر وارد ہوتی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھی جو بند دہانے والی گپھا میں قید موت کی دعا کرتے ہیں بلکہ وہ تو ان لوگوں میں سے تھی جو گپھا کے تہہ در تہہ اندھیروں میں روشنی تلاش کرتے اپنی انگلیاں گھسا لیتے ہیں، آنکھیں پھوڑ لیتے ہیں، چاہے روشنی ملے یا اندھیرا ہی مقدر ٹھہرے، وہ رکتے نہیں۔

زہرہ نے گردن گھما کے پھوپھی کو دیکھا جو خود ہی اوپلے بناتی پھر انہیں ترتیب سے رکھتی بھی جاتی۔

"پھوپھی! جوانی میں تو بھی بہت خوب صورت ہوگی، سنیہے (پیغام) تو بڑے آئے ہوں گے تیرے لیے۔"

اس کی بات پر مہر بانو کے ہاتھ رکے پھر اور تیزی سے چلنے لگے۔

"بتا ناں نئیں تو میں چلی، زینو کی طرف۔"

"ناں، ناں زہرہ! کدھرے نہ جاویں، یہیں بیٹھ جا۔ جو پوچھے، بتاؤں گی۔"

"نجانے یہ تنہا لوگ تنہائی سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔" پھوپھی ہولے ہولے ماضی کے پتے کھولنے لگی۔

"آئے سی بہت لاگ میرے لیے وی، پر تُو تو جانتی ہے، کنواریاں والا کی ریت۔ اے ریت رواج کج نئیں دیکھتے، نہ کسی کنوار کا حسن، نہ کسی ماں باپ کی مجبوریاں...... میری پھوپھی کے زمانے تک تو کنواریاں والا صرف 83 چک ہی تھا فیر (پھر) نجانے کیا ہوا؟ وہ بڑے مرشد ہیں ناں اعظم شاہ سرکار، ان کی پھوپھی بڑی کرامات والی بی بی تھی۔ اماں بتایا کرتی تھیں کہ ان کی شادی قرآن سے کردی

تب انہوں نے اس پنڈ کی آنے والی نسلوں کے لیے بددعا کی تھی۔

لوگ تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ وہ عیسائیوں والے قبرستان میں بال کھولے کوئی عمل کرتی دیکھی گئیں۔ سارا پنڈ روتا بی بی کے در پر دو دن سوالی رہا پر حکم صرف اتنا ملا کہ صرف ایک وادے دی اولاد ہی دیا کر سکدی ہے، اور کسی سے نہیں۔ لو وہ دن اور آج کا دن، جو دو چار کڑیاں اپنے چاچے، تائے کے گھر بیاہی گئیں بس رہیں باقی سب کنواریاں۔ ہن تے کنواریاں والا کے ہر گھر وچ ہر عمر دی کنواری تھی اے...... ادھر پلی پر جو کبھار رہندے (رہتے) ہیں ناں انہوں نے کر دیا بیاہ...... اپنی کڑی دا چار بھرا (بھائی) سی کڑی کے، اک اک کر کے سب ختم۔ مال، ڈنگر، زمین سب جل گیا، تب سے لوگوں نے پکی توبہ کر لی اور یہ پانچ سو گھروں والا 83 چک گھٹ گھٹ کے 150 گھروں کا ''کنواریاں والا'' رہ گیا، سب اٹھ گئے اس بدبخت زمین کے ٹکڑے سے۔

وسیروں کے منڈے تو ہوتے ہی کم ہی ہیں یہ سندھوؤں کے ہوتے ہیں سات سات منڈے، کتنی ہی کڑیاں نمٹ جاتی ہیں...... ہک ہاہ۔''

''ناں پھوپھی! میں نئیں من دی اس ہیر رانجھے کے قصے کو۔ اسے ختم ہوئے تو چار نسلیں گزر گئیں، ہن تے بس اک ذرا سا شک ہی رہ گیا ہے۔ مینوں تے لگدا ہے اس پنڈ دے مرد ہی ناکارہ ہو گئے ہیں، اے چاہندے ہی نئیں کڑیوں کو ویاہنا۔ کنواریاں ان کے گھر سنبھالتی ہیں، ڈھور ڈنگر سنبھالتی ہیں اور زمینوں کو بٹوارا وی نئیں پڑتا، نہ داج کی فکر پھر آنکھ مٹکے کو وی مفت کا مال ہر دم موجود......''

وہ تلخی میں وہ بات کہہ گئی جو بڑے بڑوں کے منہ پر ڈالے گئے، بے حسی کے تالے میں بند رہتی تھی ہمیشہ سے۔ آخری جملہ بڑبڑا کے رہ گئی، پیش نظر اپنے خاندان کے مرد تھے، جن کی حریص نظروں کے مطالبوں نے زہرہ شہباز وسیر کو زہر بھرا بلبلا بنا دیا تھا جو ذرا سا چھونے پر بُری طرح پھٹ سکتا تھا، پیش نظر اپنا باپ بھی تھا جو دبئی کی ایک بہت بڑی کورین کمپنی میں ملازم ہونے کے باوجود اپنی تین کنواری بہنوں اور پانچ کنواری بیٹیوں کو بھلائے وہاں دوسری شادی رچا چکا تھا اور چچا بے اولاد اور بے فکرا ہونے کے ساتھ انتہائی بے دید تھا۔ اس کے قصے بھی گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ سنے جاتے تو کبھی کسی۔ پھوپھی اس کی باتوں سے گم صم سی ہو گئی، زہرہ اٹھ کے باڑے کی ڈھائی فٹ دیوار کے ساتھ ٹہلنے لگی۔ سندھوؤں کا باڑا خاموش تھا صرف اندرون خانے سے چارہ کاٹنے والی برقی مشین کی آواز سارے میں گونج رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ باہر آیا۔

ذراور سندھو کٹی ہوئی برسم جانوروں کے آگے ڈالتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ وہ بے نیازی سے اپنی قمیص کے دامن سے چہرہ رگڑنے لگا، زہرہ کی آواز پر چونکا۔

''اوئے شپاہیا (سپاہی) کتنا کم (کام) کرتا ہے تُو، چھٹی پر آتا ہے تو چھٹی کیا کرناں۔ یہ سب جازی سے کہا کرناں۔'' وہ بڑے مزے سے دیوار پر دونوں بازو ٹکائے تبصرہ کرنے لگی۔ وہ ابرو اچکائے پھر سے کمرے میں گھس گیا، اسے وسیروں کی یہ دبنگ سی نک چڑھی جادوگرنی سخت زہر لگتی۔ بچپن سے ہی وہ اس سے خار کھاتا۔ زہرہ منہ بنا کے دیوار سے ہٹ گئی۔ ذراور کو تپانا اسے بڑا مزہ دیتا تھا۔ وہ گاؤں کا پہلا فوجی جوان تھا، چھ ماہ بعد کچھ ہفتوں کے لیے آتا، اس میں سے بھی آدھے اپنے مامے کے گھر ادھر شہر میں ہی گزارا آتا۔

''نی زہرہ نی، پھتی کر۔ خالہ بختاں ویسے پر جانے سے پہلے تیری مٹھائی دے گئی تھی، چل آ کھالے یہ چل کے کھاتے ہیں۔''

زینب بشیر عرف زینو، زہرہ کی اکلوتی گوڑھی

سہیلی، شہباز وسیر کے چچیرے بھائی کی بیٹی۔ زہرہ پھوپھی سے پوچھتی باہر کو دوڑی۔

اب وہ تیز تیز چلتی، آبادی کو پیچھے چھوڑتی سر سبز پگڈنڈیوں کو روندتیں، امرودوں کے اس جھنڈ کی طرف تھیں جس کے درمیان سے پکا نہری پانی والا نالہ گزرتا تھا۔

"زہرہ! تجھے اک گل بتانی تھی۔"

زہرہ نے دیسی گھی سے بنی بالوشاہی کا ٹکڑا منہ میں رکھا ہی تھا کہ زینو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ناں تے پہلے کون سا تو کبھی کوئی بات بتانے سے رہی ہے، بتا۔"

"زہرہ! تیرا چاچا ناں آج کل گامے میراثی کے گھر کے بڑے چکر شکر کاٹ رہا ہے۔ گامے کی تبسم سولہویں سال چڑھ گئی ہے ناں، جوڑ کوئی ہے نئیں اس دا۔ کنواری رہے گی ہماری طرح، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ یہ کڑی ضرور کسی وسیر، سندھو یا چٹھے کے ہتھ چڑھے گی۔ اس مرجانی کو وی بڑا شوق تھا سرے لگانے اور ونگاں (چوڑیاں) چڑھانے کا۔ زہرہ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کنواری بی بی ان مردوں کے لیے بھی کوئی دعا کر جاتی ناں، ہک ہاں۔ کڑیوں کی تو ساری جنڈری رل جاتی ہے اس دعا کو توڑ چڑھاتے چڑھاتے۔" زینو کا رونا وہی تھا مردوں کی دیدی دلیری، عورت کی بے بسی۔

"چل جان دے زینو! کوئی نئیں۔ سچی بتاؤں مینوں لگدا ہے کوئی دعا شعا نہیں، ایویں کسی نے اڑادی اور ہر کوئی لگ گیا دعا کا بُت بنائے اسے پوجنے۔ چل مان لیا کہ یہ کوئی دعا تھی بھی، تو بھی میں نہیں مانتی ایسے عذابوں کو عقیدت۔ جے میں مرد ہوتی ناں زینو! فیر دیکھتی کہ کون سی دعا کسی کڑی کے خوابوں کی سواہ (راکھ) ان مردوں کے ہاتھوں میں دیتی ہے کہ لو اڑاؤ اسے، کڑی کے پیدا کرنے والوں کے سروں میں...... ہنہ عقیدت دعا۔"

"اللہ بڑا عادل ہے وہ لاٹھی لے کے ظالم کی کمر نہیں توڑتا بلکہ وہ بڑے انصاف کے ساتھ مظلوم بستیوں میں باغی پیدا کر دیتا ہے پھر وہ باغی ظلم کی سب ہی روایتوں کی کمر توڑ ڈالتا ہے۔ باغی نسلوں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔"

☆❁☆

"جب بات نسلوں کی بقا پر آجائے تو اخلاقیات کی ساری کتابیں چوراہوں میں رکھ کے جلا دی جاتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بقاء پر آئی تو دنیا کی مہذب سے مہذب قوموں نے دشمن کے گھروں میں گھس کے ان کے گلے کاٹ ڈالے، ان کی آنکھوں میں میخیں گاڑ دیں، ان کی کھالیں اتر والیں۔ یہ عزت حرمت کی باتیں صرف محلوں میں بیٹھ کے جھونپڑی والوں کے لیے کی جا سکتی ہیں۔ جس کا جتنا مضبوط بھرم اس کا اتنا اونچا شملہ۔ آپ کا یہ فیصلہ قابل تحسین ہے مسز جے پی! تاریخ بدلنے کو یہ قربانی تو بہت چھوٹی ہے۔ آج دنیا جن شخصیتوں کے بول ہیروں میں جڑوائے اپنے محلوں میں ٹانکے پھرتی ہے ناں، یہ ہی لوگ اپنے زمانے کے کنٹروورشل مگر تھے۔ سقراط نے زہر کا پیالہ پیا، منصور حلاج سولی چڑھا، گلیلیو نے بے عزت اندھے کی زندگی گزاری کس لیے؟ صرف اپنے نظریات کے بچاؤ کے لیے۔ وہ فنا ہو گئے مگر ان کے وہ نظریات آج بھی زندہ ہیں کیونکہ ان نظریات میں بقا تھی، معاشرے کی، انسان کی بقا ...... کبھی کبھی کچھ صحیح کاموں کو غلط انداز میں کرنا پڑتا ہے اور وقت خود آپ سے ایسا کرواتا ہے، ویسے بھی زندگی کوئی تین گھنٹے کی فلم نہیں ہے کہ دو گھنٹے پچپن منٹ بعد ہر چیز اپنی اصلی سمت کو لوٹنے لگے اور تین گھنٹے مکمل ہونے پر ہیپی اینڈنگ کا بگل بج اٹھے 'ڈیٹس وائی وی اپیری شیٹ یو...... زندگی کو ایک سکتے غار سے باہر نکالنے کے لیے۔

وی اپیری شیٹ یو......

ہر اس لہر کے مخالف جانے کو، جو لمحہ بہ لمحہ زندگی

کو تاریکی کی جانب گھسیٹتی رہتی ہے، ویری اپیری شیٹ ـــــ یو...... ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہاں موجود پچیس تیس افراد کی آنکھوں میں ان دونوں کے لیے حوصلہ افزائی کا پیغام روشن تھا اور وہ دونوں تشکر سے مسکرا رہے تھے۔

☆❀☆

''نہ تُو نے جواب مانگا نہ چاہا، پر کوئی کیا کرے جی؟ یہ محبت چندری بڑی 'جواب دہ' شے ہوتی ہے۔ کبھی دنیا، کبھی محبوب اور کبھی اپنے آپ کے آگے بھی جواب دہ۔ سوچا تجھے بتادوں کوئی تو ہو جو سمجھے کہ میں ''ہری چگ'' نہ تھی، کوئی تو ہو جو یہ جانے کہ میں تو فقط طوفان کا رخ موڑنے کی چاہ میں مٹ گئی۔

مگر طوفانوں کا رخ موڑنا آسان نہیں ہوتا، تمہاری وہ میڈم جو بڑی چاہ سے تمہیں جے پی کہتی تھی، یہ مجھے اسی نے بتایا کہ ''سودا'' بڑا مشکل ہے۔ پھر میں سمجھی کہ جب میں نے محبت کا ہاتھ تھام کے دہلیز پار کی تو محبت کا چہرہ ہی بدل گیا اس کے چہرے پر بڑا بڑا سوداگری لکھا ہوا تھا...... کیوں؟ بتایا ناں کہ پورا حساب کتاب کیا تھا میں نے اور پھر محبت میں اتنا جمع تفریق ہو تو وہ پھر سوداگری ہی رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی سودا کرلیا محبت کا، آج سوچا تو جانا محبت ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے یا نہیں، پر یہ دل پر پکی مہر، ضرور لگا دیتی ہے۔ دل کے جس حصے میں یہ آنکڑا لگا کے بیٹھ جائے تو پھر وہ جگہ کسی عامل کے چلّے والے دائرے جیسی ہو جاتی ہے، جادو زدہ۔ کسی اور کے لیے شجر ممنوعہ جیسی، تو ایسی ہی سحر طراز محبت کرلی میں نے، مجھ جیسی سوداگرنے......

☆❀☆

موسم بدلا، ہوائیں سرد ہوئیں، کنواریاں والا نے جاڑا اوڑھ لیا۔ ہر طرف جامد کہر زدہ خاموشیاں پھیلتی ہونے لگیں۔ ماحول کے سکوت میں پرندوں کی چہچہاہٹ سے پڑنے والی پھوٹ بھی کپکپانے لگی، بوڑھی کنواریوں کے لیے راتوں کی لمبائی روز حشر جتنی ہونے لگی۔ زہرہ اپنی خالہ، جو قریبی شہر میں رہائش پذیر تھیں، کے ہاں سے آئی تو سوغات کے طور پر وہاں سے طرح طرح کی کہانیاں لے آئی جو وہ بلا ناغہ صبح دوپہر شام اپنے گھر والوں کو سناتی رہتی۔

ابھی بھی تاجاں اور شہربانو اپنی ٹانگ کے نیچے درانتی دبائے ساگ کاٹ رہی تھیں۔ نسیم چاچی لحاف کھولے اس کی روئی کو ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ مہربانو بھی ساتھ لگی ہوئی تھی جب کہ شہربانو اپنے دل پسند مشغلے کے ساتھ مصروف تھی یعنی دو بالشت لمبی جھاڑو سے زمین کھرچ رہی تھیں، کون سی ایسی گندگی تھی جو صاف ہی نہ ہونے پائی۔ زہرہ کچے ساگ کے ڈنٹھل کو کچر کچر دانتوں میں چباتے ہوئے نیا قصہ لے بیٹھی۔

''مہر پھوپھو! ادھر خالہ کے ہمسائے کی ایک کڑی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔'' سب کی ناپسندیدہ نظروں کے جواب میں بیان کو قابل قبول بناتے ہوئے بولی۔

''وہ اس لڑکی کا بھائی اس کی شادی کسی بوڑھے سے کروا رہا تھا زبردستی، خالہ بولی اچھا کیا جو بھاگ گئی۔ دوسری صورت میں بھی تو ساری زندگی بھاگتے ہی رہنا تھا۔ کبھی میکے اور کبھی سسرال...... خیر خالہ نے اک گل بڑے پتے کی کردی، بولی، لو بھلا کڑی کی مت دیکھو بھاگی وی تو الیکٹریشن کے ساتھ، بندہ کسی شپاہی کے ساتھ بھاگتا ہے۔ پیچھا کرتے ہوئے پچھلوں کی جان جاتی ہے، ادھر شپاہیوں کی بستیوں میں جانا اپنی خالہ کے گھر جانے جیسا تھوڑا ہی ہوتا ہے، میں نے سوچا......''

بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی کیونکہ تاجاں کا سخت ـــ ہاتھ اس کے کندھے کا جوڑ ہلا چکا تھا۔

''ناں میں کہتی ہوں لکھ لعنت ہو تجھ پر اور تیری اس خصماں نو کھانی خالہ پر، جو اتنی اتنی چھوکریوں کے سامنے ایسے بدخیال بولتی ہے، میں نے تجھے اس واسطے ادھر بھیجا تھا کہ تو یہ کچ سیکھ کے آئے۔ ہن ایسی کوئی گل کیتی تے تیرے سر پر اک وال بھی نئیں

چھوڑنا میں نے۔ نامراد، خانہ خراب نہ ہووے تے......"

تاجاں کبھی کبھی ہی زہرہ کو ڈانٹتی تھی ابھی بھی وہ شروع ہی ہوئی تھی کہ زہرہ ہنس ہنس کے دہری ہوتی اسی پر آرہی۔ تاجاں نے تلملا کے اس کے دوہتھڑ اور چپڑ دیے، خود پر سے ہٹایا سامنے چھوٹی فاطمہ کھڑی تھی۔ نسیم چاچی کے بیاہ کا گوٹے کناری والا دوپٹا اوڑھے، اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں میں بڑی سی سنہری کپڑے والی اونچی ایڑی کی جوتی پہنے، ماتھے پر بڑا سا پرانے انداز کا ٹیکہ لگائے اور تو اور پرانی میک اپ کٹ میں سے بھر بھر کے سرخ رنگ کی گول ٹکیہ گالوں پر بنائے، وہ مضحکہ خیز ہی تو لگ رہی تھی۔ پھوپھیوں کی ویران آنکھوں میں دکھ کی لہریں سر پٹخنے لگیں۔ باقی تینوں بہنیں اپنے تیار کردہ شاہکار کو نمائش پر لگا کر اب سب کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ تاجاں کو دورہ سا پڑا تھا۔ وہ اچھل کر چارپائی سے اتری اور فاطمہ کو بے تحاشا پیٹنا شروع کردیا۔ نسیم چاچی روتے ہوئے اسے چھڑانے لگی، فاطمہ کو ادھموا کرنے کے بعد وہ باقی تینوں تک پہنچی، ساتھ چیختی بھی رہی۔

"بڑا شوق ہے ناں تم سب کو ووہٹیاں (دلہنیں) بننے کا۔ ابھی اتارتی ہوں، ماں کو منہ دکھانے جوگا نہ چھوڑنا کچھل پیریو......" زہرہ پر جیسے بہت سے راز منکشف ہونے کو تھے، وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ سہ پہر ڈھلتی شام ہوئی، ساگ بنا سب بھول بھال کھانے میں مگن ہوئے، زہرہ وہیں کی وہیں بیٹھی تھی اور فاطمہ...... جو زہرہ کا بازو ہلا کے وقفے وقفے سے پوچھتی۔

"میں اچھی نہیں لگ ری سی؟" (میں اچھی نہیں لگ رہی تھی)۔

ہر بار کے پوچھنے پر زہرہ کا دل کرتا کہ وہ دھاڑیں مار مار کے روئے مگر وہ خشک آنکھیں لیے بیٹھی رہی۔ یہ جاڑا کنواریاں والا کی تاریخ کے نئے پنے رقم کرنے والا تھا، یہ جاڑا ابھار لانے والا تھا۔

☆❀☆

اس کی زندگی کی سب سے خوب صورت بہار تھی یہ، وہ بلاوجہ مسکراتی، لمحوں میں صدیاں جینا چاہتی۔ اپنی زندگی میں اتنی اجلی راتیں اور اتنے پر بہار دن اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے، ان دنوں اس کی ہنسی کی کھنک ہی اور تھی۔

اس رات جب وہ اپنی ٹانگوں پر کمبل لپیٹے کوئی موٹی سی کتاب لیے بیڈ پر نیم دراز تھا تو اس نے اتنی طویل خاموشی کو کاٹنے کے لیے اس کی جانب کروٹ لی، کہنی کے سہارے ذرا اوپر ہو کے دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو ہلایا۔

"یہ تم کیا پڑھتے رہتے ہو؟" اس کے متوجہ ہونے پر اس کی شرٹ کے بٹن سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"امتحان کی تیاری کررہا ہوں، یہاں ترقی کے لیے امتحان دینا پڑتا ہے۔ پہلے مجھے کوئی فکر نہ تھی مستقبل کی مگر اب...... تم ساتھ ہو تو میری کوشش ہوگی کہ تمہیں وہ سب کچھ دے سکوں جو کسی بھی شہزادی کا مقدّر ہوتا ہے۔" وہ پھر سے کتاب کی طرف پلٹا مگر اسے رک جانا پڑا۔

"اور اگر میں ہی ساتھ نہ رہی تو؟"

"ایسا کیوں کہا؟"

"فرض کرو اگر کبھی مجھے بھول جانا ضروری ٹھہرا تو......؟"

"کیا تم یہ کرسکتی ہو...... مطلب مجھے بھولنا؟" بٹن کے ساتھ مسلسل کھیلتا ہاتھ ساکت ہوگیا اور سوال کرنے والے کے اندر تک جیسے کسی نے سکون بھر دیا۔ وہ سیدھی ہوئی پھر چت لیٹ گئی، اب مقابل کہنی کے بل اس کی جانب گھوما، نظریں سوال طلب تھیں۔

"ہاں۔" یک لفظی جواب آیا، وہ ششدر رہ گیا۔

"کچھ چیزیں اہم ہوتی ہیں اور کچھ ضروری۔ میرے خیال میں ضروری چیزوں کا نمبر پہلے ہونا

چاہیے۔ وقت گزرے تو یہ فن تم بھی سیکھ لینا، ضروری ہے۔

ہاتھ بڑھا کے اس کا چہرہ چھونا چاہا وہ یوں دور ہوا جیسے بساند بھری چیزوں سے ہوا جاتا ہے۔ ضروری چیزیں یہ دو الفاظ ٹک ٹک ٹک دماغ پر ضربیں لگا رہے تھے۔

☆❁☆

"کچھ فیصلے بڑے جاں گسل ہوتے ہیں، خاص طور پر وہ فیصلہ جو اپنے خلاف جا کے کیا جائے وہ مشکل ہی ہوا ناں اور یہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کوڑے کھا کر کہا جائے کہ اس بار تو درد بالکل نہیں ہوا، حالانکہ درد تو ہوتا ہے، روز اول جیسا درد۔ ایسے، فیصلوں کا درد بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ بار، بار کوڑے کھانے جیسا مگر ہم جیسے انسان ساری زندگی اپنی ضد کو تھپکیاں دیتے کبھی نہیں تھکتے، چاہے ہمارے ہاتھ کرب کے چھالوں سے بھر جائیں یا ہماری روحیں......

"گزرے بارہ دن میری زندگی کے بہت قیمتی دن تھے، مگر ہر دن کے بعد رات بھی تو لازمی آتی ہے۔ یہ اور بات کہ میں تو اس رات کے آنے کا انتظار جانے کب سے کر رہی تھی۔ وہ ایک رات جس کے بعد روشن صبح ہوتی ہے۔ اب خدا جانے یہ صبح کتنی روشن ہوگی کہ ہم تو اس ڈھلتی رات کے ساتھ ہی ڈھل جائیں گے...... خدا جانے کیا ہوگا؟"

☆❁☆

لٹھے دی چادر، اتے سہلتی رنگ ماہیا......

یہ زہرہ کی گنگناہٹ تھی۔ سرسوں کے پھول جیسی لہراتی آواز۔ وہ گاؤں کے پکی اینٹوں اور کچی مٹی کے ملاپ سے بنے گھروں کے درمیان سے گزرتی، دیواروں کو ہاتھوں سے ملتی، کبھی کبھی خوش گوار مزاج کے ساتھ یہ گنگنایا کرتی تھی۔ ابھی بھی وہ اس ڈھلتی شام میں زینو کے گھر سے نکل کے اپنے گھر کو لوٹ رہی تھی۔ دھند اور کہر کی وجہ سے لوگ گاؤں میں سرشام ہی گھروں میں مقفل ہو جاتے ہیں۔ گلیوں میں اکاڈکا آوارہ کتا کسی ٹوٹے چھپر کے نیچے کپکپاتا ہر آنے جانے والے کی خبر رکھتا۔ مشکوک انداز پر بھونکتا ہے۔ گاؤں کا جاڑا بڑا پر کشش ہوتا ہے، جب بیٹھکوں کے سامنے بنے تھڑوں پر لکڑیاں جلائی جاتی ہیں۔ بوڑھے اپنی گرم شالوں میں دبکے جب کہ جوان شالوں کو بے نیازی سے کندھوں پر ڈال کے آگ کے گرد بیٹھے ہر قسم کی بات کرتے ہیں اور محفل کا اختتام وارث شاہ یا میاں محمد بخش کے کلام سے ہوتا ہے۔ عورتیں مکئی کے سٹے کوئلوں پر بھونتیں باجرے کی میٹھی ٹکیاں بناتیں اور رضائیوں میں دبک کے کھاتیں۔ ایسے میں یوں محسوس ہوتا کہ رب نے سکون صرف اسی خطۂ ارض پہ اتارا ہے۔

لٹھے دی چادر......

"زہرہ!" پکار پر وہ رکی۔ زینو کا چاچا اکبر چادر سے منہ چھپائے عین زہرہ کے پیچھے کھڑا تھا۔ کئی بار اس کی ہوس زدہ آنکھوں میں پیغام دیکھے۔ مگر وہ نظر انداز کرتی رہی، مگر آج وہ اسے روکے کھڑا تھا۔

"کیا...... ہے؟" وہ لڑکھڑائی شاید گھبرائی تھی۔

"او شہزادیے! جتنی تیری شکل قاتل ہے نا اتنی ہی تیری مت پٹھی (الٹی) ہے۔ او میرا مطلب ہے یہ کوئی ٹیم ہے کلے کلے (اکیلے اکیلے) گھر سے نکلنے کا۔ او تیری جیسی شے کو تو کالے ناغ (ناگ) کی کھڈ (بل) پر بھی بٹھا دو ناں تے لوگ فیر اسے پکڑنے سے ناں مڑیں۔ چل آ میرے ساتھ تجھے گھر چھڈ (چھوڑ) آؤں شہزادیے۔"

سارے مکالمے کے دوران زہرہ کا دھیان اپنے کندھے پہ رینگتے اکبر وسیر کے بائیں ہاتھ پر رہا۔ اب وہ اس کا بازو تھام کے چلنے لگا۔

"چھوڑ...... میں آکھیا (کہا) چھوڑ مجھے۔ چلی جاؤں گی، یہ اگلی نکڑ پر تو بوا (دروازہ) ہے میرا۔ تو میری فکر نہ کر۔ اپنے گھر کی فکر کر، جہاں چار کنوار بیٹھی ہیں۔ ذرا دھیان رکھا کر، وہ تو کسی کالے ناغ کی کھڈ پر وی نیں بیٹھیں۔ ہنہ آیا وڈا نگہبان۔"

وہ زہرہ شہباز دسیر تھی۔ اس نے کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کے رونے کے بجائے دسیروں کے مرد کو للکارنا پسند کیا۔ اکبر دسیر نے طیش سے اسے روکنا چاہا، مگر گلی میں کسی تیسرے کی آمد کا خیال کرتے ہوئے ضبط کیے رہا۔

"لے وئی شہزادیے! پہلے تے گل تھی، لکن مٹی جیسی۔ ہن تجھے پتہ لگے گا کہ کلی (اکیلی) شکل ہی کج نئیں ہوتی۔ ہن کدی ٹکر تو مجھے۔"

"ہن ہتھ لگایا تے اگر ہتھ نہ کاٹ دیا اس کا تو سمجھنا حرام زادی ہوں، سارے اک جیسے مرد...... لگڑ بگڑ۔"

رات نے اپنے دامن سے مزید سفید راکھ پھینکنا شروع کی، جب کہ دھرتی نے سمیٹنا۔

☆❁☆

وقت چند ہفتے مزید آگے بڑھا۔ زہرہ نے اپنے گھر میں حوصلہ شکن ہنگامہ پایا۔

"سور دی تخم جانوں نہ مارا تے مینوں آکھیں حرام زادہ...... کی کر رہی سی کریم دے پتر نال اے لالی چنی لے کر۔"

یہ وہ ابتدائی الفاظ تھے جو ارباز دسیر نے فاطمہ کو دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹکراتے ہوئے کہے۔ وہ اسے روئی کی طرح دھنکتے ہوئے رسوئی تک لایا۔ اس کے سر سے بھل بھل نکلتے خون نے سب کی چیخیں نکال دیں، مگر ارباز چاچا نہ رکا۔ وہ منہ سے کف اڑاتا گالیاں بکتا فاطمہ کو پیٹتا رہا۔

"بے غیرت سمجھ رکھا ہے مجھے۔ تم ذلیل، کم ذات عورتوں کی نیت نہیں بھرتی مردوں سے۔ عمر دیکھو اس کی، ابھی دس کی بھی نئیں ہوئی۔ میں پاگل لگتا ہوں تم سب بے غیرتوں کو، کبھی کسی کا رشتہ آتا ہے، تو کبھی لوگ مجھے روک روک اس جادوگرنی زہرہ کا کہتے ہیں اور کتنے مرد چاہئیں تم عورتوں کو۔ سارے پنڈ میں کنوار ہیں۔ تم لوگ بھی رہ جاؤ گی تے کون سی قیامت سر ٹپ (پھلانگ) جائے گی۔ پوچھو ساری مل کے اس سے کیا کر رہی تھی، فاروق کے ساتھ ادھر۔"

"چل بس کر دے باز! بس کر دے اور کتنی کھے (راکھ) پائے گا۔ ہمارے سفید چونڈوں (بالوں) میں۔ کج خدا دا خوف وی کر۔" شہر بانو نے ہمت دکھائی۔

"او چل تُو چپ کر۔ گل سن لو سب میری، کوئی گھر سے باہر پیر وی نہ نکالے، نئیں تے ٹوٹے کر دوں گا، قسم خدا دی۔ یہ جو اسکول کا ٹنٹنا ہے ناں اے وی ختم کراؤں ان نکیوں، نظر نہ آئیں یہ مجھے کسی نکڑ یا گلی میں۔ آئی سمجھ۔"

وہ فیصلے سناتا باہر نکل گیا۔ اماں جو فاطمہ کے سر پر اپنا دوپٹا دبائے بیٹھی تھیں باآواز بلند رونے لگی۔

"شہر بانو! دیکھ یہ آنکھ نئیں کھول رہی۔ فاطمہ...... نی فاطمہ۔"

ساری رونے لگیں۔ زہرہ بنا جوتا پہنے، دوپٹا اوڑھتی باہر کو دوڑی۔ نکڑ والے، کمپاؤڈر کو بلا لائی۔

رات ارباز کے چیخنے، گالیاں دینے پر بھی وہ سر جھکائے مٹروں کے شوربے سے کھیلتی رہی۔

"ناں، مرتی تھی تو مر جاتی۔ یہ کیوں گئی باہر۔ میں بھوکتا رہوں۔ تم لوگوں کو پرواہی نئیں۔ جس کا جو دل چاہندا ہے وہ وہی کرتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیوں گئی تو باہر۔"

"صرف میں ہی کیوں...... مہر بانو پھوپھی شام کو چارہ لینے گئی، زربانو پھوپھی دودھ دوہنے۔ ابھی بھی بھینسوں کو چھپر کے نیچے کرنے گئی ہے۔ اس کا کیا؟"

"یہ گھر کے کم ہیں۔ ہر کنوار کرتی ہے۔ جب تم لوگ ہمارا کھاتی ہو تو کم وی تو کرنا ہے نا۔ میری جند پر احسان نئیں ہے یہ۔ ہمارے سیروں پر ناغ بن کے بیٹھی ہو، تے کم کرتے موت پڑتی ہے۔"

"یہ ہی ہے تیری غیرت۔"

"کیا بھونک رہی ہے، او نیچا بھونک۔" وہ بپھر کے اس پر جھپٹا۔ شہر بانو بیچ بچاؤ کرانے لگی۔ زہرہ کمرے میں آ کے فاطمہ کی رضائی میں گھس گئی۔

''ہم عورتیں خراب، ہم عورتیں بازاری اور یہ مرد......؟''

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ فاطمہ جب وقفے وقفے سے کراہتی تو زہرہ کا دل چاہتا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں سوئے ارباز وسیر کو ہمیشہ کے لیے سُلا دے۔ وہ سوچتی رہی، کوئی راہ سجھائی نہ دی۔ زرد بلب کے گرد سر ٹکراتی، راستہ ڈھونڈتی مکھی بالآخر نیم جان ہو کے زہرہ کی رضائی پر آن گری۔ زہرہ نے تھک کے آنکھیں موند لیں۔

☆❁☆

وہ جلدی جلدی کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی، جب وہ کچن کے دروازے پر کھڑا اسے کام کرتے دیکھنے لگا۔ وہ سست انداز میں کام ختم کرنے لگی۔

''میری کوئی بات بری لگی تو معذرت چاہتا ہوں۔'' کچھ دیر بعد آواز ابھری، وہ تھمی، بولی کچھ نہ۔

''یار! ایک تو تم ناراض بہت ہوتی ہو۔'' وہ قریب آیا۔ کاؤنٹر سے پشت ٹکائے اظہار خیال کیا۔

''بڑی جلدی تھک گئے۔''

''دیکھا...... کیسا ترنت جواب دیا۔ حالانکہ تمہیں مجھ سے سوری کرنا چاہیے تھا۔''

''کس بات کے لیے؟''

''میرا دل دُکھانے کے لیے۔''

''تم مردوں کے دل بھی دُکھتے ہیں۔ کیسی شرم کی بات ہے ناں۔''

اسے لگا وہ مسکرائی ہے۔ بغور جانچا، وہ سرخ ہوتی اس کی جانب رخ موڑ کے کھڑی ہوگئی۔ وہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، جو کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑا رہا تھا۔

''اچھا...... میں چلتا ہوں۔ آج موسم بھی خراب ہے۔ بارش ہوئی تو گھبرانا مت۔ میں رخسانہ آنٹی سے کہہ جاؤں گا، وہ آجائیں گی تمہارے پاس۔'' تیز تیز بولتا دہلیز پار کرنے لگا۔

''رکو۔'' وہ رک گیا۔

''آج تم نہ جاؤ۔'' فرمائش پہ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ بازو اس کے کندھوں پہ پھیلایا۔

''ان بارہ دنوں میں نوویں بار کہہ رہی ہو حالانکہ جانتی ہو کہ مجھے چھٹی نہیں ملتی۔ میں کوشش کروں گا جلدی آنے کی۔''

وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا، جب کہ وہ صرف اسے دیکھ رہی تھی۔ کیسی سوندھی خوشبو آتی تھی اس کے وجود سے، تحفظ کی، عزت کی، محبت کی خوشبو...... کیا سب مردوں سے ایسی خوشبو آتی ہے، شاید نہیں۔ اسے تو صرف اس مرد سے آتی تھی۔ وہ گیٹ پار کر رہا تھا۔ آج اس کا دل نہ جانے کیوں ڈوب رہا تھا۔ اس کے پاس موجود وقت کے سکے پر صرف آج رات تک کی مہلت تھی۔ صرف آج رات تک......

☆❁☆

''کتنی بار دل چاہا کہ پلٹ جاؤں۔ ان ہی لمحوں میں خود کو قید رہنے دوں جو تمہارے ساتھ بیتے تھے مگر میرے 'پیچھے والوں' کے پیروں میں پڑے چھالے مجھے منزل کی طرف چلتے رہنے پر مائل کرتے رہتے۔ دل پیروں سے لپٹ لپٹ جاتا مگر وہ نہ رکے۔ پیروں نے مرتد نہ ہونے دیا، ورنہ میرا حال بھی اس مومن جیسا ہوتا جو نزع کے وقت کلمے سے منکر ہو گیا ہو۔ اس پیاسے جیسا جو طویل مسافت طے کر کے کنویں تک آیا، پھر اندر جھانکے بنا ہی کسی اور کنویں کی تلاش میں نکل پڑا۔ پیچھے میٹھے پانیوں والا کنواں صدائیں دیتا رہ گیا۔ وہ رب واقعی بڑا بے نیاز ہے۔ بے نیاز نہ ہوتا تو کسی میری جیسی کو گھر سے بے گھر...... پھر گھر سے بے گھر نہ ہونا پڑتا۔ اس رب کی قسم میں تو وہیں اسی دہلیز پر کھڑی کھڑی مر گئی تھی۔ آج تو صرف سانسوں کی گنتی پوری کر رہی ہوں۔ مرنے کا قانونی طریقہ پورا کر رہی ہوں آج جب ختم ہونے کے قریب ہوں تو دل چاہتا ہے کہ تجھے بتاؤں کہ میں، میں نہ تھی۔ بس تم تھی۔

☆❀☆

سردیاں، ہواؤں پر مکمل قبضہ جمائے ہر کسی کو جما دینے کے درپے تھیں۔ فصلوں پر جما کہر، سہ پہر تک ہولے ہولے پگھلتا تو لوگ اپنے جانوروں کے لیے اگلے دن تک کا چارہ کاٹ لاتے۔ آج زہرہ بھی مہربانو کے ساتھ فصلوں میں آئی تھی۔ سورج مدھم ہوتا ہوا صرف سرخ چمکتا گولہ سا نظر آنے لگا۔ حرارت سے خالی۔ مہربانو ابھی چارہ کاٹنا شروع ہی ہوئی تھی کہ زربانو کی پکار پر اٹھ کے گاؤں کی طرف بھاگی۔

”مہربانو...... مڑ آ...... کالی رستہ تڑوا کے بھاگ گئی۔“

وہ بھینس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مہربانو اسے وہیں رہنے کا کہہ چلی تھی۔ زہرہ کچھ دیر ادھر اُدھر پھرتی، مختلف بوٹیوں کو جانچتی رہی، پھر امرودوں کے جھنڈ کی جانب آئی، جھینگروں اور کیکڑوں کی آوازیں دہرائی سرسوں اور امرودوں کے پتوں کی سرسراہٹ، ڈوبتا سورج۔ وہ بے اختیار خوف کا شکار ہوئی۔ امرودوں کے جھنڈ کے درمیان پکے نالے کے ساتھ ایک کچی راہ گزر تھی۔ جو درختوں اور فصلوں سے گھری رہتی۔ وہ راہ گزر ہمیشہ سنسان ہی رہتی۔ اکا دُکا لوگ ہی اس راہ سے گزرتے۔ زہرہ وہیں پکے نالے کے کنارے بیٹھ کے امرود کھانے لگی۔

لٹھے دی چادر......

وہ گنگناتے ہوئے رکی، کچی سڑک پر قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ زہرہ لاشعوری طور پر ٹاہلی (شیشم) کے موٹے سے تنے کے پیچھے ہوئی۔ سایہ ہولے ہولے واضح ہوا، وہ موجو نائی کی بیٹی ثریا تھی۔

سر پر اپنے باپ، بھائیوں کے لیے کھانا اٹھائے وہ ترنگ میں آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کے پیچھے اک اور سایہ بھی تھا۔ وہ ارباز وسیر تھا جو عین ثریا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ زہرہ نے آنکھیں جھپک جھپک کے دیکھا اپنے غیرت مند سرپرست کو۔ وہ چہرے پر خبیث سی مسکراہٹ لیے اس لڑکی کو ہراساں کر رہا تھا۔ پھر زہرہ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کچھ نازیبا حرکات کیں۔ ثریا قدم قدم پیچھے ہٹ رہی تھی، کیوں کہ آگے وہ جانے نہ دیتا تھا۔ زہرہ کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ پڑا، سانس سینے میں ہی دب گیا۔

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ثریا کے سر سے گرے زمین پہ بکھرے شلجم اور روٹیوں کو دیکھا اور کچھ دور پڑے اس کے دھانی دوپٹے کو بھی۔ وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہی۔ گنے کی فصل سے آتی ثریا کی آوازوں نے عجب وحشت طاری کی، وہ دیوانہ وار پیچھے کو بھاگنے لگی۔ بے انتہا زرد رنگ کے ساتھ وہ پکی سڑک پر بھاگ رہی تھی، جب کسی سائیکل سے ٹکرائی اوندھے منہ گری۔ پھر سے اٹھی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مہربانو نے دیکھا تو تفکر سے آوازیں دیتی رہ گئی۔

دروازہ کھول کے وہ یوں گھر میں داخل ہوئی جیسے کسی نے پوری قوت سے اسے اندر پھینکا ہو۔ تاجاں دل تھام کے رہ گئی۔ زہرہ کمرے میں داخل ہوتے ہی چارپائی پر ڈھے گئی۔ لحاف میں منہ دے کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کس جہاں میں بستی تھی وہ۔ کیسے لوگ تھے یہاں کے۔

☆❀☆

”غلطی میری ہی ہے۔ اکیلی کنوار کو ڈھلتی شام، ادھر ویرانے میں چھوڑ آئی۔ لگتا ہے ڈر گئی ہے۔ پیر اعظم شاہ کے آستانے پر لے چلوں گی کل اسے۔“

مہربانو، تاجاں سے ہم کلام تھی، جب کہ قریبی چارپائی پر پڑی زہرہ پچھلے دو دنوں سے بخار میں تپ رہی تھی اسے ہر دم اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوتیں جنہیں وہ جھٹکتی رہتی۔ اس کا غم ہولے ہولے نفرت میں بدل رہا تھا۔ ارباز وسیر کی اس دن کی گفتگو اس کے کانوں میں گونج پیدا کرتی۔

”تم عورتوں کا دل نہیں بھرتا ہم مردوں سے۔“

سر میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں، عورتیں بے قصور ہی گناہ گار ٹھہرائی جاتیں اور مرد...... کیا بچنے کی کوئی راہ بھی ہوگی؟ جب ارباز و سیر کے اعمال اس کی طرف لوٹ کے آئیں گے تو پکڑ میں ہم ہی تو آئیں گی۔ اکبر جیسے نہ جانے کتنے موقع کی تلاش میں ہوں گے؟ ہم بہنیں، ہی اپنی میلی چادروں سمیت ان سرپرست مردوں کے حصے کا بار بھی خود اٹھائی پھریں گی؟

کیا کوئی راہ نہیں نجات کی؟

کوئی ترکیب، کوئی تدبیر؟

وہ ابھی بھی ایک ہی نقطے پر نظریں جمائے لیٹی تھی، مہربانو اور تاجاں تشویش سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆❁☆

کل دوپہر کی بات تھی جب زینو اس کی غائب دماغی محسوس کیے بنا اپنا دکھڑا روتی رہی۔

''زہرہ! ماجد میری جان نئیں چھوڑ رہا۔ سعودیہ جا رہا ہے نا اس واسطے ملنے بلاتا ہے۔ کل اسے چلے جانا ہے۔ میں کیا کروں، اگر گھر والے رشتے کو نہیں مانے تو ......'' اور آج نثار کمپاؤڈر نے اسے روک کے کہا۔

''زہرہ......! کیا آج تُو زینو سے ملی ہے؟''

''نئیں۔''

''اسے دیکھ آ۔ میں ابھی ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔ کہیں گرور گئی ہے۔ بڑے زخم آئے ہیں اسے۔'' نثار نے نظریں ملائے بنا کہا۔ وہ جو اکبر کی وجہ سے زینو کے گھر جانے سے گھبرائی تھی۔ زینو کی طرف دوڑی۔ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ زینو کی ماں ٹکور کے لیے ریت گرم کر رہی تھی، اسے کمرے میں جانے کا اشارہ کرکے دوبارہ کام میں مگن ہوئی۔ کمرے میں زینو لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ زہرہ کے پکارنے پہ بھی لحاف اوڑھے رکھا۔ زہرہ نے لحاف کھینچ لیا۔

چہرے اور گردن پہ جا بجا زخم ـــ تھے جن پر مرہم لگائی گئی تھی۔

''کیسی گہری چوٹیں آئی ہیں...... کیسے گری ہے تُو؟''

زینو کی دبی دبی چیخیں نکلیں۔ اپنے دوپٹے سے اس نے چہرے کی ساری مرہم اتار دی۔ زہرہ گونگی ہوگئی۔ وہ کاٹنے کے نشان تھے۔

''میں تے باڑے گئی تھی زہرہ! گوبر سے بھرے ہتھ تھے میرے۔ بڑا چھڑایا، بڑا روئی، مگر وہ نہ جانے کیا کیا بولتا رہا۔ پھر چلا گیا...... چلا گیا سعودیہ۔ کیا کھیل کھیلا اس نے...... چل ہمارے ناکارہ کنوارے وجود کسی کے کم تو آئے۔'' اذیت پسندی سے گردن کے زخم چھیل ڈالے، پھر بین ڈالنے لگی۔ زینو کی ماں بھاگتی آئی۔

''نی زہرہ کج سمجھانی اسے کیوں باپ، بھائیوں کو شک پڑوانا چاہتی ہے، مگر ولتھ (جان چھوٹی) گیا ہے وہ۔ یہ پھٹ (زخم) تے چھیتی بھر جائیں گے، بس اسے سمجھا بوتا رولا نہ ڈالے۔''

وہ رازداری کا سبق پڑھا رہی تھی۔ زہرہ کا جی الٹنے لگا۔ کیسی بساند تھی وہاں۔ وہ اٹھ کے باہر نکل آئی۔ بدبو نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کیا کنواریاں والا میں ہمیشہ سے ایسا ہوتا آ رہا ہے یا اس کی آنکھ ہی اب کھلی ہے۔ نکاح رب کا بنایا پاکیزہ قانون۔ قانون قدرت کے مخالف ہوتے معاشروں میں ایسے گناہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

زینو کے گھر کے بڑے سے احاطے میں دروازے کے ساتھ چار پانچ بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ اکبر انہیں چارہ ڈال رہا تھا۔ وہ دہلیز پار کرنے لگا۔ زہرہ کو دیکھتے ہوئے رک گیا۔

''او شہزادیے! کتنی وار کہا ہے کلی نہ گھوما کر، پچھلے دنوں وی ڈر گئی تھی، ہیں......''

زینو کی ماں کو کمرے سے نکلتا دیکھ کے وہ اس کا سر تھپکنے لگا۔ ہاتھ رینگتا ہوا اس کے گال تک آیا۔ زہرہ پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑی۔

''بے غیرت، بے ضمیر انسان...... ہری چگ۔ تُو نے مجھے کوئی کمزور سمجھ رکھا ہے۔ میں تجھے بتاتی

ہوں عورت کیا کر سکتی ہے۔"
زہرہ نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ وہ دیوانی لگ رہی تھی۔ چارپے کے پاس درانتی پڑی تھی۔ زینو کی ماں واویلا کرتی دوڑی، اکبر حیران الگ، زہرہ نے پے در پے درانتی کے کئی وار اس کے ہاتھ اور بازو پر کر دیے۔
"اب لگائے گا ہتھ مجھے...... کمینے پہلے دی کہا تھا، میرا ئیں اپنے گھر کا دھیان رکھا کر۔"
وہ بولتی جا رہی تھی۔ اکبر کی بیوی رسوئی سے آدھا ادھورا منظر دیکھ کے گال پیٹتی ہوئی بین کرنے لگی۔ کیوں کہ اکبر درد سے دہرا ہوا چارپے پر گرا پڑا تھا، زینو ننگے سر باہر نکلی۔
"اماں تو زہرہ کو لے جا یہاں سے۔ یہ دیوانی ہو گئی ہے۔ جان سے مار دے گی اسے۔"
زینو کی ماں زہرہ کو بازوؤں میں جکڑے باہر نکل گئی۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ اکبر نے اپنی مردانگی کی خاطر اٹھنا چاہا، مگر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا بازو جیسے شل ہو گیا تھا۔ وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ سارے میں یہ خبر پھیل گئی کہ زہرہ نے اکبر کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے، مگر وجہ جانتے ہوئے بھی کسی نے کچھ کہنے کی ہمت نہ کی۔ ارباز دسیر بار بار زہرہ پہ جھپٹتا، پھوپھیاں اور چاچی الگ روندی جاتیں۔ زہرہ نڈر انداز میں اسے گھورتی تو وہ اور بپھرتا۔
حالات ایسے ہی چل رہے تھے کہ اجاڑ دھرتی پر بہار نے قدم رکھ دیے۔

☆❁☆

شام میں وہ واقعی جلدی لوٹ آیا تھا۔ تب تک بادلوں نے مکمل اندھیرا بچھا دیا تھا دھرتی پہ۔ اس نے ارد گرد منظر کا جائزہ لیتے ہوئے بیل پہ ہاتھ دھرا۔ کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔
"السلام وعلیکم!"
"وعلیکم السلام! تمہیں ڈر تو نہیں لگا؟" اس نے فقط نفی میں سر ہلایا۔
"اوئے رکو...... روئی ہو تم؟" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے اندر آ گئے۔
"کھانا لاؤں؟"
"ہاں لے آؤ۔" وہ کچن میں آئی چائے کا پانی رکھا اور کھانا نکال کے لے گئی۔ اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کھانے کے بعد چائے لائی۔ وہیں بیٹھ گئی۔
"اب بتاؤ، رو کیوں رہی تھیں؟" وہ چپ رہی۔
"تم خوش نہیں ہو؟" وہ چیخی۔
"تمہیں معلوم بھی ہے کہ مجھ سے اچھے الفاظ نہیں بولے جاتے۔ زیادہ ماسٹر جی نہ بنا کرو۔" وہ ہنس دیا۔
"مطلب خوش ہو...... ہوں؟" چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"اب میں نے یہ بھی نہیں کہا۔" رکھائی سے کہا۔ وہ چونکا۔
"تم مجھے چونکا دیتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، مگر کچھ ہے جو صحیح نہیں ہے۔"
وہ بنا کچھ بولے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ لمحوں بعد وہ بھی پیچھے چلا آیا۔
"میں نے آج تمہارے سارے کپڑے تیار کر دیے ہیں۔ ایک ڈیڑھ ہفتہ آسانی سے نکل جائے گا تمہارا۔" وہ الماری میں لٹکے کپڑوں کو بلاوجہ ہاتھوں سے ادھر ادھر کرتے ہوئے بولی۔
"تم رہنے دیتیں۔ کیا ضرورت تھی خود کو تھکانے کی۔ ادھر ہی ہو تم کون سا بھاگی جا رہی ہو۔" وہ ہنس دی۔ کتاب اٹھاتا اس کا ہاتھ رکا۔ وہ متعجب سا اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اس کے دل میں وسوسہ سا جاگا۔

☆❁☆

"کنواریاں والا" میں قدرت نے سبز پوشاک پہن لی۔ سرد جمود ٹوٹ گیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ نکھر گئی۔ زہرہ کے گھر کی تنگی سکھ چین بھی

اپنے بدن پر سبز رنگ ملنے لگی۔ جودن بہ دن گہرا ہوتا گیا۔

"زہرہ...... جا میری دھی! یہ حلوہ نعمت کو دے آ۔ دوپہر کہہ گئی تھی مجھے۔"

شہر بانو کی ایک ہی دوست تھی نعمت بی بی۔ دونوں ایک دوسرے کو سوغاتیں بھیجنے میں پیش پیش رہتیں۔ ابھی بھی سب ہی چھوٹی بہنیں مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے گئی تھیں تو شہر بانو اس سے کہنے لگی۔ وہ کٹورا تھامے سندھوؤں کے گھر چلی آئی۔ پھاٹک نیلو نے کھولا۔ اسے دیکھ کے سخت بدمزا ہوئی۔ زہرہ بنا پروا کیے اسے ہاتھ سے پرے کرتی اندر گھس گئی۔ بڑے سے صحن میں خاصا رش لگا ہوا تھا۔ سب ہی پیالیوں میں لبالب بھری خوش رنگ چائے سے انصاف کررہے تھے، وہ اجتماعی سلام لیتے ہوئے نعمت پھوپھی کو پیالا تھمانے لگی۔

"بیٹھ جا زہرہ! چاہ پی کے جانا۔" نعمت بی بی نے پیالے کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھامتے ہوئے کہا۔

"نہ پھوپھی! تسی پیو۔ میں جلدی گھر جانا اے۔ اک کم ہے۔" وہ ہولے ہولے سے وضاحت دے رہی تھی۔ زراور حسن پہلی بار اس کی جانب متوجہ ہوا اور پھر اس کے پھاٹک پار کرنے تک متوجہ ہی رہا۔

"اسے کیا ہوا؟ بڑی انقلابی تبدیلی معلوم ہورہی تھی اس میں۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"کیوں، تجھے کیا معلوم پڑا ہے اس میں؟" اماں نے مسکرا کے پوچھا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے اگر پہلے والی زہرہ ہوتی تو کہتی، 'لے آ' چاتے گاجر کا حلوہ۔ ساڈے گھر تے کوئی منہ وی نہ لگادے۔ ماسا (بالکل) چنگا نئیں لگدا مینوں۔" وہ ہو بہو زہرہ جیسا لہجہ اپناتے ہوئے بولا۔ سب ہی ہنس دیے۔

"ناں ویرے اک گل تو بتا۔ تو نے زہرہ کو اس طرح کی باتیں کرتے کب سنا ہے؟" نیلو ترنت میدان میں اتری۔

"لو، بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ شکل نہیں دیکھی تو نے اس کی۔ اس کی ناک دیکھ کے کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ وہ کتنی 'اونچی' ہے۔ کسی مصر کی رانی جیسی۔" وہ بے نیازی سے تبصرہ کررہا تھا۔ نیلو ذرا متاثر ہوئی۔

"اچھا...... تو بتا رہا تھا کہ ادھر فوجی بستیوں میں کوئی ریڑھی، ٹھیلے والا بھی نہیں آتا۔ تے فر پتر! لوگ سبزی، ترکاری کدھر سے لیتے ہیں؟"

نعمت کی سوئی ابھی بھی اسی ادھوری کہانی میں اٹکی تھی۔ زراور کچھ بتا رہا تھا مگر کٹورا واپس لینے کے لیے آئی زہرہ خالی الذہن سی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر ٹھہر گیا تھا، جیسے کمپاس کی سوئی نے منزل کا تعین کردیا ہو...... فوجی بستیاں...... محفوظ و ناقابل رسائی۔

☆❁☆

"اماں تو مجھے وہ والا گلابی سوٹ لے دے نا۔"

زہرہ نے گاؤں کے درمیانی چوک میں کپڑا بیچنے والے کے قالین پر پڑا گلابی اور سیاہ رنگ کا سوٹ دیکھتے ہی ماں کے کانوں میں گھس کے فرمائش کی۔

اماں کے بھینسوں کو نہلاتے ہاتھ تھم گئے۔ بڑے دنوں بعد زہرہ نے کوئی فرمائش کی تھی۔

"وہ گلابی اور سیاہ والا؟" اماں خود ہی ذہن میں رشید کپڑے والے کی دکان میں پڑے سارے گلابی سوٹوں کو دہراتے ایک پر ٹھہر گئی۔

"ہاں وہی والا۔"

زہرہ نے برگد کی لٹکی ٹہنی کو جھٹکا دیا۔ سفید بگلوں کا غول سہم کر چوکنا سا اڑا۔ پھر سے بیٹھ گیا۔

"نا میری دھی! یہ والا تو نئیں، پر چل تو کوئی اور پسند کرلے۔ وہ لے دوں گی تجھے۔"

"نا ایویں کوئی اور پسند کرلوں۔ جو پسند ہے،

وہی چاہیے بس......" وہ باڑے کی درمیانی دیوار پر چڑھ کے بیٹھ گئی۔

"پیر اعظم شاہ نے کالا رنگ پہننے سے منع کیا ہے تجھے۔ یاد نہیں کیا کہا تھا انہوں نے۔ کالا رنگ ڈنگتا ہے تجھے۔" (ڈستا ہے تجھے)۔

"بس کر دے اماں! پیر اعظم شاہ کہتا ہے تو کالا رنگ نہ پہنوں۔ پیر اعظم شاہ کی پھوپھی کہتی ہے تو شادی نہ کروں۔ یہ پیر ایک دفعہ ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ مر جاؤں۔ یہ قسطیں کیوں کر رہے ہیں میری جنذڑی کی۔ مجھے وہ گلابی سوٹ ہی چاہیے۔ نئیں تو پیروں کے میلے پر سارے "عقیدت مندوں" کے سامنے وہ بین ڈالوں گی نا کہ اگلی پچھلی ساری "دعائیں" اٹھالیں گے وہ ہم پر سے۔"

زہرہ کی چلتی زبان کو ایک مردانہ قہقہے نے جامد کیا تھا، وہ بے ساختہ مڑی، زرداور اس کے قریب دیوار پر جھکا، اس کی ماں کو سلام کہہ رہا تھا۔ وہ لٹھ مار انداز میں دیوار سے اتری۔ ہاتھ والے نلکے سے ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اس دوران زرداور کی ساری باتیں وہ سن رہی تھی۔

"خالہ! اگر اسے بخار تھا تو ڈاکٹر کو دکھاتی نا۔ اب کون سا دور ہے، دم سے بخار ٹھیک کرنے کا اور یہ رنگوں کے پہننے یا نہ پہننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ لے دیں اسے گلابی سوٹ۔ دل سے بڑا پیر اور کوئی نئیں اور اگر اس کا دل کر رہا ہے تو روکنا غلط ہے۔"

"ارے بیٹا تو نئیں جانتا اسے۔ خالی بخار نئیں تھا اسے۔" سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "دورہ پڑا تھا اسے۔ وہ اکبر ہے نا شہباز کا چچیرا بھائی، اس کا بازو چار جگہ سے کاٹ دیا درانتی سے۔ پوچھا تو بولی، چھوتا ہے نا مجھے۔ بے نا کملی۔ وہ اس کے باپ سے بھی نو ماہ بڑا۔ اس نے اگر سر پہ ہاتھ پھیر دیا تے اس کا کون سا سونا جھڑ گیا۔ فیر گھر آئے سب کو گھورتی رہی۔ اٹھ اٹھ کے بھاگتی رہی۔ اماں بدبو آتی ہے، اماں بدبو آتی ہے۔ ہائے ماں کا دل پھٹ گیا، لے کے دوڑی گئی پیر اعظم کے پاس۔ اسے وی چھونے نہ دے۔"

زرداور نے نظریں اٹھا کے دیکھا، دروازے کی اوٹ میں چھپی زہرہ کی آنکھ میں آنسو تھا۔ اس کے دیکھنے پر وہ پھاٹک پار کر گئی۔ زرداور سر جھٹک کے تاجاں کو سننے لگا، مگر وہ بھی کملا تھا، بھلا سر جھٹکنے سے بھی سوچیں جھٹکی جا سکتی ہیں؟

☆❁☆

"اماں! یہ وسیروں کی زہرہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

رات ڈھلے ہر دھندے سے نمٹنے کے بعد بھی زرداور اس آنسو کی بے بسی نہ بھول سکا تو رضائی میں دبکی نعمت کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کج نئیں، بس ایویں جھلی ہے وہ۔ جن غموں سے کنواریاں اکھ بچاتی پھرتی ہیں، یہ انہیں غموں کے مقبرے بناتی انہیں روتی پھرتی ہے۔ کوئی مت نئیں اس جھلی کو دی۔ کوئی اسے پوچھے کہ کہاں لکھا ہے اس سوہنے نے کہ سوہنی شکل کے ساتھ، نصیبا وی سوہنا ہی دے گا۔"

نعمت نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ زرداور کے کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ نیلو جو نہ جانے کب سے بیٹھی تھی بول پڑی۔

"کوئی غموں کے مقبرے نئیں بناتی وہ۔ تاک نئیں دیکھی اس کی۔ غموں کو روتی پھرتی تو اس کی ماں اعظم شاہ کے پاس کبھی نہ لے جاتی۔ بات ساری یہ ہے کہ وہ اندر سے، باہر سے بھی زیادہ سوہنی ہے۔ میلی نئیں ہونا چاہندی وہ۔ "چور راستوں" سے باغی ہے اماں۔"

زرداور نے نیلو کی بات کو بہت جانا۔ اٹھا اور چھت پر بنے کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ "میلی نئیں ہونا چاہتی۔" تو کیا باقی سب کنواریاں میلی ہیں۔ میری پھوپھیاں، میری بہن، چچیری دو بہنیں۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ پھر ساری رات بیٹھا ہی رہا۔ باہر کنواریاں والا کی تہ کے نیچے چھپے جھینگرے اک نئی جنگ کے پیش نظر اپنی آوازوں

کے ساز بدلتے رہے۔ قدرت کتاب کائنات کا اک اور ورق الٹنے کو تھی۔ اک نئی صبح ہونے کو تھی۔

میلہ شروع ہو گیا۔ رنگ، رونق، خوشیاں بڑے عرصے بعد کنواریاں والا کا ہر رہائشی مسکرا رہا تھا۔ بچوں نے اپنے گلے توڑے، بڑی بوڑھیوں نے کپڑے کی تھیلیوں میں لپٹے آخری سکے تک نکال لیے، جب کہ خواتین بھی پیتل کی آرائشی کٹوریوں اور گھڑوں کو کریدتی رہیں۔

"شہباز وسیر" نے میلے کے لیے الگ سے پانچ ہزار بھیج دیا تو فاطمہ و سکینہ ڈھائی ڈھائی سو ہاتھوں میں لے کر جذبات میں جوتا پہنے بغیر ہی میلے کو دوڑ گئیں۔ ارباز وسیر نہ جانے کدھر مصروف تھا۔ صرف پانچ بجے ہونے والی کبڈی میں ہی شکل دکھاتا۔ آج تیسرا دن تھا، میلے کا آخری دن۔ زہرہ کے لیے پہلا دن، کیوں کہ وہ صرف تیسرے دن ہی آئی۔ وہ زینو۔ کے ساتھ جلیبی والے کے پاس کھڑی تھی، جب کسی نے اس سے پوچھا۔

"تو بالآخر گلابی سوٹ لے ہی ڈالا تم نے۔"

وہ چونک کے مڑی۔ زراور کندھوں پر شال ڈالے، مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شکریہ تو کہہ دو۔"

"وہ کس لیے بھلا؟"

"سفارش کی تھی۔ گلابی رنگ کی۔"

زہرہ نے ایسے سر ہلایا جیسے "سمجھتے رہو سانوں کی۔"

"مگر اس سیاہ رنگ کی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ واقعی ڈنگتا ہے۔" وہ تھم گئی۔

"میرا مطلب ہے...... تمہیں، دیکھو رنگ کیسا زرد ہو رہا ہے۔"

زینو جلدی سے آگے بڑھی۔ اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی دور لے جانے لگی۔ زہرہ نے مڑ کے دیکھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ آنکھیں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور دیکھتا ہی رہتا، اگر درمیان میں رکاوٹ نہ آ جاتی۔

"اکبر وسیر۔"

"اوئے، کیا کہہ رہا تھا اسے کاکا؟" تند لہجہ، تنا ہوا چہرہ۔

"میری کیا مجال جی...... میں نے اپنا بازو چھڑوانا ہے۔" نرم لہجہ، پرسکون مسکراہٹ۔ اکبر جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

☆❁☆

لٹھے دی چادر......

لٹھے دی چادر......

بھولا بسرا انداز، بھولی بسری مسکراہٹ، سب کا خیال تھا زہرہ ٹھیک ہو رہی ہے، مگر یہ صرف زہرہ جانتی تھی کہ اسے اس بند دہانے والے غار میں باہر کا رستہ مل گیا ہے۔ وہ مسکراتی جاتی اور گنگناتی جاتی۔

شام کا وقت تھا۔ کنواریاں والا کے ہر گھر میں ہانڈیوں کو بگھار لگائے جا رہے تھے۔ مرد اپنے کھیتوں میں آخری کام نپٹا رہے تھے اور زہرہ، شہباز وسیر گلی کے اس نکڑ پہ کھڑی تھی، وہ نکر جو باڑے سے سندھووں کے گھر کو مڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود بھٹہ ختم ہونے کو تھا۔ وہ باڑے سے آیا۔ اپنے دھیان میں مڑ گیا۔ گلی تقریباً سنسان پڑی تھی۔ کبھی کوئی بچہ اس کے قریب سے بھاگتا تو وہ چونک پڑتا۔ چھن، چھن، چھن یہ آواز مسلسل اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ مسکراتا، مگر مڑ کے نہ دیکھتا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ چھنکار میں جھنجلاہٹ در آئی ہو۔ وہ اپنی شال کو گردن کے گرد بل دے کے گلی کے درمیان میں رک گیا۔ مڑ کے دیکھا۔ وہ ٹپٹا گئی۔ ہاتھ مسلنے لگی۔

"کچھ کہنا تھا؟"

"نہیں۔" زہرہ نے فوراً سے پہلے جواب دیا۔ جو کام وہ بہت آسان سمجھتی تھی وہ جان کو آ گیا۔ وہ جھنجلا کے مڑنے لگی۔ زراور نے جلدی میں اس کا ہاتھ تھاما۔

"ہاتھ چھوڑ، پتا ہے نا ہاتھ کاٹ دیتی ہوں۔"

"او...... ہاں...... ہاں۔" زراور نے لمحہ ضائع کیے بنا ہاتھ چھوڑ دیا۔ زہرہ کھلکھلائی، زراور بے بس

ہوا۔

"بات کرنی ہے تم سے۔" جو وہ چاہتی تھی وہی ہوا۔

"یہاں نہیں۔ کل دن گیارہ بجے کنواری بی بی کے مزار پر......" بات مکمل کر کے وہ کسی فاتح کی چال چلتی واپس مڑ گئی۔ بڑے حساب کتاب کیے تھے اس نے۔ ناکام ٹھہرتی تو روح دوسری سانس بھی برداشت نہ کرتی۔

☆❁☆

پہلی بار وہ کنواری بی بی کے مزار پہ ملے، دوسری بار زینو کے باڑے اور تیسرے بار امرودوں کے جھنڈ اور ان تین ملاقاتوں کے بعد زہرہ کو یقین ہو گیا کہ اس نے صحیح بندہ چنا ہے۔ وہ اس سے چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھتا، بات کرتے ہوئے اس سے زیادہ دوسری چیزوں کو دیکھتا اور کوئی معیوب بات بھی نہ کرتا۔ تیسری ملاقات کے بعد وہ زینو کی طرف بھاگی۔

"میرا دل صحیح کہتا تھا زینو! پورے کنواریاں والا میں یہ ہی مرد کا بچہ ہے جو میرا سودا پورا کر سکتا ہے۔"

"دیکھ لے زہرہ! میرا دل بڑا ڈرتا ہے۔ یہ نہ ہووے وہ اپنا مطلب پورا کر کرا کے ادھر فوج میں واپس چلا جائے۔ پھر تو کیا کرے گی؟"

"تو وی جھلی ہے۔ مطلب پورا کرنے کا کیا وہ رج کے دیکھتا وی نہیں ہے مجھے، جب میں اس سے گل کرتی ہوں تے مجھے کوئی ڈر یا دھڑکا نہیں ہوتا اور فیر جان دیتا ہے مجھ پہ۔ آج کہہ دوں نا کہ میرے گھر پیغام بھیج تو ابھی کے ابھی ہماری دہلیز پہ آ کے کھڑا ہو جائے۔"

"او گل تے ٹھیک ہے، پر جے او ہر گل سے مکر گیا تو فیر......" زینو ہراساں ہو رہی تھی۔

"تجھے کیا لگتا ہے مکرنے دوں گی اسے...... تو بس دیکھتی جا۔" اور زینو واقعی دیکھنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ جو مزید خوب صورت ہوتا جا رہا تھا۔

☆❁☆

"اک گل پوچھوں؟" زہرہ کے استفہامیہ انداز پر زراور کچھ ٹھٹکا۔

"پوچھو۔" اجازت دے کے وہ خود دوبارہ اس چمکتے امرود کی طرف متوجہ ہو گیا جو کب سے اس کے لیے "کھٹا" ثابت ہو رہا تھا۔ وہ پنجوں کے بل اوپر اٹھا، پھر ایک پتے سے ٹہنی اور ٹہنی سے امرود تک پہنچا۔ پکے نالے کے بہتے پانی سے ان چار امرودوں کو دھویا، پھر اپنے اور زہرہ کے درمیان سجاتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوا۔

"تو میرے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔"

"کم از کم صوبہ سرحد تک تو جا ہی سکتا ہوں۔"

اس کے اتنے سنجیدہ جواب پہ زہرہ پہلے چپ سی رہ گئی، پھر سمجھ میں آنے پر چڑ گئی۔ وہ امرود کو ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کے بھینچ رہا تھا۔ نرم کر کے اسے دو حصوں میں کیا اور خوب معائنہ کرنے کے بعد کھانے لگا۔ زہرہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"تیرے جواب نے مجھے "لاسوال" جو کر دیا ہے۔" زراور کا قہقہہ بلند ہوا۔ امرود کے درخت پر موجود گھونسلوں میں ننھے پرندے جگہ بدلنے لگے۔

"جھلی ہے تو۔ کرنے والے کر جایا کرتے ہیں اپنی حدیں ناپتے، تخمینے لگاتے ہی نہیں رہ جاتے۔ تم لڑکیوں کو نہ جانے کیسی تسکین ملتی ہے ایسے سوالوں سے۔" وہ دوسرا امرود کھانے لگا۔

"مطلب تو میرے لیے کچھ وی کر سکتا ہے۔"

اس نے "کان" کو دوسرے ہاتھ سے پکڑا۔ زراور اس کی ذہانت پر سر دھننے لگا۔

"بتا ناں؟"

"تجھے پتا ہے مجھ سے ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ ایسی مشکل مشکل باتیں نہ پوچھا کر، پوری ماسٹرنی لگتی ہے۔"

"صرف ہاں یا ناں ہی تو کہنا ہے سرکار تسی۔"

وہ بات لمبی ہوتی دیکھ کے گھبرانے لگی۔

"چلو پوچھو۔"
"اچھا بتاؤ میرے لیے کسی بھی حد تک جائے گا؟"
"ہوں...... جاؤں گا۔"
"چاہے وہ حد کنواریاں والا سے باہر جاتی ہو؟"
"مطلب......؟" یہ ایسا "مطلب" تھا جو اکثر سمجھنے کے باوجود نا سمجھی ظاہر کرتا ہے۔ وہ ہچکچائی۔
"مطلب تیری فوجی بستی میں...... ہماری شادی تو کبھی نہ ہو سکے گی۔"
وہ ڈرتے ڈرتے کہہ گئی۔ کچھ لمحوں کے لیے بول نہ سکا۔ زہرہ کا دل ایسے دھڑکا جیسے کسی قریب المرگ شخص کا دھڑکتا ہے۔ کبھی تیز، کبھی بالکل مدھم، اگر اس نے نا کہہ دی تو...... وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ زہرہ نے اس کی آنکھوں میں حساب کتاب کی تفصیل پڑھنی شروع کی۔
"نیلو صحیح کہتی ہے۔" بالآخر بولا۔
"کیا......" اب کیا بول دیا اس نیلو مرجانی نے۔
"بڑی زہریلی ہے تُو۔" وہ ایک جملے میں سب کہہ گیا۔ زہرہ کا دل پہلی بار دھڑکا۔ اس کے حساب کتاب میں کچھ غلط ہونے جا رہا تھا۔
"وہ کیا تھا؟"
وہ زہرہ کی زر اور سے محبت تھی۔ جو زہرہ کے لیے کبھی بھی شامل نصاب نہ رہی تھی۔ مگر محبت فضا میں موجود نمی جیسی ہوتی ہے۔ ہر شے پر اثر پذیری دکھاتی، اس کی ہستی بدلتی...... محبت چاہے نامحسوس سی ہی سہی۔

☆❁☆

اس رات "کنواریاں والا" پہ کہر قیامت سا پڑا تھا۔ ٹھنڈ ایسی تھی کہ چولہوں میں پڑی آگ ٹھٹھرتی اور راکھ ہوئے جاتی۔ اس برف کی سی رات میں زینب بشیر کے گھر کے پچھواڑے والے احاطے میں دو تاریک سائے دھاگوں سے الجھتے چلے جاتے۔

"دین کی گل نہ کر چاچا بشیر...... دین تے کہتا ہے کہ بیٹی کے جوان ہونے کے بعد چوتھا چاند بھی نہ دیکھو اور بیاہ دو وا سے۔ اس 'کنواریاں والا' میں زندگی سے زیادہ 'مریدی' چلتی ہے۔"
وہ ٹھیک تھی۔ چاچا بشیر مرنجان مرنج تھا۔ بات کرتا تو لگتا منت کر رہا ہے۔ جانے کیوں زہرا شہباز وسیر نے سارے کنواریاں والا میں سے اسے ہی اپنا وکیل چنا تھا۔
"دیکھ میری گل سن چاچا...... جس طرح جب سیلاب گھر کی بیرونی دیواروں کو چھونے لگے تو اس گھر میں رہنا حماقت اور بے وقوفی ہے ناں...... اسی طرح جو روایات نسلوں کا نقشہ مسخ کرنے لگیں تو ان کی پیروی بھی حماقت اور خودکشی ہی ہے۔"
"پر زہرہ! میں وی بیٹیوں والا ہوں۔ شہباز کی عزت میری وی تے......" وہ ممیائے تھے۔
"اسی عزت کے لیے تے کر رہی ہوں یہ سب چاچا جی......" وہ لب چباتی اور پھر بولتی۔
"تسی حساب کرتے رہو چاچا بشیر...... ادھر گاؤں کی ہر لڑکی ہر دوسرے دن زینب دی طرح کہیں گر گر کر گال اور گردن کا گوشت گنواتی پھرے گی...... لڑکیوں کو اتنا نہ گراؤ چاچا جی۔"
لبالب بھری آنکھوں اور آواز سے بات مکمل ہوئی تو سارے گاؤں کے لیے سیدھے سادھے بشیر وسیر نے آنکھوں کو آخری حد تک پھیلا کے اس لڑکی کو سنا تھا۔ 'کنواریاں والا' کے گیدڑوں نے مل کر وہ بین ڈالے کہ قدرت کا ہر ساز بہرہ ہو گیا۔ دو وجود ابھی بھی الجھتے جاتے تھے مگر بے آواز......!

☆❁☆

کنواریاں والا نے اسے کبھی نہ چھوڑا۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہا ان بارہ دنوں میں بھی جو اس نے گوجرانوالہ میں گزارے تھے۔
"کنواریاں والا" میں قہر پھوٹ پڑا تھا پہلی بار کسی کنوار نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ارباز وسیر پاگل ہونے کو تھا۔ صبح ہوتی، شام آتی اور رات ڈھل جاتی،

سارے مرد و ہیروں کی عورتوں کو ادھیڑتے مگر کسی کو معلوم ہوتا تو ہی بتاتیں ناں۔ زینو کا منہ ہر روز سوجتا، ہونٹ پھٹتے، بال جڑ سے اکھڑتے مگر وہ نہ بولتی...... بولتی بھی تو کیا...... وہ تو گئی ہی واپس لوٹنے کے لیے تھی۔

نذرا قدبیڈ پر بیٹھا تھا زہرہ چائے لائی وہ شکریہ کہہ کے پینے لگا...... وہ خالی کپ واپس رکھنے گئی۔ واپس آئی تو وہ سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔'' کمال ظرف تھا اس شخص کا وہ اس سوالوں کی مشین سے کبھی نہ اکتایا۔

''تمہیں میری سب سے خاص بات کیا لگتی ہے۔''

وہ اپنی نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر مسکرایا۔

''بس اس بات کا جواب دے دو۔ وعدہ کرتی ہوں آئندہ کسی بات کے لیے تنگ نہیں کروں گی۔''

وہ اپنی آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

''بس آخری دفعہ، یاد رکھنا آئندہ میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔'' وہ فقط سر ہلانے لگی۔ وہ بولا، انداز پرسوچ تھا۔

''ہوں...... تمہارا کردار۔''

زہرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ گھر چھوڑنے کے بعد سے اسے لگتا تھا کہ شاید آئندہ وہ کبھی یہ جملہ نہ سن سکے۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

''تمہارا ڈٹ جانا ہر اس چیز کے خلاف جو تمہاری راہ میں ذرا سا بھی بل پیدا کردے اور...... تمہاری مسکراہٹ میں شاید...... تمہیں بھی نہ...... بتاسکوں...... یار زہرہ! مجھے نیند آرہی ہے باقی کی خصوصیات صبح...... ناراض مت ہونا۔'' دھندلائی آنکھوں سے وہ زہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ نیند میں بھی پریشان تھا وہ، اٹھنا چاہتا تھا مگر آنکھیں کھل ہی نہ پارہی تھیں۔

زہرہ جی بھر کے رونے کے بعد اٹھی اور واش روم میں گئی۔ روشن دان میں پڑے ایک شاپر میں کچھ روپے اور سادہ کاغذ پر ایک تحریر درج تھی۔ وہ باہر آئی بیڈ کی جانب دیکھے بنا الماری سے سیاہ بڑی سی چادر نکالی۔ اوڑھ کے باہر نکلنے لگی۔ رکی، مڑ کے دیکھا۔ پھر تیزی سے باہر نکلی۔

بادل پوری قوت سے گرج رہے تھے۔ بارش نے سب کچھ جل تھل کررکھا تھا۔ زہرہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''ربا، تجھے سب سے پیاری چیز کی قربانی بڑی پسند ہے ناں میں نے دے دی قربانی۔ تو قبول کرلینا اب۔'' روتے ہوئے دل میں رب سے مخاطب تیز تیز چلنے لگی۔ ہوا۔۔ اسے پیچھے کو دھکیلتی مگر وہ چلتی رہی پھر بھاگنے لگی۔ بھاگتی ہی رہی۔ بس اک جگہ رکی۔

''او پاء جی اے زہرہ اساں نوں (ہمیں) مل گئی ہے۔ میں مقبول بولتا ہوں۔ زہرہ دی خالہ کا بڑا بیٹا......''

یہ الفاظ بول کے فون رکھتے ہوئے اس پی سی او کے مالک نے اس لڑکی کو حیرانی سے دیکھا جو اسے اس کام کے پورے پانچ سو دے گئی تھی۔

☆❁☆

''اماں...... اماں!''

بلقیس دھاڑ سے دروازہ کھولتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ تاجاں نے دہل کر اسے دیکھا۔ ایک مدت بعد کنواریاں والا میں سرخ گھٹا چھائی تھی۔ تاجاں سوکھے تلوں کو پودوں سے جھاڑ رہی تھی۔ ساری پھوپھیاں بھی دیکھنے لگیں۔

''وہ اماں! زہرہ...... زہرہ...... ادھر بڑے چوک میں......''

تاجاں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر کو دوڑی، چاچی اور پھوپھی بھی۔ فاطمہ نے چیخ چیخ کر رونا شروع کردیا کیونکہ اماں اتنے دنوں سے اسے ایک ہی دعا سکھا رہی تھی۔

''دعا کر میری زہرہ کدی وی پکڑی نہ جائے۔

جتنی سوہنی وہ خود ہے ناں اتنے ہی سوہنے نصیبوں والی بھی ہو۔ تو دعا کر فاطمہ وہ پکڑی نہ جائے۔"

بڑے چوک میں تماشا لگا تھا۔ گاؤں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی ذی روح موجود ہو۔ جسے جہاں خبر ملی وہ ویسے ہی بھاگتا آیا۔ وسیروں کے سارے "غیرت مند" مرد زہرہ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

تاجاں نے اسے دیکھتے ہی دل تھام لیا۔ وہ زہرہ تو نہ تھی۔ اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ وہ چل نہ رہی تھی رینگ رہی تھی۔ اکبر وسیر آگے بڑھا اور زہرہ کو بالوں سے گھسیٹتا مجمع میں لایا۔ اتنی بات تو زہرہ جان ہی چکی تھی کہ گاؤں میں کسی کو اس کے زراور کے ساتھ بھاگنے کا علم نہ ہوا تھا۔ ارباز نے اس کی پسلی پر لات رسید کی۔ زہرہ بلبلائی، تاجاں، مہربانو اس کی طرف بڑھیں، جنہیں ارباز نے بڑی تندی سے پیچھے دھکیل دیا۔ زہرہ نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کے تاجاں کو دیکھا۔

"ہماری نسلوں کو بٹہ لگانے والی ڈائن ہے یہ۔ چھوڑوں گا نہیں میں اس......" (گالی)۔ ارباز جو سانس لینے کو تھما تھا پھر سے شروع ہوا۔

"ہنہ نسلیں...... تیری قبر پر تو کوئی فاتحہ پڑھنے والا وی نہیں ہے۔ تو نسلوں کی بات کرتا چنگا نہیں لگتا۔"

منہ پر قفل ڈالے زہرہ نے بالآخر بات کی بھی تو کیا ارباز کا ہتک کے مارے سرخ پڑتا چہرہ کف اڑانے لگا۔

"اپنے باپ، چاچا کا نام تباہ کرتی ہے کتیا...... اوپر سے بے نام ونشان ہونے کے طعنے بھی دیتی ہے۔"

"کون سے باپ، چاچا کی عزت...... کہاں کی حرمت؟" ارباز نے اس کے بال جکڑے مگر وہ بولتی رہی۔ "اگر عزت کی حفاظت کرنے والے، خیال رکھنے والے باپ کی بیٹی 'ایسا' کرے تو لعنت ہے اس کے عورت ذات ہونے پر۔ مگر تجھ جیسے، لوگوں کی عزتوں کو گنے اور مکئی کی فصلوں میں روندنے والے شخص کی عزت پر تھوکتی ہے میرے جیسی عورت اور صرف میں ہی کیا اس گاؤں کی ہر کنواری بھاگے گی۔ انہیں بیویاں بنانے کے بجائے رکھیل بناؤ گے تو ایسے ہی تمہارے عزت دار گھروں میں خاک ڈالیں گی وہ اب۔ کہاں گئی تمہاری کنواری بی بی کی دعا۔ میں تو سہاگن بن گئی نہ میرا گھر جلا نہ ہی اس گاؤں میں کوئی آفت اُتری......"

شہباز وسیر پہلی بار آگے بڑھا اور زہرہ پر ٹوٹ پڑا۔

"لے چلو اسے گھر، ایسی عبرت سکھائیں گے کہ اس گاؤں میں دوبارہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔"

سارے مرد اسے گھسیٹنے لگے۔ گاؤں کی کئی عورتوں کی سسکیاں نکلیں۔ وہ اپنے دوپٹوں کو منہ میں دبائے رونے لگیں۔

"مجھے عبرت سکھانے سے وہ غلاظت کبھی ختم نہ ہو گی جو ہر کسی کے اندر بھر چکی ہے۔ نہ وہ جو آنکھیں بند کیے ہر ظلم کا شریک کار رہتا ہے۔ میں نے سیکھا ہے کہ جیسے پانی گھر کی بیرونی دیواروں کو چھونے لگے تو گھر میں رہنا بے وقوفی ہے۔ ویسے ہی نسلوں کو مسخ کر دینے والے رواجوں کو ترک کر دینا لازم ہے۔"

لوگ ساکت سے اسے سن رہے تھے۔ ارباز اسے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ مجمع چھٹنے لگا تھا، دلوں میں کچھ اندیشے لیے......

☆❁☆

رات اپنی پوری سفا کی اور ہول نا کی کے ساتھ اتری۔ گاؤں میں اس رات......

"میں عزت سے بیاہی گئی مگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر بھی بیاہ کریں گی۔ کچھ فیصلے اور اختیارات قدرت کے ہاتھوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔"

وہ چیختی جا رہی تھی مگر بول رہی تھی۔ کنواریاں والا میں روز محشر سی خاموشی تھی صرف وسیروں کی غلیظ

گالیاں تھیں۔

بشیر وسیر ہاتھ میں درانتی لیے فصلوں سے دوڑا تھا۔ کنواریاں والا کی زمین نے آج اس کے قدموں کی دھمک میں ایک نئی دھن سنی تھی۔ پھر اہل گاؤں کی سماعتیں بھی اس دھن کو پا گئیں۔

''اوچھڈو سب عزت دارو...... چھڈو کڑی نو......'' اس گرج پر سب حیران تو ہوئے مگر جمے رہے۔

''او میں ہوں اس دے نکاح کا والی و نگہبان......اپنے ہاتھوں سے دستخط کیے ہیں گواہوں کے خانے میں۔ پوچھو کیوں......؟'' چاچا بشیر پھولی سانسوں سے بول رہا تھا۔ جگرے سے ایڑیوں پر اٹھ کے......درانتی لہرا کے بات کرتا تھا۔

''اوپچھو کیوں......؟ تین بیٹیوں کا باپ ہوں میں......'' آواز اور درانتی کانپی۔

''اوتم کیا جانو جب بیٹیاں گرتی ہیں تے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ پرناں......تم بے غیرتوں نے جانے کتنی بار اپنی بہنوں بیٹیوں کی مرہم پٹی کروائی مگر اس اینٹ کو نہ اکھاڑ سکے جس سے اٹک کے وہ گرتی رہیں۔ مگر میں نے...... میں نے ان رعشہ زدہ ہاتھوں سے اکھاڑ ڈالا اسے۔ اب کوئی بیٹی نہ گرے گی......اب کوئی بیٹی نہ گرے گی......''

بشیر چاچا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپا......جانے کتنے منظر تھے جو ایک جھوٹی کتھا کے سر ہوئے 'کنواریاں والا' کی ہر ٹھوکر زدہ عورت نے خود کو سسکیاں بھرتے پایا۔ ارباز وسیر جیسے عقاب مرد کے الفاظ بھی برف ہو گئے۔

زمین پر بے جان بیٹھی زہرہ نے مسکرا کے سب دیکھا۔ آج اسے کنوریاں والا کا آسمان نیلا نظر آیا......ورنہ وہ تو سیاہ تھا۔

☆❁☆

بشیر کے گھر میں ڈھولک کی آواز اٹھ رہی تھی اور کنواریاں والا کا دل شاد ہو رہا تھا۔ شدید ٹھنڈ میں بھی بچے ہرے اور پیلے مہندی والے جوڑے پہنے، مہمانوں میں چھپن چھپائی کھیلتے پھرتے۔ زینو کی اماں بچوں سے بتاشے اور شکر پارے چھپاتی پھرتی۔ زینو کی پھپھیاں صحن میں چار پائیوں پر جہیز بچھائے، کپڑے ٹانکے جاتیں اور بھرجائی کی غیبتیں کیے جاتیں اور زنانے میں زینو اور زہرہ رضائی میں دبکی ہاتھوں کو مہندی سے سجا رہی تھیں۔

''ہائے زہرہ! اب ہم کب ملیں گے۔ تیرے ابا تے تم لوگوں کو شہر لے جا رہے ہیں۔'' زہرہ مسکرائی۔

''ہاں ناں...... ابا کہتے ہیں نکیوں (چھوٹیوں) کو بڑی افسریں بنانا ہے۔ پڑھائی کی تو چھب ہی اور ہے۔ اصل تبدیلی تے سوچ سے آتی ہے اور سوچ تعلیم سے۔'' وہ متاثر کیے جاتی۔

''ہاں پر تیرا کیا ہوگا زہرہ...... پورا سال ہو گیا پر تیرا ڈھول سپاہی تے پکا ناراض ہی ہو گیا۔'' زہرہ پھر سے مسکرائی۔

''اچھا اک گل بتا بچی بچی......اگر میں تیرے بیاہ پرناں آتی......الٹا خط لکھ کے کہتی کہ جا آج سے تو میرے لیے مرگئی تو تو کیا کہتی؟''

''میری جان نکل جاتی اور پھر میں تیری جان وی لے لیتی۔'' زینو پٹاخ سے بولی۔

''اس سے بیاہ ہوا تھا میرا......میں خط لکھ کے آ گئی کہ لو جی......آج سے سب ختم۔ مرنہ گیا ہوگا وہ' مرنے کا نہ سوچا ہوگا اس نے، دل سے انتظار ہے اس کا اور وہ آئے گا۔''

''زہرہ باجی فوجی پاء جی آگئے۔'' سکینہ نے چوکھٹ پر کھڑے کھڑے اطلاع دی اور وہ اگلے ہی پل ننگے پاؤں اسی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ وہ سامنے تھا اور دل......وہ کہیں نہیں تھا۔ صرف دھڑکن کی آواز سنائی دیتی......دھک، دھک، دھک......!

نعیمہ ناز

کاوشِ بے سُود

باہر نکلنے سے پہلے اسے اندازہ نہیں تھا کہ یوں ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوگی۔ بہرام بلڈنگ نامی اس سال خوردہ عمارت کے گھٹے ہوئے تاریک فلیٹ میں نہ دھوپ آتی تھی نہ ہوا۔ وہاں سیلن اور نمی کا راج تھا، کھٹملوں کی اجارہ داری تھی اور مچھروں کی حکمرانی، فلیٹ سے نکل کر سیڑھیاں بھی ویسی ہی تاریک اور سال خوردہ تھیں، بلڈنگ سے باہر نکلا تو ہوا میں خنکی محسوس ہو رہی تھی۔

ہلکا سا سوئٹر ہی ڈال لیتا بدن پر تو اچھا ہوتا۔ اپنے ململ کے کرتے کو حسرت اور بے بسی سے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ بات نازک مزاجی کی نہیں تھی، دراصل بات اس کی حساسیت کی تھی وہ بہت جلد زکام

مکمل ناول

www.urdusoftbooks.com

میں مبتلا ہو جاتا تھا اور پھر اس کی جو حالت ہوتی، وہ جانتا یا اس کا خدا، اسے زکام کی سہار نہیں تھی۔ بخار برداشت کر لیتا۔ سر درد جھیل جاتا مگر زکام سے اس کی جان جاتی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ محمد علی ٹرام وے کی ٹراموں کا جنکشن تھا۔ سرخ رنگ کی ٹرام پٹری کے بیچوں بیچ کھسک رہی تھی۔ ٹرام کی مخصوص ٹن ٹن ٹن کی آواز دور تک جا رہی تھی۔

وہ دوڑ کر ٹرام کا ڈنڈا پکڑ کر سوار ہو گیا، پشت سے جڑی لکڑی کی سیٹیں یوں کھچا کھچ بھری تھیں کہ پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا جیسے لوگ کمر سے کمر جوڑے بیٹھے ہوں۔ سیٹ تو کہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔ شکر ہے رش ہو رہا ہے۔"

کاوش نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اور ٹرام کے بیچوں بیچ انجن کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کنڈیکٹر سے ذرا دور، جیب میں (ٹوٹل) دس آنے تھے جو بولٹن مارکیٹ سے صدر تک کا یک طرفہ کرایہ تھا' واپس بھی آنا تھا۔ لہٰذا کوشش یہی تھی کہ جاتے میں تو بغیر ٹکٹ' مفت میں ہی سفر ہو جائے۔

کنڈیکٹر سے بچاؤ کی اگر کوئی صورت نظر نہ آئی تو پٹری پر محوِ خرام اس ٹرام سے اتر نا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جوانی میں انسان خطرات سے کھیل ہی لیتا ہے تو اس کھیل میں نقصان فقط تھوڑے سے وقت کا ہوتا جب تک کہ اگلی ٹرام آتی اور اس میں سوار ہو کر اپنی منزل تک پہنچا جاتا۔

کاوش، دزدیدہ نظروں سے کنڈیکٹر کو دیکھ رہا تھا جو سواریوں سے کرایہ وصول کر رہا تھا۔ وہ کاوش کی طرف آیا تو نظر بچا کر کاوش دوسری طرف چلا گیا۔ مطلوبہ اسٹاپ آنے ہی والا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے صدر آ ہی گیا۔ ٹرام کے پوری طرح رکنے سے پہلے ہی وہ چھلانگ مار کر اتر اور تیز تیز قدموں سے آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں کنڈیکٹر پیچھے سے آواز نہ لگا دے مگر خوش نصیبی فی الوقت اس کے ساتھ تھی۔ نہ کسی نے پیچھے سے پکارا اور نہ ہی مڑنے پر آگے سے گریبان پکڑا۔

تیز رو چلتے ہوئے کاوش کا رخ انکل سریا اسپتال کی طرف تھا جس کے سامنے واقع ایرانی ریسٹوران کیفے مبارک میں بہزاد دہلوی اس کے منتظر تھے۔ وہ چلتا جا رہا تھا۔ جائزہ لیتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔

بڑی بڑی صاف ستھری سڑکیں جن پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی اور ٹریفک میں تھا، سرخ اور نیلی ٹرامیں، سرخ ہی رنگ کی ڈبل ڈیکر بسیں، ایک آدھ اور بڑی بسیں، کہیں کہیں کالی ٹیکسی اور خال خال نظر آتی دو چار اقسام کی کاریں۔ ان میں صابن دانی جیسی چھوٹی سی کار بھی شامل تھی۔ ہاں سائیکلیں اور تانگے جا بجا نظر آ جاتے تھے' ابھی ہوا اور فضا ٹریفک کے دھوئیں اور شور سمیت مختلف قسم کی آلودگیوں سے پاک تھی۔

یہی وجہ تھی کہ سڑک کنارے اور ادھر ادھر لگے درخت' پیڑ پودے' پھول، سرشاری کے عالم میں جھومتے تھے۔ اس خالص اور صاف ستھری ہوا سے محظوظ ہوتے تھے۔ ابھی ہوا اور فضا نے آلودگی کا ثقیل بوجھ اپنے دامن میں سمیٹا نہیں اور نہ وہ اتنی بوجھل اور تھکی ماندی تھا۔ ابھی تک ہوا سبک پا ہو کر بے خودی میں گنگناتی اور فضا سرخوشی میں گنگناتی تھی۔

ابھی ان بلند و بالا گھنے درختوں پھل دار' پیڑوں، سرسبز جھاڑیوں اور دیواروں سے لپٹی مختلف رنگوں اور پھولوں کی بیلوں پر خوبصورت رنگ کی تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ رنگ رنگ اور طرح طرح کے پرندے ان پر اپنے مسکن بناتے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں جا بجا پرواز کرتے دکھائی دیتے تھے اور نوع بہ نوع کے یہ پرندے اپنی چہکاروں سے سننے والوں کی سماعتوں میں رس گھولتے تھے۔ ان کی چہکار سے حمد و ثنا سے دن کا آغاز ہوتا تھا اور شام ڈھلے اپنے اپنے گھونسلوں میں واپسی کی اڑان، قابل دید منظر ہوتا تھا۔ یہ پرندے پیغامبر تھے۔ آتے اور

www.urdusoftbooks.com

جاتے موسموں کے پیغامبر کوئل کوکوکی تان اڑاتی تو لوگ بآگ سمجھ جاتے کہ آم کے درختوں پر بور کی بہار اپنا رنگ جمانے والی ہے۔

بلبل کے گیت فضا میں گونجتے اور اپنے سر تال میں آمد بہار کی خوشخبری لے آتے ہیں۔

موسم سرما کی آمد سے ذرا پہلے ہی راج ہنس کے جھنڈ کے جھنڈ گرمائی علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔

وہ خوبصورت اور معصوم پرندہ تلور جسے اب شہزادوں کے شکار اور تسکین کی نذر کر کے نسل تقریباً معدوم کردی ہے وہ سخت سردی بلکہ لفظاً انجماد میں اپنے ترانے سناتا ہے۔

شب و روز کی تسبیح میں گرمی کی آنچ آتی حبس اور لو فضا کا حصہ بن جاتے تو بھولی بھالی فاختہ درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں پر اپنے گھونسلے بنانے لگ جاتی ہے۔

کاوش مسعود اپنے خیالوں کی اڑان میں اڑتا ہوا، اپنی سوچ کے بہاؤ میں بہتا ہوا کیفے مبارک پہنچ گیا جہاں بہزاد دہلوی اس کے منتظر تھے۔

"آؤ میاں! تم تو گویا اچھا وقت ہوگئے۔ اتنی دیر لگا دی۔" بہزاد دہلوی نے اپنی رعب دار آواز میں حسب عادت فقرہ بازی شروع کردی۔

"بہزاد بھائی!" کاوش نے کرسی پیچھے کی اور بیٹھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ "اچھا وقت بھی شاید پارس ہوتا ہے۔ دوسروں کا تو بھلا کرتا ہے۔ خود وہی رہتا ہے پتھر کا پتھر اور اچھے وقت میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ گزر جاتا ہے۔ نہ رکتا ہے، نہ ٹھہرتا ہے۔"

"بات تو اچھی کہی میاں! مگر اب اس مضمون کو اپنے اشعار میں نہ باندھ لینا، غزل سے زیادہ تمہاری نثر پڑھنے لائق ہے، شوق دلچسپی، روانی سب کچھ ہے اس میں۔"

انہوں نے چند لمحوں کا توقف کیا، ویٹر میز پر چائے رکھ رہا تھا، جس کا آرڈر وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ چائے کے ساتھ کیک، پیسٹری بھی تھے۔ کاوش نے کرایہ بچنے کے شکر کے بعد ایک شکر اور ادا کیا۔ ناشتا تو کیا نہیں تھا، بھوک کے مارے اس وقت پیٹ میں چوہے بری طرح اودھم مچا رہے تھے۔ کیک، پیسٹری اور چائے سے کچھ تو بھلا ہو ہی جاتا۔

"ہاں..... تو کیا کہہ رہا تھا میں؟" ویٹر کے جانے کے بعد بہزاد بھائی نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

"جی..... وہ غزل اور نثر کے متعلق کچھ فرما رہے تھے۔" آپ کاوش نے حتیٰ الامکان اپنی بے صبری اور بھوک کو ظاہر نہ کرتے ہوئے اسی سنجیدگی اور بردباری سے پیسٹری کھانی شروع کی جس سنجیدگی اور انہماک سے وہ بہزاد دہلوی کی گفتگو سن رہا تھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا میاں صاحب زادے! کہ شاعری اور نثر دو بھاری پتھر ہیں۔ دنیائے ادب میں کوئی کوئی ہرکولیس ایسا ہوگا جو انہیں بیک وقت اٹھالے اور اٹھائے رکھے۔ تم تو ویسے ہی دھان پان سے ہو، دو کشتیوں میں بیک وقت سواری کرو گے تو دونوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو گے، دریا کی لہروں میں غوطے کھاتے نظر آؤ گے۔"

بہزاد دہلوی عمر میں بہت زیادہ بڑے تو نہیں تھے اس سے، مگر اسے مخاطب اور اس سے خطاب یوں کرتے تھے جیسے اس کے بہت بزرگ سرپرست ہوں، وہ خود بھی بہت اچھے لکھاری تھے اور اس وقت پاکستان کے ان گنے چنے لکھاریوں میں شامل تھے جو نہ صرف دنیائے ادب میں اپنی ایک مضبوط

شناخت اور پس منظر رکھتے تھے، بلکہ مالی لحاظ سے بھی مضبوط تھے۔ عنقریب اپنا رسالہ نکالنے والے تھے۔ پروفیشنل تھے، مگر پرخلوص اور جوہر شناس، کاوش مسعود میں انہیں ایک ہیرا نظر آرہا تھا جسے وہ بڑے خلوص سے پہلے دریافت، پھر تراش خراش کررہے تھے۔

''بات یہ ہے بہزاد بھائی!'' کاوش نے انہیں مخاطب کیا۔ دو پیسٹریاں اور ایک کیک کھا کر نہ صرف اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی بلکہ لہجے اور آواز میں توانائی بھی آگئی تھی۔

''میرا اصل میدان تو نثر ہی ہے، میرا شوق بھی، میرا جنون بھی، میں پیدا اور جوان چاہے کسی بھی حیثیت میں ہوا، مگر مرنا ایک ادیب ہی کی حیثیت سے چاہتا ہوں، باقی رہی شاعری تو یہ تو بس یوں ہی ذائقہ بدلنے کا ایک بہانہ ہے۔'' کاوش نے انہیں کافی سے زیادہ مطمئن کردیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کہے بنا نہ رہ سکے۔

''میاں! جو کہہ رہے ہو، اس پر ہی قائم رہنا، ذائقہ بدلنے کے چکر میں اس ذائقے کو منہ نہ لگالینا۔'' وہ گھونٹ گھونٹ اپنی چائے پی رہے تھے اور جرعہ جرعہ نصیحت کررہے تھے۔

''ہماری امانت لے آئے؟'' انہوں نے کاوش کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی' یہ تین افسانے ہیں۔'' کاوش نے سُتلی سے بندھا ہوا کاغذوں کا پلندہ ان کے حوالے کیا۔

''یہ لو میاں ایڈوانس، بقایا منی آرڈر کردوں گا۔'' انہوں نے بیس روپے کاوش کی طرف بڑھائے۔

وہ لاہور جارہے تھے، اپنے بھائی کے پاس، دونوں نے مل کر وہیں سے رسالہ نکالنا تھا۔

بہزاد دہلوی ہجرت کرکے لاہور آئے تھے، والدین، بہن، بھائی پورا کنبہ وہیں بس گیا تھا۔ خود بھی وہیں تھے۔ پھر نئے امکانات اور نئی کامیابیوں کی تلاش میں کراچی آگئے۔ اس غریب پرور شہر میں جو ماں کی طرح بانہیں وا کیے ہر آنے والے کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔

یہاں آنے کے بعد گزرے پانچ سالوں میں انہوں نے یکے بعد دیگرے تین رسالے نکالے، مگر ایک ایک کرکے تینوں ٹھپ ہوگئے۔ کاوش سے ان کی ملاقات تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس نے نئے نئے افسانے لکھنے شروع کیے تھے اور بہزاد دہلوی نے اپنے رسالوں میں انہیں نہ صرف شائع کیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

ان کی ادب نوازی اور انسان دوستی اپنی جگہ، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد بھی، پانچ سال رہنے کے بعد بھی ان کا دل وہیں اٹکا تھا جہاں سے آئے تھے، انہیں اس شہر میں بہت سی کمیاں اور خامیاں نظر آتی تھیں جن کا وہ برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ جس شہر سے آئے تھے، وہ ایک قدیم شہر تھا، سینکڑوں سال پرانا شہر جہاں قدیم تاریخ اور قدامت پرستی چپے چپے پہ بکھری ہوئی تھی، جہاں کی صدیوں پرانی تعمیرات اپنے حسن ودل کشی اور ہیبت وجمال سے لوگوں کی نظریں خود پر سے نہیں ہٹنے دیتی تھیں۔ بہزاد دہلوی لاہور کو یاد کرکرکے اداس ہوجاتے اور اپنے خیالات کا برملا اظہار کاوش کے سامنے کرتے۔

''عجیب شہر ہے میاں! سوائے صدر اور آس پاس کے علاقوں کے کہیں کوئی پرانی، یادگار تاریخی تعمیرات، نہ کوئی قدیم عبادت گاہ، نہ باغ، باغیچہ، لے دے کے صدیوں پرانا ایک سمندر ہے، وہ بھی کس کام کا؟ نرا پانی، راوی جیسا کوئی دریا بھی ہوتا تو پانی تو میٹھا ہوتا۔

(اس آب راوی کی مٹھاس اور تازگی کو اپنوں کی ہی نظر اور غفلت کھا گئی کہ آج اس میں آرسینک کی زیادتی نے پورے دریا کو زہریلا کردیا ہے، آبی حیات اور انسانی حیات دونوں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔)

ان کا یہ تبصرہ کاوش کو ذرا رنجیدہ کردیتا۔

''بہزاد بھائی۔'' وہ اپنے شہر کی حمایت میں کمربستہ ہوکر آگے آیا۔ ''یہ شہر خود ہی قدیم نہیں تو یہاں کوئی قدیم تعمیرات اور یادگار کیسے ملے گی آپ

کو؟ تین سو سال قبل مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ انگریز اس شہر میں 1839ء میں آئے تھے اور جب قائداعظم دو برس کے تھے، تب اس شہر کو ریل کے ذریعے ملک کے باقی حصوں سے جوڑا گیا۔ ان ہی ادوار میں فریئر ہال اور ایمپریس مارکیٹ بنائی گئیں۔ میری ویدر ٹاور بنا، اس سے پہلے 1845ء میں سینٹ پیٹرک چرچ تعمیر ہوا۔ اور......اور......"

کاوش رک کر سوچنے لگا اور بھی کچھ پرانی عمارتیں تھیں، مگر ان کے بارے میں معلومات ادھوری تھیں۔ ویسے بھی اگر وہ کراچی کی تھوڑی بہت قدیم یادگاریں انہیں بتا یا دکھا بھی دیتا، تب بھی وہ ماننے والے نہیں تھے۔

1947ء میں دلی چھوڑ کر آئے تھے۔ لاہور میں بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، شالامار باغ اور مقبرہ جہانگیر دیکھ کر ان کی کچھ ڈھارس بندھی جو پیچھے چھوڑ آئے تھے، اسے فراموش کر دیا۔

دل ونظر کی اور ذوق وشوق کی تسکین کے کچھ نظارے یہاں موجود تھے۔ انہوں نے آنسو پونچھ لیے۔ لاہور سے مزید آگے کراچی آئے تو مایوس ہوگئے۔ نظاروں سے بھی اور لوگوں سے بھی، نظارے ان کے شوق کے مطابق نہ تھے اور لوگ بالکل ہی بدذوق، کسی نے ان کے ادبی رسائل کی پذیرائی نہ کی۔ اب اس سے آگے کہاں جاتے کہ اب آگے تو بس بحیرہ عرب کا نمکین پانی میلوں پر پھیلا ہوا تھا، تو پانچ سال تک اس شہر میں رہنے کے بعد وہ واپس جا رہے تھے اور واپس تو انہیں جانا ہی تھا۔ جس زمین پہ، جس مٹی پہ قدم — جم کے رہنے کے بجائے اکھڑے اکھڑے ہوں، اوپری ہوں، وہ زمین ان قدموں کو اپنے اوپر گوارا نہیں کرتی۔ مٹی کہیں کی بھی ہو، اپنے چاہنے والوں کی ہوتی ہے، اپنی قدر کرنے والے کو وہ پلکوں پہ بٹھاتی ہے۔ زمین یا شہر ناقدرے اور بے دید لوگوں کو گوارا نہیں کرتے، واپس جانے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ بہزاد دہلوی نے جس شہر کو پسند نہیں کیا، اس شہر نے بھی ان کے قدم اپنی مٹی پر سے اکھاڑ دیے۔

☆☆☆

"کھوں...... کھوں...... کھوں۔" وہ مسلسل کھانس بھی رہا تھا اور لکھ بھی رہا تھا۔ نہ کھانسنے میں کوئی وقفہ آ رہا تھا، نہ قلم کی روانی میں تعطل۔

"او میرے یار! کتنے ہفتے ہوگئے ہیں تجھے اس طرح کھانستے ہوئے، آخر کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتا۔" کاوش دوست بن کر ڈانٹ رہا تھا اور ناصح بن کر نصیحت کر رہا تھا۔

"دوائی کھا رہا ہوں دوست، بالکل پابندی سے، ٹھیک ہو جائے گی یہ کھانسی۔" عثمان نے فقط چند لمحوں کے لیے قلم روکا تھا۔ پھر دوبارہ لکھنا شروع ہوگیا۔ وہ جلد از جلد اپنا ناول مکمل کرنا چاہتا تھا۔ شوق کی بات تھی اور معاملہ ضرورت کا بھی تھا۔

عثمان آدھا دن پرائمری اسکول کے استاد کی حیثیت سے، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ دماغ کھپاتا، پھر رات گئے تک اپنا دل اور جگر لہو کر کے لکھتا رہتا، لکھنے کا مشترک شوق اور اچھا ادبی ذوق ہی تھا جو کاوش اور اس کے درمیان وجۂ دوستی بنا۔

پھر کاوش کے برے دن آئے جب بے روزگاری پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جو افسانے وہ کبھی کبھار لکھتا تھا، ان کا معاوضہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کوٹھری کا کرایہ کہاں سے ادا کرتا جس میں وہ رہ رہا تھا۔ مالک نے دو مہینے بغیر کرائے کے اسے برداشت کیا، پھر اس کا مختصر کاٹھ کباڑ (کام کا سامان ہوتا تو کرایے کی مد میں خود نہ ہتھیا لیتا۔) باہر نکال پھینکا اور اس کے ساتھ کاوش کو بھی، ایسے میں عثمان نیکی کا فرشتہ بن کر غیب سے اس کی مدد کرنے آیا۔

دونوں بہزاد دہلوی کے رسالے میں اپنے افسانے دیتے تھے۔ یہ دوستی وہیں سے پروان چڑھی تھی۔ عثمان نے ایک اچھا انسان اور اس سے بھی اچھا دوست ہونے کا حق ادا کیا، اسے اپنے گھر میں رہنے کی جگہ دی اور جو روکھی سوکھی وہ اپنی بوڑھی ماں

کے ساتھ۔ کھاتا تھا، اس میں کاوش کو بھی شامل کرلیا، اسے ٹھکانا بھی مل گیا اور پیٹ بھر کھانا بھی......

عثمان کی بوڑھی اور سیدھی سادی ماں نے کاوش کو اپنا دوسرا بیٹا بنالیا۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ یہیں تھا۔ ایک مکین کی حیثیت سے اور اس حیثیت میں وہ کچھ ایسی باتیں بھی جان گیا تھا جو دوست کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ مثلاً یہ کہ عثمان کی ایک خالہ ملیر سعود آباد میں رہتی ہیں، ان کی بیٹی عثمان کی غیر رسمی منگیتر ہے۔ یہ نسبت شادی میں بدلنے والی تھی، مگر شاید قسمت آڑے آرہی تھی یا حالات۔

عثمان کے خالو چاہتے تھے کہ وہ کہیں نوکری کرلے۔ نوکری میں ہر مہینے تنخواہ ملتی ہے۔ لکھنا لکھانا بے کار شغل ہے، ہوائی روزی ملی ملی، نہ ملی۔ اس لیے عثمان بڑی دوڑ دھوپ کر کے ایک پرائمری اسکول کا استاد بننے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے اپنے ''بے کار شغل'' کے لیے بھی تو وقت چاہیے تھا۔ وہ ایک ناول لکھ رہا تھا۔ بڑی محنت اور محبت کے ساتھ، اسے خود پہ یقین تھا اور اپنی صلاحیت پہ بھروسا، وہ ہر روز یہ خوش کن خواب دیکھتا تھا کہ اس ناول کی تکمیل اور اشاعت کے بعد دنیائے ادب اور ساکنان ادب اسے اپنی بانہیں پھیلائے خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

اسی خواب کو آنکھوں میں سجائے وہ روزانہ قلم اپنے ہاتھ میں لیتا اور اپنے خواب کاغذ پہ سجانا شروع کردیتا۔ ناول چھپ جاتا تو کچھ رقم کا بھی آسرا ہوجاتا۔ آخر شادی تو اخراجات کا دوسرا نام ہے۔ وہ اسی طرح کاغذ پہ جھکا، لیمپ کی زرد روشنی میں لکھ رہا تھا، آنکھوں سے پانی آرہا تھا، شاید شدید کھانسی کی وجہ سے یا دیر تک جاگنے کی وجہ سے، مگر وہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔

کاوش اس کی طرف سے مایوس ہو کر سونے لیٹ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو چھم سے ایک چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ برق سی کوند گئی۔ کاوش نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، یہ فقط آج کی بات نہیں تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسی کیفیت کا شکار تھا، جب سے وہ وہاں سے ہو کر آیا تھا۔ جب سے اسے دیکھا تھا، اس کی نیند روٹھ گئی تھی۔ رت جگے اور بے قراری نے اس سے صاحب سلامت کرلی تھی۔ وہ جاگتا تو اسی کا خیال اپنے گھیرے میں لیے رہتا۔ سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو وہ موہنی صورت یہاں بھی اسے بے چین کرنے کو موجود ہوتی۔

''اف......'' سونے کی کوشش میں ناکام اور اس تصور کو اور تصویر کو ہٹانے کی کوشش میں پریشان، کاوش نے اپنے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس تصور اور اس پری چہرہ سے اپنے خیال کی رنگینی سے چھٹکارا نہیں چاہتا تھا۔ اسے محبت ہوگئی تھی۔ پہلی نظر کی محبت۔ اسے دیکھتے ہی کاوش اس پر مرمٹا تھا۔ حالانکہ وہ اس لیے تو وہاں نہیں گیا تھا۔ مگر پھر بھی یہ انہونی ہوگئی۔ کاوش پاگل سا ہورہا تھا، اسے دیکھنے کو بے چین، اس سے اظہار محبت کرنے کے لیے بے تاب، اسے پانے کے لیے بے قرار ہورہا تھا۔ مگر درمیان میں بہت کچھ حائل تھا۔ معاشرہ، تہذیب، روایتیں اور قدریں۔

''میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہورہا ہے، ایک طرف وہ دوست ہے جس کے احسانوں کے بوجھ تلے میری ذات دبی ہوئی ہے۔ دوسری طرف میرا دل، میرے جذبات، میرے احساسات، کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟''

کاوش کو نیند نہیں آرہی تھی۔ فقط خیالات اور جذبات کا ریلا تھا جو اسے بہائے لیے جارہا تھا۔ جنون کی ایک آگ تھی جو دونوں کے دل میں دہک رہی تھی۔ عثمان اپنے جنون کو سامان بنائے صفحات سیاہ کررہا تھا۔ کاوش اپنے جنون کو حرزِ جاں بنائے اپنی ہی آگ میں جل رہا تھا۔

☆☆☆

محترم بہزاد بھائی!

سلام مسنون

بعد آداب عرض یہ ہے کہ آپ کا عنایت نامہ کل ہی موصول ہوا اور ساتھ بقایا رقم کا منی آرڈر بھی، شکر گزاری کے جذبات کو، الفاظ میں رقم کرنے سے قاصر ہوں، سردست اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ جیسے مربّی کا ہاتھ سر پر ہو تو کارکنان قضا و قدر سے بھی کوئی گلہ نہ ہو، آپ کی ہدایت کے مطابق دو افسانے اور ایک غزل بھیج رہا ہوں، ویسے تو آپ کی نصیحت کے بموجب شاعری کا بھاری پتھر چوم کر نیچے رکھ دیا ہے، لیکن واردات قلب کچھ ایسی گزری کہ بے اختیاری نے اسے اشعار کی صورت میں ڈھال دیا۔ علاوہ ازیں ایک خوش خبری یہ ہے کہ اپنے پہلے ناول پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

مرزا غالب کو تو یک گونہ بے خودی دن رات چاہیے تھی۔ میں بے خود تو پہلے ہی ہو چکا ہوں۔ اب ایسی مصروفیت چاہیے جو نہ سر اٹھانے دیا اور کھانے کی مہلت دے اور نہ ہی دل میں جذبوں کو سر اٹھانے دے، وگرنہ یہ ظالم دل اور بے رحم تقدیر ایسی جگہ لے جا کر مار گے جہاں پانی بھی نہ ملے۔ اتنے لکھنے کو بہت جانیے، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

—— آپ کا معتقد کاوش مسعود۔

خط لکھ کر اس نے لفافے میں ڈالا۔ زبان سے لفافے کا کنارہ تر کیا اور اسے اچھی طرح چپکا دیا۔ طبیعت مضمحل ہو رہی تھی، پھر بھی ہمت کر کے باہر نکل ہی پڑا۔ خط تو پوسٹ کرنا ہی تھا۔ واپس آیا تو بلڈنگ کی تنگ و تاریک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا دل ہمک ہمک کر ایک ہی آرزو کر رہا تھا۔

"یہ بے اختیاری کہیں کا نہ چھوڑے گی مجھے۔" وہ کراہا۔

اس مختصر سی کھولی میں جسے ازراہ نوازش کمرے کا نام دیا گیا تھا۔ اماں بیٹھی تھیں، شاید اسی کی منتظر تھیں۔ تب ہی اسے دیکھتے ہی بڑی بے تابی سے پکاریں۔

"بٹوا، جرا ہمری بات تو سنو۔"

"جی اماں!" عثمان کی دیکھا دیکھی وہ بھی انہیں اماں ہی کہنے لگا تھا۔

"ہمرے ساتھ چلے چلوگے، ہمری بہن کے؟" وہ بڑی لجاجت سے پوچھ رہی تھیں۔

ایک لمحے کو کاوش کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"کون سی بہن کے؟" اس کے اس بے وقوفی کے سوال پہ اماں ہنس پڑیں۔

"اللہ رکھے ایک ہی بہن ہے ہمری، وہ جو ملیر میں رہت ہے۔"

"جی...... جی چلیے۔" کاوش کو بے پناہ خوشی کے موسم نے چھوا تو وہ اتاؤلا سا ہو گیا۔ سوچ کچھ رہا تھا اور کہہ کچھ رہا تھا۔

"لونڈے! ذرا چھری تلے دم تو لے، چدر (چادر) نکال لوں۔ اوڑھنے کے لیے۔" وہ جس آہستہ خرامی سے بکسے کی طرف جا رہی تھیں۔ کاوش کا خیال اتنا ہی تیز سفر کر رہا تھا۔

"دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔" خزاں رسیدہ دل میں تمناؤں کے پھول کھل اٹھے۔ جب تک اماں نے چادر اوڑھنے سے پہلے پاندان سرکا کر ایک پان لگایا اور گلوری کلے میں دبا کر چادر اوڑھی، چپل پہنی، کاوش نے فٹافٹ منہ دھو کر کھونٹی پہ ٹنگی اپنی پتلون اور بشرٹ پہنی اور بال سنوار کر ان کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

"چلیں اماں!" بظاہر وہ بڑی متانت سے سوال کر رہا تھا۔ مگر اندر ہی اندر ڈر رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ عثمان آ جائے اور سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے۔ سوچتے ہی دل سہم گیا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"ارے لونڈے! ٹھہر تو سہی، کرایہ تو رکھ لے۔" وہ اپنا چھوٹا سا بٹوہ کھولنے لگیں۔

"کیوں شرمندہ کر رہی ہیں اماں! کرایہ لے لوں گا۔ کچھ پیسے ہیں میرے پاس۔" اماں کا جواب سنے بغیر وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

کینٹ اسٹیشن سے لوکل میں بیٹھنے کے بعد ٹرین جیسے پٹری پر نہیں اس کے دل پر سے گزر رہی تھی۔ بڑی بے تابی سے وہ ایک ایک اسٹیشن گن رہا

تھا۔ کینٹ سے اگلا اسٹیشن چنیسر ہالٹ، ڈرگ روڈ کالونی، ایئرپورٹ، ملیر ہالٹ، ماڈل کالونی اور یہ آ گیا ماتا پان کا اسٹیشن، ان کی منزل یہاں اتر کر ذرا پیدل چلے اور منزل مقصود پہ پہنچ گئے۔

لکڑی کا پھاٹک کھلتے ہی کچا پکا سا احاطہ تھا۔ بیری، شہتوت، امرود، لیموں اور پپیتے کے درخت بڑی شان سے کھڑے تھے۔ ہار سنگھار کا پیڑ بھی اپنے سنہرے پھولوں کے ساتھ موجود تھا۔ چنبیلی کی منہ بند کلیاں ابھی اپنی خوشبوئیں سمیٹے شاخوں کی گود میں آنکھیں موند کر بیٹھی تھیں۔ ابھی پھول کھلنے کا موسم نہیں آیا تھا۔ ابھی تو فقط خواب دیکھنے کا موسم تھا۔ آنکھیں موندے سپنوں میں گم ہونے کا موسم، وہ اپنے خیالات میں گم بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ جب گلنار اندر آئی، چلبلی سی، چھوٹی سی لڑکی۔

''کاوش بھائی! پانی پی لیں۔'' اس نے پانی کا گلاس میز پہ رکھا۔

''یہ تو بڑی نیکی کا کام کیا تم نے۔ ویسے بھی ہم بہت پیاسے ہیں۔'' کاوش کا وہم تھا یا حقیقت تھی کہ دروازے پہ بڑی چق کی درزوں میں ذرا ذرا دیر بعد نیلے آنچل کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ تب ہی بلند آواز میں معنی خیز الفاظ بول کر اس نے گلاس منہ سے لگا لیا۔

بھئی..... تمہارے ہاں کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے، مگر پیاس بجھانے کے لیے کچھ اور بھی چاہیے۔'' نیلے آنچل کی موجودگی یقینی اور واضح ہو گئی تھی۔

''شربت بن رہا ہے، ذرا دیر انتظار کیجیے۔'' ہنسی کے ساتھ اطلاع دیتی ہوئی گلنار باہر بھاگ گئی۔

میز پر گلاس رکھتے ہوئے کاوش کی نظر اب پڑی تھی، وہاں چند پرانے رسالے رکھے تھے۔ بہزاد لکھنوی کی زیر ادارت نکلنے والے وہ رسالے جن میں عثمان کے ساتھ ساتھ کاوش کی تخلیقات بھی شائع ہوئی تھیں۔ افسانے بھی اور غزلیں بھی، وہ وقت گزاری کے لیے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسے شدت سے گلنار کا انتظار تھا۔

اس کا انتظار تھوڑی دیر میں ختم ہو گیا۔ گلنار اندر آئی تو ہاتھ میں تھامی ہوئی چھوٹی گول سینی میں دو گلاس شربت، کروشیے کے گول کور سے ڈھکے ہوئے لے کر آئی اور میز پہ رکھ دی۔

''یہ لیجیے، آپا نے دو گلاس شربت دیا ہے۔ اپنی پیاس اچھی طرح بجھا لیجیے۔''

اس نے کور ہٹا کر شربت کی رونمائی کرائی۔

کاوش نے ایک نظر دروازے میں جھولتی چق کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا۔ ٹھنڈا میٹھا اور خوشبودار دودھ کا شربت جس میں تخم بالنگا ڈالا ہوا تھا۔ پہلا گھونٹ پیتے ہی ایک ٹھنڈک سی جسم و جان میں اتر گئی۔ کچھ اثر شربت کا تھا اور کچھ گلنار کی بات کا۔

''انار کے پھول! ایک بات تو بتاؤ۔'' اس نے نام کے بجائے نام کے مطلب سے اسے مخاطب کیا۔

''جی.....!'' وہ شاید اپنے نام کا مطلب جانتی تھی۔ تب ہی حیران ہونے یا چونکنے کے بجائے اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

''یہ رسالے شاہد بھائی کے علاوہ اور کون پڑھتا ہے؟''

''ماجد بھائی پڑھتے ہیں۔ ہماری آپا بھی پڑھتی ہیں اور.....'' وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔

''ٹھیک ہے، بس اتنے نام کافی ہیں۔'' کاوش پہلا گلاس ختم کر کے دوسرا گلاس اٹھا رہا تھا۔ جو نام وہ سننا چاہ رہا تھا سن چکا تھا۔

''یہ رکھ رہا ہوں، اس میں میری تازہ غزل چھپی ہے۔'' کاوش نے اپنے ساتھ لایا ہوا رسالہ میز پہ رکھا۔ تازہ شمارہ تھا۔ دو روز پہلے ہی ڈاک کے ذریعے لاہور سے آیا تھا۔

بیٹھک کی کھڑکی صحن میں کھلتی تھی۔ جو صحن کیا تھا بس ایک چھوٹا سا مہکتا ہوا چمن تھا۔ نیلا آنچل اب یہاں لہرا رہا تھا۔ چنبیلی کے جھاڑ کے پاس کھڑی وہ خود بھی لچک دار شاخ گل کی طرح کتنے ہی پھولوں کا حسن خود میں سمیٹے ہوئے تھی۔ موی انگلیوں نے اپنی ہی ہم رنگ چنبیلی کی کلی کو گرفت میں لیا ہوا تھا۔ کلی شاخ سے

جدا ہونے کو تھی کہ کاوش بے اختیار بول اٹھا۔

"ارے...... یہ کیا غضب کر رہی ہیں آپ، ناحق گہری نیند سے جگا رہی ہیں کلی کو، خواب پورا ہونے دیں، پھول کھلنے تو دیجیے۔"

پھولوں بھری شاخ چونک کر لچکی، پھر سمٹی، اپنی حیران آنکھوں سے اس نے کاوش کو دیکھا اور کاوش کو پھر کچھ نظر نہ آیا۔ اپنی وارفتگی پہ وہ خود حیران تھا۔ حالانکہ اتنا حیران ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ وہ حسن پرست تھا۔ عشق پیشہ تھا۔ بے عیب، اکملیت کو چھوتا حسن اس کے سامنے آیا تو بے خود تو ہونا ہی تھا۔ پچھلی بار وہ عثمان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

عثمان سادہ دل تھا، یاروں کا یار، سچا اور مخلص دل پہلو میں لیے، ایسا دل جو ہر ایک کو اپنے جیسا ہی بے ریا، سادہ اور بے غرض سمجھتا تھا۔ عثمان نے اس گھر میں اسے متعارف کروایا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو متعارف کروایا۔ کاوش کی غزلیں اور افسانے اس گھر میں شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

کاوش نے اسے اسی چمن میں پہلے بھی دیکھا تھا۔ پھولوں کی شوقین معلوم ہوتی تھی۔ پھولوں میں گھری ہوئی خود بھی ان ہی کا ایک حصہ لگتی تھی۔ عثمان اگر دل و جان سے اس پر قربان تھا تو غلط نہیں تھا۔ وہ عثمان کی فقط قسمت ہی نہیں محبت بھی تھی، بلکہ اس کا عشق تھی، اس عشق کو ہتھیار بنائے وہ اپنے حالات سے جنگ کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا، عثمان کے مسلسل کھانسنے سے کاوش کی آنکھ کھلی، وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ کاوش اپنے پلنگ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا تو وہ کھانس کھانس کر دہرا ہوا جا رہا تھا۔ برآمدے میں لٹکی لالٹین رات میں خدا جانے کب کی بجھ چکی تھی۔ دوسری منزل کے اس فلیٹ کی کھلی کھڑکی سے سنہرا روشن چاند جھانک رہا تھا۔ اس کی اجلی چاندنی میں وہ عثمان کو سہارا دے کر بمشکل اس کے پلنگ پر لٹا پایا۔ اماں برابر کمرے میں تھیں، ویسے بھی وہ عارضۂ سماعت میں مبتلا تھیں۔ اونچا سنتی تھیں۔

کاوش نے لکھنے کی میز پہ رکھا لیمپ روشن کیا، کھڑکی سے آتی چاند کی روشنی اور میز پہ رکھے لیمپ کی روشنی نے کمرے میں اتنا اجالا کر دیا تھا کہ سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ عثمان کا کمزور وجود پلنگ پر بکھرا ہوا سا تھا۔ کمرے کی زرد روشنی میں اس کا کمزور چہرہ اور بھی یرقان زدہ لگ رہا تھا۔ مسلسل کھانسنے سے گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ وہ چت لیٹا گہری سانسیں لے رہا تھا۔

سانسوں کے زیر و بم سے سینہ بری طرح ہچکولے سے کھا رہا تھا۔ سانس ذرا قابو میں آئی تو عثمان نے اشارے سے پانی مانگا۔ اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑا کر، کاوش نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا، اسے رحم آنے لگا، اپنی قسمت پہ، اپنے آپ پر جو صحرائے محبت میں بھٹک کر سب کچھ گنوا دینے کو تھا اور اس بہار کے مقدر پہ بھی افسوس ہو رہا تھا جو عثمان جیسے خزاں رسیدہ باغ کے نصیب میں آ رہی تھی۔

"کیا یہ گل اندام کے قابل ہے؟ اس پری پیکر، پری جمال کے لیے کاتب تقدیر نے کچھ بہتر کیوں نہ لکھا۔" اسے غصہ آنے لگا۔

"کاوش!" پلنگ پہ لیٹے عثمان نے اسے مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے کسی اور اچھے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے، کھانسی تو کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

"ہاں...... دکھانا چاہیے۔" کاوش نیم دلی سے گویا ہوا۔

"کبھی کبھی تو اتنی بری طرح کھانسی ہوتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے۔ اگلی سانس نہیں آئے گی۔"

"پھر بھی علاج پہ توجہ دینے کے بجائے سارا زور اور دھیان ناول کی طرف لگایا ہوا ہے۔ بندۂ خدا! جان ہے تو جہان ہے۔ صحت بہتر کر لو پہلے، پھر لکھتے رہنا۔" کاوش کو نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اس کے پیچھے دوستی اور خیر خواہی کا

جذبہ نہ تھا، بلکہ ایک غیر محسوس سی جلن، حسد، ایک عجیب سا چڑچڑاپن تھا، جو شاید خود کاوش ہی محسوس کرسکتا تھا۔ عثمان اس کے دل اور دلی حالت سے بے خبر اپنی ہی بات کررہا تھا۔

''مانتا ہوں اور جانتا بھی ہوں کہ صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں، مگر ہاں دنیا میں اور بھی کچھ ہے جو میرے لیے، میری صحت تو کیا جان سے بھی بڑھ کر ہے۔ اماں شادی کے لیے زور دے رہی ہیں۔ میں خود کو اپنی زندگی کو گل اندام کے شایان شان بنانا چاہتا ہوں۔ شادی کے متعلق ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی کچھ خواہشیں ہوں گی، کچھ ارمان ہوں گے، کچھ خوشیاں پوری کرنے کے لیے روپیہ، پیسہ ضروری ہے۔ اسی لیے اتنی محنت کررہا ہوں۔ ایک بار ناول مکمل ہوجائے، کچھ نہ کچھ سہارا تو ہو ہی جائے گی۔ بہزاد بھائی نے بڑی امید دلائی ہے۔''

عثمان بول رہا تھا اور کاوش کے دل پہ آرے سے چل رہے تھے۔ عثمان کا ایک لفظ برچھی بن کر دل میں اترتا جارہا تھا۔ اذیت تھی یا حسد؟ شاید حسد ہی ہوگا، وہی ہے جو انسان کے لیے اذیت کا موجب بن جاتا ہے۔ وہ کچھ کہے بغیر جی ہی جی میں کلستا رہا، خود سے الجھتا رہا۔

''سوگئے ہو کیا؟'' اس کی مستقل خاموشی پہ عثمان نے پکارا۔

وہ سو تو نہیں رہا تھا، مگر سوتا بن گیا۔ اس وقت اس کے اندر اتنی تلخی بھری ہوئی تھی کہ یہ کڑواہٹ لہجے اور لفظوں سے چھلک ہی پڑتی، اس نے چپ سادھ لی، خاموش رہنا ہی ٹھیک تھا، کبھی خاموش رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے انسان کچھ کہے بغیر چپ چاپ گڑھا کھودتا رہتا ہے اور ایک دن اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

زبان کھلتی ہے تو دانستہ، نادانستہ انسان کا اندرون کچھ نہ کچھ آشکار ہو ہی جاتا ہے، دل کی جلن، حسد، بغض، کینہ اور عناد کبھی لفظوں سے ظاہر ہوجاتا ہے، کبھی لہجے سے عیاں ہوجاتا ہے، کاوش کے دل میں بدی کا ناگ پھنی اُگ رہا تھا۔ متواتر بڑھ رہا تھا۔ کانٹوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔

☆☆☆

کاوش کا قلمی سفر جاری و ساری تھا، ایک دن جانے کیا خیال آیا کہ اپنا ٹرنک کھول کر بیٹھ گیا، اس ٹرنک میں اس کے کپڑوں یا اشیائے ضروریات کے بجائے کاغذ ہی کاغذ بھرے ہوئے تھے، کچھ اس کے نامکمل افسانے، ادھوری غزلیں اور ایک ناول کا مسودہ بھی تھا، جسے بہت چاؤ اور لگن کے ساتھ اس نے کبھی شروع کیا تھا۔ ایک تہائی لکھا تھا کہ جی اچاٹ ہوگیا، نہ جانے کیوں؟ کاوش نے اسے اٹھا کر رکھ دیا تھا، مگر اب وہ اسے جلد از جلد مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مسودہ جھاڑ پونچھ کے اس نے دوبارہ سے میز پر سجا دیا۔ اب وہ بڑی لگن، تن دہی اور محنت سے اسے مکمل کرنے میں جت گیا تھا۔

بہزاد دہلوی کے کراچی سے چلے جانے کے بعد کچھ اور ادیبوں اور شعرا سے آہستہ آہستہ شناسائی اور علیک سلیک ہوگئی تھی۔ سب مل کر ایک غیر رسمی ہفتہ وار بیٹھک میں اپنی تازہ تخلیقات پیش کرتے اور بظاہر بڑے صبر اور فراخ دلی سے اس پر تبصرہ کم اور تنقید زیادہ سنتے اور پھر اپنی تخلیق کا حشر نشر کرنے کا بدلہ اس صورت میں اتارتے کہ اگلے کی باری پر اس کی تخلیق کے پرزے اڑا دیتے، بلکہ کوئی کوئی دل جلا تو چیتھڑے اڑا کر رکھ دیتا۔

یہ ان ادیبوں اور شعرا کا مجموعی حال تھا جو مزاج میں شدت پسند تھے۔ دوسرے کی تخلیق میں، خوردبین لگا کر ہر عیب نکال دیتے، پھر اپنی باری پر بے بسی سے اپنی تخلیق کے بخیے اُدھڑتے دیکھتے، کاوش معتدل مزاج کا تھا۔ تبصرے کے وقت وہ ہلکا پھلکا تبصرہ کرتا، نہ کسی کی بھد اڑاتا، نہ پرزے، نہ بخیے ادھیڑتا، نہ ہی خوردبین سے معائنہ کرکے عیب اور خامیاں نکالتا، دوسروں کا حشر دیکھ کر اس نے ان ہی محفلوں سے اور صحبتوں سے ایک کام کی بات یہ سیکھی کہ نرمی اور مٹھاس سے کام نکلتا ہے اور بات بنتی

ہے۔ دل میں چھپے غصے اور بغض کے زہر پہ مصنوعی خوش خلقی کی شیرینی چڑھا کر رہنا اور موقع ملتے ہی ڈس لینا، اپنے کیریر اور عملی زندگی کے آغاز میں ہی اس نے یہ گُر کی بات سیکھ لی تھی، آگے چل کر اپنی طویل زندگی اور اتنے ہی طویل کیریر میں ترقی اور کامیابی کے بہت سے دراس نے اسی سے اپنے لیے کھولے۔

☆☆☆

وقت کا پرندہ پرواز کر رہا تھا، اپنے اپنے دائروں میں قید دن کو رات اور رات کو دن کرنے کی سعی میں مصروف انسان پرواز کرتے پرندے کو دیکھتا تو وہ پرندہ اپنے آس پاس یا سروں کے اوپر ہی منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

عثمان کے قلم کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوری اور نقاہت بھی، حالانکہ ڈاکٹر بھی بدل گیا تھا اور دوائی بھی، مگر اس کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"چل یار! اٹھ......" کاوش اس کے سر پہ آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں؟" عثمان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جہاں جانے سے طبیعت میں افاقہ اور چہرے پہ رونق آ جائے گی۔"

عثمان کے چہرے پہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"نہیں یار! حالت ٹھیک نہیں ہے، طبیعت ذرا سنبھل جائے، پھر جاؤں گا خالہ کے گھر۔"

"یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ہوگا، وہاں جاؤ گے تو حالت بھی سنبھل جائے گی اور طبیعت بھی بحال ہوگی۔"

ان کے دیکھے سے جو آ جائے گی منہ پہ رونق
وہ سمجھ جائیں گے — بیمار کا حال اچھا ہے

کاوش نے غالب کے شعر کو ترمیم کے ساتھ پڑھا۔ عثمان نے بے بس نظروں سے کاوش کو دیکھا۔ جیسے سوال کر رہا ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔

"اٹھ جا دوست! تیری بھلائی کے لیے ہی اتنی خوشامدیں کر رہا ہوں۔ اس تاریک گپھا سے کچھ دن اور باہر نہ نکلا تو اندھا ہو جائے گا۔ پھر جب سورج کی روشنی میں باہر نکلے گا تو اندھیروں کی عادی آنکھیں اس روشنی کو سہار نہ پائیں گی۔"

کاوش کے اصرار پہ وہ چل تو پڑا، مگر خلاف عادت چپ چپ تھا۔ کینٹ اسٹیشن پہ لوکل کے چلنے کے انتظار میں تھے۔ کاوش نے بالآخر بڑی متانت پوچھ ہی لیا۔

"قلم کے ساتھ ساتھ کیا زبان بھی گھر پہ رکھ کے آ گئے؟"

"پتا نہیں کیوں، دل بہت پریشان ہے، بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔"

"دربار حسن میں حاضری کی پریشانی ہے بس اور کچھ نہیں اور جہاں تک گھبراہٹ کی بات ہے، ابھی ہوا کھاؤ گے اور تازہ دم ہو جاؤ گے۔ یہ لو سفر بھی شروع ہو گیا اور اب ہوا بھی آ ہی جائے گی۔" لوکل نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا تھا۔

خالہ کے گھر اب وہ اجنبی نہیں رہا تھا۔ عثمان کی اماں نے اپنے دوسرے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اسے، اگلے وقتوں کے لوگوں کی سادگی اور محبت ابھی باقی تھی، کاوش کو بیٹا بنایا تو صرف زبانی نہیں بنایا، بلکہ اسے وہی محبت، مان دیا جو سگی اولاد کو دیا جاتا ہے، اس پر وہی اعتماد ایسا ہی بھروسا تھا جو سگے بیٹے پر کیا جاتا ہے۔ عثمان کی خالہ کے گھر اس کی عزت اور آؤ بھگت عثمان سے کم نہیں تھی۔ پھر اس کی تخلیقات نے بھی اسے معتبر بنا دیا تھا۔ گھر میں شاہد بھائی، ماجد بھائی اور گل اندام اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ابتدا میں جو کانا سا پردہ روا رکھا گیا تھا، اب وہ بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ عثمان کے ساتھ ساتھ اسے بھی فیملی ممبر کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

آج جمعہ تھا، چھٹی کا دن، اس لیے خالد، شاہد اور ماجد گھر پر ہی تھے۔ وہ دونوں پہنچے تو گھر بھر نماز جمعہ کے بعد کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا سوائے گلنار

اور گل اندام کے، یہ دونوں بہنیں کچے پکے صحن میں لیموں اور امرود کے درختوں کے نیچے چارپائی بچھا کر بیٹھی تھیں۔

دروازہ گلنار نے کھولا تھا۔ دونوں اندر آئے تو پسینے پسینے تھے۔

گل اندام فوراً چارپائی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

عثمان اندر جانے کے بجائے اسی چارپائی پہ ڈھیر سا ہو گیا۔ اس کی سانس بری طرح چل رہی تھی۔ سانولا رنگ، بیماری، کمزوری اور گرمی کی بدولت سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ دبلا پتلا تو پہلے بھی تھا، اب تو اور بھی نحیف و نزار لگ رہا تھا۔ پسینہ کاوش کو بھی آ رہا تھا، مگر سورج کی تپش نے اس کے گورے رنگ کو بدنما بنانے کے بجائے سرخی بخش دی تھی۔ وہ بھی عثمان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ بالکل برابر میں۔ دیکھنے والے دونوں کو ایک ساتھ دیکھ سکتے تھے اور موازنہ کرنے والے موازنہ بھی کر سکتے تھے۔

گلنار اور گل اندام، عثمان کو تشویش سے دیکھتے ہوئے اس کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ گل اندام کی غیر ارادی نگاہ عثمان کے ساتھ ساتھ کاوش پر بھی پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

صحن میں ایک طرف چھپر کے نیچے گھڑونچی بنی ہوئی تھی، جس پہ پانی کے دو مٹکے رکھے تھے۔ پانی نکالنے کا ڈونگا اور نقشین کٹورا مٹکے کے اوپر ہی دھرا تھا۔ گلنار مٹکے سے پانی نکال لائی۔ کاوش نے سہارا لگا کر عثمان کو بیٹھنے میں مدد دی۔ اس نے کٹورا تھاما تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دو گھونٹ پانی پی کر اس نے کٹورا واپس دے دیا۔

"بس!"

"ہاں......"

"میں امی کو جگاتی ہوں۔" گل اندام اندر کی طرف چلی، گلنار چارپائی پر سے اشیا اکٹھی کرنے لگی۔ اس کی اسکول کی کتاب اور کاپی تھی اور گل اندام کا کشیدہ کاری کا سامان، کپڑا لگا فریم اور کاپی، کتاب، پنسل وہ اٹھا کر چل دی۔

"اندر آ جائیں۔"

اندر امی جاگ گئی تھیں ویسے بھی سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے شاہد اور ماجد بھی اٹھ کر آ گئے اور ان کے کچھ دیر بعد خالو بھی آ گئے۔

"تمہیں کیا ہو گیا میاں! بہت کمزور اور زرد رو ہو رہے ہو۔" خالو نے عثمان کو بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"جی...... طبیعت ناساز چل رہی ہے آج کل، حکیم صاحب سے علاج کروا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔" عثمان جانے کیوں خفیف سا ہو گیا ان کے سامنے۔

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔ اللہ رکھے، صحت بحال ہو جائے گی۔ پرہیز پورا رکھنا، آدھا علاج تو پرہیز میں ہی ہے۔" خالہ جان اس کی اخلاقی حمایت میں فوراً آگے آ گئیں۔ شاہد بھائی نے سیاست کی بات چھیڑ دی۔

خالو مسلم لیگ کے پکے کارکن تھے۔ قیام پاکستان کو کوئی بہت زیادہ سال تو نہیں گزرے تھے، مگر لیاقت علی خان کے انتقال کے بعد سیاست میں جس طرح جوتیوں میں دال بٹنی شروع ہوئی، وہ ان سب سے بہت دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ مفلوج بڑے میاں (گورنر غلام محمد) سے نجات ملی تو میجر جنرل اسکندر مرزا آ گئے۔ سوچا کہ حالات اب کچھ بہتر ہو جائیں گے۔ مگر نماز بخشوانے گئے، روزے گلے پڑ گئے۔ فوج کے افسر نے وردی پر شیروانی پہن لی۔ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔

بے چارے اسکندر مرزا صدارتی محل سے نکلے تو سیدھے لندن کے ایک ہوٹل میں جا کر دم لیا، جہاں وہ منیجر کی نوکری کر کے اپنی روزی کمانے لگے۔ اسکندر مرزا کی جان کو روتے ہوئے ان سادہ لوح مخلص اور محب وطن پاکستانیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب سے تقریباً پچاس سال بعد اگلی

www.urdusoftbooks.com

صدی کے پہلے عشرے میں جب پاکستان کا چوتھا فوجی سربراہ (مشرف) کسی ضدی بچے کی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے حکمرانی کے دل پسند کھلونے سے دست بردار ہوگا تو اپنی گزر اوقات لیے اسے کسی نوکری کی ضرورت نہ ہوگی کہ دور حکمرانی میں بھرے گئے لاتعداد بینک اکاؤنٹس اور دنیا بھر کے مہنگے علاقوں میں قیمتی جائیدادیں، اس کی آنے والی سات نسلوں کے لیے بھی کافی ہوں گی۔

1962ء کا آئین نیا نیا نافذ ہوا تھا۔ اس پر زوروشور سے بحث ہو رہی تھی۔ یکایک شاہد بھائی کو کچھ یاد آیا۔

''ارے وہ...... حبیب جالب کو سنا آپ نے مشاعرے میں، کیا غضب کا مزاحمتی کلام ہے، کیا ترنم ہے، واہ...... واہ...... آئین پہ کیا نظم پڑھی تھی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
سائے میں جو مصلحت کے پلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو جو لے کر چلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

شاہد بھائی کا ترنم، حبیب جالب سے کچھ کم نہیں تھا، سب کو مزا آ گیا۔ خالو جنہیں شعروشاعری سے کچھ خاص شغف نہیں تھا، وہ بھی اشعار سن کر متاثر ہوئے، مگر ساتھ ساتھ شاعر کے مستقبل کی پیشن گوئی بھی کر دی۔

''حکومت کے خلاف ایسے اشعار کہہ کر یہ شخص خود کو مصیبت میں ڈال رہا ہے، سیدھا جیل جائے گا۔''

محفل جمی تھی، فضا میں بحث و مباحثے اور باتوں کی گرمی رچی بسی تھی، اس کے ساتھ ساتھ پکوڑے تلنے کی سوندھی سوندھی مہک بھی شامل ہو رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عثمان پہ پھر کھانسی کا دورہ پڑا، بے تحاشا کھانستے کھانستے وہ دہرا ہوگیا۔ اور پھر یک دم ہی اسے الٹی آ گئی۔ باورچی خانے سے آتی گلنار کے ہاتھوں سے پکوڑوں کی پلیٹ چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اس کی اور خالہ کی ایک ساتھ چیخ بلند ہوئی۔ عثمان نے جو الٹی کی تھی، وہ خون کی تھی۔

☆☆☆

اماں کا بوڑھا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ اپنے سفید ململ کے دوپٹے سے بار بار آنسو پونچھتیں اور بار بار کبھی کاوش سے، کبھی شاہد سے پوچھتیں۔

''کا ہوت ہے عمو کو (عثمان کا پیار نام) اسپتال کا ہے لے گئے۔ ہواں (واں) بھرتی کاہے کر لیا۔ کچھ تو بتاؤ۔ ہمرے پیٹ میں ہول اٹھ رہت ہے۔''

''خالہ اماں! کچھ نہیں ہوا۔ اس کی کھانسی ٹھیک نہیں ہو رہی، اس لیے میں اسپتال میں بھرتی کرا آیا۔ گھر پہ دوائی ٹھیک سے نہیں پیتا۔ ناؤ ہاں پابندی سے پینی پڑے گی تو جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

''اچھا!'' بھولی بھالی، سیدھی سادی اماں بہل گئیں''ہم کا کب لے کے چلو گے؟'' انہوں نے اگلا سوال کیا۔

''آپ جا کر کیا کریں گی۔ ایک دو روز میں چھٹی ہو جائے گی، گھر آ جائے گا۔'' شاہد نے انہیں ٹالا۔

کاوش اسپتال گیا تو عثمان بے بسی کے عالم میں لوہے کے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ جو سرکاری وارڈ میں قطاروں میں بچھے ہوئے تھے۔

''تمہاری راہ تک رہا تھا کب سے؟'' کاوش کو دیکھتے ہی وہ بے چینی سے بولا، ''میرا ایک کام کر دو گے۔''

''کہو۔''

یا تو مجھے یہاں سے گھر لے چلو، یا پھر میرے کاغذ قلم مجھے یہاں لا دو، میرا ناول بس اختتامی مراحل میں ہے۔ میں جلد از جلد اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔''

''پہلے اپنا علاج کرواؤ، جب صحت یاب ہو جاؤ گے تو لکھتے رہنا آرام سے۔''

''علاج ہو رہا ہے یہاں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میں ٹھیک ہونا چاہتا ہوں' مجھے اپنے خواب پورے کرنے ہیں۔ مجھے اپنا ناول مکمل کر کے شائع کروانا ہے اور......''

"ابھی تمہیں کون لکھنے دے گا۔ یہاں ڈاکٹر ہیں۔ گھر پر اماں ہیں۔"
کاوش جھنجھلایا۔ عثمان کی ادھوری بات میں جو خواب پنہاں تھا اُسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔
"یہاں کیسے لکھو گے۔ ڈاکٹر صاحبان جان کو آجائیں گے۔" کاوش نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔
"میں رات میں لکھ لوں گا جب سب سو جائیں گے۔"
"کیسے؟ موم بتی کی روشنی میں یا لالٹین کا بندوبست کرو گے۔ رات کو اس وارڈ میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔"
عثمان نے سر جھکالیا، وہ اب خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال میں بمشکل دو دن گزار کر عثمان گھر واپس آگیا۔ اماں اسے دیکھ دیکھ پریشان ہو رہی تھیں۔
"کا بیماری لگ گئی بڑا! سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ رنگ روپ سارا جھلس گیا۔"
"کچھ نہیں ہوا اماں! بس کھانسی ذرا بڑھ گئی ہے۔ علاج کروا تو رہا ہوں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"
عثمان نے انہیں تسلی دینے کو لاپرواہ لہجہ اختیار کیا۔ لہجے میں لاپروائی تھی۔ وہ مزاج اور علاج میں بھی در آئی تھی۔ جیسے جیسے ناول تکمیل کے قریب پہنچ رہا تھا۔ بیماری بھی شدت پکڑ رہی تھی۔

☆☆☆

خالو متفکر چہرہ لیے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ جس پر گل اندام کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی سفید چادر بچھی تھی۔ ان کے پلنگ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ بچھی چارپائی پر خالہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ دوپٹے کے ہالے میں ان کا چہرہ بھی زرد پڑ رہا تھا۔
"یہ تو بہت برا ہوا، عمو میاں کو ٹی بی بتائی ہے ڈاکٹروں نے مری سینی ٹوریم لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔"
"شاہد کی بات ہوئی تھی ڈاکٹروں سے، انہوں نے کہا ہے کہ ابھی ابتدا ہے۔ صحیح علاج ہو جائے تو بیماری ختم ہو جائے گی۔" خالہ کو اپنا بھانجا اور ہونے والا داماد بیٹے کی طرح ہی پیارا تھا۔ مگر فکر تو انہیں بھی لگ گئی تھی۔
"اللہ کرے کہ عمو میاں بالکل صحت یاب ہو جائیں۔ مگر کیا گارنٹی ہے کہ بیماری پھر سے نہ آجائے؟" خالو کے لہجے اور بات میں اندیشوں کے ناگ سرسرا رہے تھے۔ خالہ اک دم خوف زدہ ہوائیں۔
"اللہ رحم کرنے والا ہے۔ گارنٹی تو کسی کی اگلی سانس کی بھی نہیں۔" خدانخواستہ شادی کے بعد ایسی ویسی کوئی صورت حال ہوتی تو کیا بیٹی کو گھر بٹھا لیتے؟"
"ابھی تو بیٹی اپنے گھر ہی ہے، رخصتی تو نہیں دی۔"
"شریفوں میں زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ جب زبان سے کہہ دیا کہ بیٹی آپ کی ہے تو ان ہی کی ہوگئی۔"
خالہ کو ریت رواج بھی عزیز تھے اور بہن بھانجا بھی پیارے تھے مگر خالو ۔۔۔ کچھ اور سوچنے لگے تھے۔ ۔ شاہد کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اور کاوش ان کے پاس آیا تھا وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ بیماری کم یا زیادہ، یہ معاملہ اپنی جگہ مگر بیماری تھی تو، یہ واقعہ خود اپنی جگہ اہم تھا۔
"میں نے سنا ہے، نوکری بھی چھوٹ گئی ہے۔"
خالو کو یاد آیا۔
"کس سے سنا؟" خالہ اس نئی اور تکلیف دہ غیر متوقع خبر پر بھونچکا سی رہ گئیں۔
"بس، سنا ہے کسی سے۔" خالو نے انہیں ٹالا۔
"کیا خبر، کسی نے یونہی بے پر کی اڑائی ہو۔"
خالہ رجائیت پسندی کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔
"بتانے والا معتبر ہے۔ جھوٹی خبر نہیں ہے۔"
خالو پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے، چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھے بغیر بولے۔
"فیصلہ اب دوبارہ کرنا پڑے گا، سوچ سمجھ کر دیکھ بھال کر۔"
"اے لو، لوگ زبان پر تو کٹ مر جاتے ہیں۔ اپنی جان دے دیتے ہیں۔ انہیں لڑکی دینے میں

تاثل ہو رہا ہے۔" بیوی کی بڑبڑاہٹ پر توجہ دیے بغیر وہ باہر نکل گئے۔

صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ٹیک لگائے گل اندام نے آنکھیں موند لیں۔ وہ ارادتاً تو یہاں نہیں آئی تھی مگر چلتے پھرتے جب کانوں میں آوازیں پڑیں جو اسی کے متعلق تھیں تو تجسس اور بے اختیاری نے اسے وہاں کھڑا کر دیا۔

آنکھیں موندے وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر آنکھیں کھول کر اس صحن چمن کو دیکھنے لگی جہاں خزاں کی آمد تھی۔ پتوں کی سبزی زردی مائل ہونے لگی تھی اور وہ شاخوں سے جدا ہونے کو تیار بیٹھے تھے۔ عجیب اداسی، بے رنگی اور بے رونقی کا ماحول تھا۔ مسکراہٹ تو کہیں تھی ہی نہیں۔ نہ لبوں پر نہ درختوں پر۔

☆☆☆

درمیانے درجے کا چائے خانہ کیفے ڈی سوزا کے نام سے مشہور تھا۔ پہلے ایک گوانی عیسائی ڈی سوزا اسے چلاتا تھا۔ پھر کان پور سے ہجرت کر کے آنے والے شیخ حمید اللہ انصاری نے اسے خرید لیا تھا۔ ایک ماہ ہوا تھا خریدے ہوئے، نام کی تبدیلی ابھی زیرِ غور تھی۔

حسبِ معمول ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور صحافیوں کی الگ الگ منڈلیاں جمی تھیں۔ ادب، سیاست، صحافت، اپنے اپنے موضوعات تھے ہر منڈلی کے اور دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی، ترقی پسند؟ رجعت پسند؟ یا بورژوائیت؟ ادب کیسا ہونا چاہیے' تخلیق میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ گل و بلبل، چاند ستاروں اور محبوب و رقیب سے آگے بڑھ کر شاعری میں جو زنداں، انقلاب، اسلام اور حرّیت کی اصلاحات در آئی ہیں۔ انہیں کس تناظر میں دیکھا جائے۔ غزل، نظم، نثری نظم، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، بات کہاں سے کہاں نکل جاتی۔

سیاسی معاملات قائداعظم، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، غلام محمد اور اسکندر مرزا سے ہوتے ہوئے ابھی فی الحال صدر ایوب پر رکے ہوئے تھے۔ رائٹرز گلڈ بن چکی تھی۔ اس پر بھی خوب تبصرے ہوتے، کوئی مخالفت میں بولتا کوئی موافقت میں، عجیب ماحول ہوتا تھا۔ سارے مسائل سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیے جاتے اور چائے کی ان پیالوں میں روزانہ انقلاب لایا جاتا جو کبھی دوسروں کے پلّے اور کبھی ادھار کے پیسوں سے پی جاتی تھیں۔

کاوش، تین چار ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھا تھا۔ چہرے پر اداسی اور افسردگی تھی۔

''ہاں بھئی، ایسے جواں مرگ، باصلاحیت ادیب کے دنیا سے یوں اٹھنے کا جتنا غم کریں کم ہے۔'' بلند خیال جبل پوری اپنی منمناتی ہوئی آواز میں جملہ حاضرین سے مخاطب تھے۔

''یقین نہیں آتا۔ ایسا ہنستا بولتا، باغ و بہار سا شخص ہم سے جدا ہو گیا۔ ابھی تک آنکھوں میں وہ صورت پھرتی ہے۔'' حسین لکھنوی نے سگریٹ کا کش لے کر ایک آہ بھری۔

کاوش آج بہت خاموش بیٹھا تھا۔ بولنے سے زیادہ سن رہا تھا۔ دل پہ گہری چوٹ پڑی تھی۔ غم کے ساتھ ساتھ اسے فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔

''مرحوم آپ کے بھی بہت قریب رہے کاوش صاحب! بڑی نیاز مندی تھی آپ کی ان سے۔'' احسان گورکھ پوری نے کاوش کو مخاطب کیا۔

''جی، بہت، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یکا یک یہ کیا ہو گیا۔'' کاوش نے بے بسی سے ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔

''کیا بگڑتا تیرا جو نہ مرتا کوئی دن اور''۔
بلند خیال جبل پوری نے آخری گھونٹ پیتے ہوئے۔ غالب کے مصرعے پر گفتگو اور چائے کا اختتام کیا۔

☆☆☆

سیلن زدہ، اندھیرا زینہ، دل کی طرح بوجھل قدموں سے عبور کرتے ہوئے اوپر پہنچا تو اماں سامنے ہی پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔
بڑی دیر لگادی میاں، کہاں تھے؟"
"نوکری کے سلسلے میں ایک صاحب سے ملنا تھا، وہیں گیا تھا پھر ذرا دوستوں کے ساتھ چائے پینے چلا گیا۔" تھکے تھکے سے کاوش نے سلیپر اتارے اور ہاتھ منہ دھونے غسل خانے میں چلا گیا۔
"اب کیا ہوگا؟" تولیے سے ہاتھ منہ خشک کرتے ہوئے اس نے عثمان کا متفکر سوال سنا۔
"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" کاوش تولیہ کھونٹی پر ٹانگ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
"بہزاد بھائی کے یوں اچانک انتقال سے دونوں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ کھڑی ہوگئی تھی کہ اب اپنے ناولوں کو چھپوانے کے لیے پبلشر کہاں تلاش کریں اور تلاش کر بھی لیں تو کیا ضروری ہے کہ وہ ان کے ناول شائع کرنے پر رضا مند ہوجائے۔ بہزاد بھائی نے تو پیشگی ان سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ ناول لکھنے کی ذمہ داری لکھاریوں کی، اور چھاپنا ان کی ذمے داری انہیں ان دونوں باصلاحیت نوجوانوں سے بڑی امیدیں تھیں اور ان دونوں کو بہزاد بھائی سے بڑی توقعات تھیں۔ ساری امیدیں اور خواب، بہزاد بھائی کے ساتھ ہی مٹی میں مل گئے تھے۔
"میں نے بات کی تو ہے ایک پبلشر سے، حمید بھائی نے ملوایا تھا۔"
کیا بات ہوئی؟
عثمان نے بے تابی سے اسے دیکھا۔
"ناول پڑھ کر فیصلہ کریں گے۔ پسند آیا تو چھاپ دیں گے۔"
"پسند آجائے گا، اتنا بھروسا تو ہے اپنی صلاحیت اور تخلیق پر۔"
عثمان نے اعتماد سے کہتے ہوئے قلم دوبارہ کاغذ پر رواں کیا۔ اس کا ناول بس اختتام پذیر ہی تھا۔ آخری پیراگراف تھا جو وہ لکھ رہا تھا۔
"تمہارے لیے ایک پیام ہے۔" کاوش نے کچھ ہچکچاتے ہوئے جیب سے ایک لفافہ نکال کر عثمان کو دیا۔
"کیسا پیام؟" عثمان نے لفافہ ہاتھ میں لے کر حیرانی سے پہلے کاوش پھر سادہ لفافے کو دیکھا جس پر کوئی نام نہیں لکھا تھا۔
"مجھے تو صرف تم تک پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ سو نامہ بر بن کر تمہاری خدمت میں پیش کردیا۔ اب تم خود کھول کر دیکھ لو، کس نے دیا ہے اور کیا لکھا ہے۔"
کاوش بے نیازی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عجیب سی شام تھی، زرد اور سوکھے پتوں کو اپنے ساتھ ساتھ اڑائے، کہاں سے کہاں لے جارہی تھی۔ سرمئی شام میں اداسی اور خزاں کی زردی شامل ہوگئی تھی۔ پھر اس میں رات کی سیاہی گھل مل گئی۔ رات کی خاموشی اور تنہائی بھی گلے مل کر ایک ہوگئیں۔
عثمان کی زندگی میں اتنی طویل اور مہیب رات پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ سناٹا ایسا تھا کہ پوری کائنات ہی جیسے خاموش ہوگئی تھی۔ تاریکی اتنی کہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کبھی زندگی میں سورج دیکھا تھا یا آئندہ کبھی دیکھے گا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ روشنی کیسی ہوتی ہے مگر کچھ یاد نہ آرہا تھا۔ رنگ و روشنی کے سارے استعارے ختم ہوگئے تھے۔
الفاظ بجھ کر راکھ ہوئے اور سناٹے میں بدل گئے۔
خواب جل کر خاک ہوئے اور اندھیروں میں کھوگئے۔
اس کی ذہنی اور جسمانی تکلیف لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ کھانس کھانس کر وہ دہرا ہوا جارہا تھا۔ اور خون کی الٹیاں کرکے ادھ موا ہورہا تھا۔
عثمان اسپتال میں داخل تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے

فوری طور پر سینی ٹوریم میں داخل کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ شاہد اور ماجد بھائی اسے لے جانے کو تیار تھے۔ مگر وہ مہلت مانگ رہا تھا۔

''بس دو تین روز ٹھہر جائیں، پھر میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔'' عثمان بڑی منت کے ساتھ مخاطب تھا۔

''کیا کرو گے دو تین روز ٹھہر کر، ڈاکٹر جلد از جلد روانگی کا کہہ رہے ہیں۔''

''بس شاہد بھائی، فقط دو تین روز۔'' وہ اتنی لجاجت سے بول رہا تھا کہ شاہد بھائی فقط ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

وہ شدت سے کاوش کا انتظار کر رہا تھا۔ جو تھکا ہارا، رات گئے اس کے پاس آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' عثمان کی بے تاب نگاہیں اس پر جم گئیں۔

''پڑھ کر بتائیں گے۔ پرسوں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔''

''پرسوں تک پڑھ لیں گے ساجد صاحب؟'' عثمان امید ناامیدی کے درمیان جھول رہا تھا۔

''کہہ تو رہے تھے کہ پڑھ لیں گے؟'' کاوش کچھ دیر بیٹھ کر واپس گھر چلا گیا۔

عثمان لیٹے لیٹے تھک سا گیا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وارڈ کی بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ سوائے اس کے سب ہی مریض اپنے اپنے بستروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ زیادہ تر سو چکے تھے، کوئی کوئی جاگ رہا تھا؛ عثمان کی طرح۔ کبھی ان میں سے کسی کے کراہنے کی آواز پورے خاموش وارڈ میں ادھر سے ادھر پھیل جاتی۔

عثمان کے پاس وہ لفافہ اب تک موجود تھا جو کل اسے کاوش نے دیا تھا۔ سادہ سا سفید لفافہ اس نے اپنی جیب سے نکالا اور اس میں رکھا پرچا۔ ایک بار پھر پڑھنے لگا۔ مختصر سی تحریر تھی۔ کل سے اب تک کتنی ہی بار پڑھ چکا تھا۔ ہر بار پڑھتا اور خود کو نئے سرے سے اذیت میں مبتلا کرتا، یقین نہیں آ رہا تھا اسے اپنی آنکھوں پر، جو اسے پڑھ رہی تھیں، دل ماننے سے انکاری تھا، محبت اور اعتبار، دل کا اس طرح خون نہیں کر سکتے۔

وہ ایک ایک لفظ غور سے دیکھ رہا تھا، الفاظ بھی تو انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اچھے، برے، ظالم مظلوم، ہمدرد، بے درد، جادوگر الفاظ جو مار بھی دیتے ہیں۔ زندہ بھی کر دیتے ہیں۔

اس کاغذ پر جو الفاظ لکھے تھے، وہ اس کی موت کا پروانہ تھے۔ کتنا وقت گزر تا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے ان چند سطروں کو ہی دیکھتا رہا۔ پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ آنکھیں پتھرانے لگیں تب اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کاغذ کا وہ چھوٹا سا پرزہ تہہ کر کے واپس لفافے میں رکھا اور لفافہ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ لیٹتے ہوئے اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کل شاہد بھائی سے بات کرے گا۔

☆☆☆

اگلے روز خالہ، خالو، ماجد اور شاہد چاروں ہی اس کی عیادت کو آئے، اماں ان کی آمد سے کچھ دیر قبل کاوش کے ساتھ آئی تھیں۔ اتنے ہجوم میں شاہد بھائی سے بات کرنا، وہ بھی ایسی ضروری بات جس کا علم کسی اور کو نہ ہو، ذرا مشکل تھا مگر بہر حال یہ مشکل مرحلہ بھی عثمان نے کسی نہ کسی طرح طے کر ہی لیا۔

شاہد بھائی نے خاموشی سے اس کی گزارش سنی اور سنجیدگی سے اس کا کام کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اگلے روز حسب وعدہ وہ اس کا جواب لے آئے تھے۔ عثمان کو اسی جواب کی توقع تھی۔

ان کے جانے کے بعد کاوش آیا تھا۔ اس کے پژمردہ چہرے پہ جو جواب لکھا تھا، اسے پڑھ کر عثمان کا دل سہم گیا، دل جو پہلے ہی نیم مردہ ہو چلا تھا پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے کاوش سے سوال کر ہی لیا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔'' کاوش نے ایک گہری سانس لی، اور سر جھکائے چند منٹ

خاموش رہا۔ پھر بولنا شروع کیا تو اس کی آواز مدھم تھی۔
"ساجد صاحب کو ناول پسند نہیں آئے، وہ انہیں چھاپنے سے انکاری ہیں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" عثمان پر بجلی گر پڑی۔
"کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہر کوئی بہزاد دہلوی نہیں ہوتا۔" کاوش نے تلخی سے جواب دیا۔
"میں نے بہت محنت کی تھی اس ناول پر۔"
عثمان بڑبڑایا۔
"یہ لوگ برسوں کی محنت کو ایک پل میں، خاک کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔" کاوش کی تلخی بدستور قائم تھی۔
"مجھے یقین نہیں آ رہا کاوش کہ......" عثمان نے اسے غور سے دیکھا۔
"کس بات پر یقین نہیں آ رہا؟ بھائی میرے کل یگ ہے کچھ بھی ممکن ہے یہاں، کچھ بھی۔"
کاوش نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"ہاں تم نے ٹھیک کہا میرے دوست! اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔ کچھ بھی۔"
عثمان اسی کے الفاظ دہراتا ہوا لیٹ گیا۔ اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ زیادہ دیر تک بیٹھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ تکیے پر سر رکھ کر وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔
"اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔"
آج کے دن اسے دو جگہ سے "نہیں" سننے کو ملا تھا۔"
مگر ایک ہی جواب پر اس کے احساسات جدا جدا تھے، واقعی دنیا عجیب جگہ ہے، یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ممکن ہے۔

☆☆☆

اگلے ہی روز اسے مری سینی ٹوریم میں پہنچانے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ اس کے ساتھ شاہد بھائی گئے تھے۔ ویسے تو کاوش نے بھی پیشکش کی تھی مگر عثمان نے منع کر دیا۔
"چھوڑو یار! تم کیا کرو گے وہاں جا کر؟ یہاں اماں کا خیال رکھنا۔"
وہ شاہد بھائی کے ساتھ چلا گیا۔
اور مشکل سے پندرہ روز گزرے ہوں گے، عثمان ان ہی کے ساتھ واپس بھی آ گیا فرق صرف اتنا تھا کہ جاتے وقت جسم میں روح موجود تھی۔ واپسی کا سفر بدن کے خالی پنجر کا تھا۔ روح پرواز کر گئی تھی۔
اکلوتی اولاد کی جواں مرگی نے اماں کو غم کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ خالہ کا کنبہ نہ ہوتا تو وہ تو اسی غم کو سینے سے لگائے بیٹے کے پہلو میں ہی اپنی قبر بنا لیتیں۔ خالہ انہیں اپنے گھر لے گئی تھیں۔ دوسرے تیسرے روز کاوش بھی ان کی دلجوئی کو وہاں پہنچ جاتا۔
خزاں دبے پاؤں رخصت ہونے کو تھی۔ بہار نے چپکے سے پیش قدمی کر دی۔ بڑے سے کچے آنگن میں ایستادہ امرود، جامن، لیموں کے درخت زرد کینچلی اتار کر سبز پوشاک میں ملبوس تھے۔ املتاس اور چنبیلی ڈھیروں ڈھیر پھولوں سے لدے گھر بھر کو مہکا رہے تھے۔ ایسی رنگیلی، مہکی ہوا، مختلف خوشبوؤں کو خود میں سموئے چلتی تو جس پر سے گزرتی اسے مہکا دیتی۔

☆☆☆

عثمان کی وفات کا قصہ تھوڑا کچھ پرانا ہو چلا تھا۔ غم کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ وہ ابھی فراموش تو نہیں ہوا تھا نہ ہی قصہ پارینہ بنا تھا مگر بہرحال دنیا کے معاملات زندگی اور زندوں سے مشروط ہیں۔ انہیں مردوں سے جوڑ کر زندگی کوئی نہیں گزارتا نہ ہی گزار سکتا ہے۔
تو اب سب نے اپنے آنسو پونچھ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ کہاں کون سا معاملہ توجہ طلب، کون سا مسئلہ غور طلب ہے۔
خالو کو گل اندام سامنے کھڑے نظر آ رہی تھی۔

عمر کے بیسویں سال میں لگی، اس عمر میں گل اندام کی ماں بیاہی اور سہاگن کی حیثیت سے تقریباً پانچ سال گزار چکی تھی، فکر خالہ کو بھی تھی۔ عثمان سے رشتہ طے تھا، وہ نہ رہا۔ اب کون؟ رشتہ دار زیادہ تر انڈیا میں تھے۔ پاکستان میں ویسے بھی کم تھے۔ جو تھے ان میں گل اندام کے لیے کوئی موزوں لڑکا تھا بھی نہیں۔

الہ آباد سے گل اندام کی سگی پھوپھی نے اپنے بیٹے کے لیے ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مگر اتنی دور بھیجنے پر ماں باپ کا دل راضی نہ تھا پھر خالہ اماں جنہیں گل اندام بہت پیاری، بہت عزیز تھی۔ انہیں گوارا نہ تھا کہ وہ بیاہ کر کہیں اور جائے۔

''گل اندام میری ہی بہو بنے گی۔'' جوبن پہ آئی بہار کی ایک گلابی شام انہوں نے خالہ اور خالو کے سامنے اعلان کیا۔

خالہ کی سمجھ میں فوراً تو کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے بڑی آپا کو یوں دیکھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو مگر خالو فوراً سمجھ گئے۔ وہ اس لیے سمجھ گئے کہ بیوی کے مقابلے میں زیادہ جہاں دیدہ، دور اندیش اور عقل مند تھے۔ دل کے کسی نہاں خانے میں انہوں نے کاوش کو عثمان کی جگہ دے دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خالہ اماں نے جب کاوش کا نام پیش کیا تو وہ نہ حیران ہوئے نہ معترض۔

کاوش کی زندگی کی سب سے خوب صورت بہار کا سب سے حسین ترین دن تھا۔ جب گل اندام کو اس سے منسوب کر کے چھ ماہ بعد نکاح رکھ دیا گیا۔ اس کی نوکری ریڈیو پاکستان میں لگ چکی تھی۔ افسانے باقاعدگی سے لکھ رہا تھا۔

آمدنی اتنی تو ہو چکی تھی کہ اپنی خانگی زندگی کی شروعات آسانی سے کر سکتا۔

پھر موسم گرما کے اختتام اور سرما کے باقاعدہ آغاز سے پہلے کے معتدل موسم کی ایک سہانی شام عصر و مغرب کے درمیان گل اندام باضابطہ طور پر کاوش کی ہو کر اس کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

رخصت ہو کر وہ خالہ اماں کے گھر ہی آئی تھی جہاں انہوں نے کاوش کو اب عثمان کی جگہ دے رکھی تھی۔

شادی پر انہوں نے وہ سارے چاؤ چونچلے کیے جو انہوں نے کبھی عثمان کے لیے سوچے تھے۔

''اس سے پہلے کہ میں آپ کی رونمائی کروں۔ آپ اس کی رونمائی کیجیے۔''

کاوش نے دلہن بنی نازک گل اندام کے سامنے کتاب رکھی۔ اس کا پہلا ناول۔ جو حال ہی میں ''چھپ'' کر آیا تھا اور اس نے جس کی کس کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔

گل اندام کے حنائی ہاتھوں نے وہ کتاب اٹھائی اور کھولی۔

انتساب،

اس کے نام جس کا تصور دل میں لیے یہ ناول لکھا

سادہ صفحے پر قلم سے لکھا تھا۔

زندگی کی پہلی خوشی،

زندگی کی سب سے بڑی خوشی کے لیے

خوبصورت، نازک، حنائی ہاتھ کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے بعض صفحات پر وہ کتنی دیر رکی رہی۔ پھر جھکا ہوا سر اٹھا۔

''یہ آپ نے لکھا ہے؟''

اس کی حیران آنکھیں ایک لمحے کو کاوش کی بے تاب نگاہوں سے ٹکرائیں اور پھر جھک گئیں۔

''کوئی شک ہے؟'' کاوش نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

گل اندام کے آجانے سے وہ بوسیدہ تنگ وتاریک فلیٹ بھی جیسے جگمگا اٹھا تھا۔ خالہ نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا اور کاوش نے اسے ایسی ملکہ عالیہ کا رتبہ دیا ہوا تھا جو اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان تھی۔ اس کی اقلیم محبت کی اکیلی تاجدار، کاوش اس کی ایسی ناز برداریاں کر رہا تھا جو شاید ہی کسی نے کسی کی کی ہوں۔

www.urdusoftbooks.com

ساحل کی گیلی ریت پر دونوں اپنے قدموں کے نشان ڈالتے چلتے جا رہے تھے۔ سمندر لامتناہی تھا۔ کہیں حد نظر نہیں آ رہی تھی، کاوش کی محبت کی طرح۔

"آپ اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟" کاوش نے گل اندام کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جسے اس کا کاسنی دوپٹہ بار بار اڑتا اور چھپا دیتا۔

"آپ مجھے، آپ کہہ کر کیوں مخاطب کرتے ہیں؟" سمندر کی اُمڈتی بپھرتی ہوئی موجوں کو دیکھتے ہوئے گل اندام نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"عشق میں احترام لازم ہے۔ ہمارے اقبال بھی تو کہہ گئے ہیں۔

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"۔

"اپنے مطلب کے لیے اس مصرعہ کا استعمال بہت خوب کیا آپ نے" گل اندام مسکرائی۔

"محبت اور تشریح محبت کے لیے تھوڑی سی خود غرضی جائز ہوتی ہے۔"

کاوش، اس ساحرہ کو دیکھتا، پھر دیکھتا اور دیکھتا ہی رہتا۔ اس کا فسوں تھا کہ ختم تو کیا کم ہونے میں بھی نہیں آتا تھا۔

"خود غرضی تو کبھی بھی کہیں بھی جائز نہیں ہوتی۔ چاہے کم ہو یا زیادہ۔" گل اندام ساحل پر پڑے، کائی زدہ بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ کاوش بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں، اخلاقیات تو یہی کہتی ہے۔ مگر" وہ اک لمحے کو خاموش ہوا۔ "محبت مست و بے خود ہوتی ہے۔ انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اور دیوانگی میں جو ہو کم ہے۔"

گل اندام خاموشی سے ان لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ جنہوں نے آن واحد میں ان کے قدموں کے نشان مٹا ڈالے تھے۔ ساحل یوں ہو گیا تھا جیسے کہ وہ وہاں کبھی چلے ہی نہیں۔ جسے ان کے قدموں کے نشان وہاں ثبت ہی نہ ہوئے ہوں۔

"اتنی کم گو ہیں آپ، ترس جاتا ہوں آپ کی باتیں سننے کو بہت جی چاہتا تھا۔" تیرا حسن، تیرے حسن بیاں تک دیکھوں"

مگر آپ نے خاموشی کا پردہ حائل کر رکھا ہے، اپنے اور میرے درمیان۔" کاوش اس بت طناز سے شکوہ کر رہا تھا۔

"بچپن سے ایسی ہی ہوں، خاموش طبع اور کم گو؟" افق کی وسعتوں میں کہیں دیکھتے ہوئے وہ دھیمے سے بولی۔

"آپ کی یہ خاموشی ہماری تو جان لے رہی ہے دھیرے دھیرے۔" کاوش کی نگاہوں میں التفات کے ساتھ ساتھ اضطراب بھی سمٹ آیا۔

گل اندام نے چپ کی اوڑھنی میں خود کو مزید سمیٹ لیا، نیلے گگن تلے لہروں کا شور تھا جو دونوں کے ہمراہ تھا۔

"یہ لہریں دیکھ رہی ہیں۔ جو ہمارے قدموں کو چوم کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ میرا دل' میرے جذبات، احساسات، آپ تک پہنچ کر یوں ہی واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں لگتا ہے کہ آگے بڑھنے کا راستہ ہی نہیں مل رہا۔" کاوش کی گہری نگاہیں گل اندام پر جمی ہوئی تھیں۔

"نیا ناول لکھنے کا آغاز آج ساحل سے ہی کر دیا؟"

"یہ ناول کے جملے نہیں ہیں، میرے دل کی آواز ہے۔" کاوش سنجیدہ تھا۔

"کہتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر ایک سمندر ہوتا ہے۔ کنارے کھڑے ہو کر سمندر کا صرف نظارہ ملتا ہے اس کے بارے میں آگہی نہیں۔" گل اندام ڈوپٹا سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

بیس روپے من آٹا، اس پر بھی سناٹا

پاک بھارت 1965 کی جنگ ختم ہوئے دو سال گزر گئے تھے، صدر مملکت کی مخالفت عوامی سطح پر اب بڑھتی جا رہی تھی۔ چینی پر پچاس پیسے بڑھ گئے تھے۔ عوام اور سیاسی تحریکیں اٹھ۔ کھڑی ہو رہی

تھیں۔ موصوف اپنا تام جھام ایک اور جنرل کے حوالے کر کے خود سٹک لیے۔ جالب نام کا دیوانہ جیل کی ہوا کھا کر بھی باز نہیں آ رہا تھا۔ نئے آنے والے کو بھی للکار بیٹھا۔

تم سے پہلے جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا

احباب کی محفلوں میں کاوش مسعود فیض کی انقلابی اور حبیب جالب کی باغیانہ شاعری کی مدح کرتا، داد کے ڈونگرے برساتا مگر عملی طور پر اس کی زندگی اور کیریئر کا نصب العین مولانا الطاف حسین حالی کا یہ مصرعہ تھا۔

''چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی''

ریڈیو پر نوکری کے دوران اس کی زیادہ نیاز مندی اور قربت ان ہی افسران اور افراد سے رہی جو حکام وقت کے حامی و وفادار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد اپنے سینیئرز سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔

اس سال اس کا دوسرا ناول منظر عام پر آیا، جو ادبی حلقوں میں اور عوامی سطح پر بھی بہت پسند کیا گیا۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی بحث اور کشمکش میں وہ ہمیشہ درمیان میں کھڑا دکھائی دیتا۔ دو ناول اور افسانوں کے ایک مجموعے نے ادبی حلقوں کو چونکا دیا تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تھا اور ابتدا میں ہی اسے ایسے ایسے ذہین باصلاحیت اور جفادری افراد میسر آ گئے تھے جو کہ آگے چل کر اس ادارے کو بام عروج پر پہنچانے والے تھے۔ تخلیق کاروں کی کھیپ ریڈیو اور تھیٹر سے، ٹیلی ویژن کا رخ کر رہی تھی۔

کاوش مسعود نے کامیابیوں ایک زینہ اور اپنے سامنے دیکھا تو اس پر چڑھ گیا۔ سقوط ڈھاکہ کا سیاہ اور المناک باب، تاریخ پاکستان میں رقم ہونے میں ابھی چند ماہ تھے جب اس نے اپنے لکھے ہوئے چند افسانوں کی ڈرامائی تشکیل کر کے پیسے تو اتنے نہیں کمائے جتنی داد اور شہرت حاصل کی۔

لکھنے والے ابھی 1947 کے فسادات اور انسانی المیوں کو قلم بند کرنے سے ابھی پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئے تھے۔ 16 دسمبر 1971 لکھنے والوں کو اور مواد مہیا کر گیا۔ کاوش مسعود کا تیسرا ناول ''تقسیم در تقسیم'' کے نام سے دو سال بعد ہی آ گیا۔

اب اس کا قلم اور ہمدردیاں ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے نعرے کے ساتھ تھیں۔ وہ قلم جو اپنے افسانوں میں آمریت کو جواز فراہم کر رہا تھا۔ اب جمہوریت کے گن گانے لگا۔

ریڈیو پاکستان کی نوکری وہ چھوڑ چکا تھا۔ حکومت نے ادب کے فروغ اور ادیبوں کی بہبود کے لیے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا۔ کاوش مسعود ایک بہت اہم عہدے اور معقول مشاہرے پر وہاں ملازم ہو گیا۔

وقت کے بہتے سمندر میں وہ ایک مضبوط اور محفوظ کشتی میں بیٹھا تھا۔ بے حد خوبصورت، وفا شعار اور اطاعت شعار بیوی، تین صحت مند، ذہین اور پیارے سے بچے ایک کامیاب اور مشہور لکھاری کے طور پر آسودہ حال اور خوشحال زندگی، یہ سب کچھ وہی تھا جس کے اس نے کبھی خواب دیکھے تھے اور جس کی تعبیر پانے کے لیے تمام جتن کیے تھے۔ انسان اور ہوا کا رخ پہچاننے کی صلاحیت فطری تھی۔ اس صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے اس نے خود کو سورج مکھی بنا لیا تھا۔ جالب کا قلم ایک بار پھر بپھر گیا تھا۔

''لاڑکانہ چلو، ورنہ تھانے چلو''

کاوش سوشلزم کی حمایت اور تعریف میں افسانے اور مضامین رقم کر رہا تھا۔ دیوانہ، ناعاقبت اندیش شاعر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پابند سلاسل تھا اور عاقل، دانا اور ہوشیار لکھاری پوش علاقے میں اس پلاٹ پر اپنا گھر بنوانے میں مصروف تھا جو حکومت وقت کی حمایت کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

سارے خواب ایک ایک کر کے تعبیر پا رہے تھے۔ ساری خواہشیں پوری ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک انسان کو اور کیا چاہیے؟ مگر اولاد آدم کو ایک سونے کی وادی مل جائے تو وہ دوسری وادی کی آرزو کرے گا

www.urdusoftbooks.com

اور انسان کا پیٹ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

☆☆☆

اماں کے انتقال کے بعد وہ فلیٹ چھوڑ کر وہ ریڈیو پاکستان کے قریب کرائے پر رہنے لگا تھا۔ وہاں سے اب اپنے نئے بنگلے میں شفٹ ہوا تھا۔ وہ اسکوٹر جو شادی کے بعد خرید اتھا۔ اسے کب کا خیر باد کہہ دیا تھا۔ اب نئے نویلے بنگلے کے کار پورچ میں چمچاتی کیڈ لک کھڑی تھی۔

گل اندام کو پرندوں کا بہت شوق تھا۔ پہلے گھر اتنا بڑا نہیں تھا تو چند پنجروں میں طوطا، مینا، رنگ برنگی چڑیاں رکھ کر اپنا شوق پورا کر لیتی تھی اب نئے بنگلے میں اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اسے کافی جگہ مل گئی تھی۔

چھٹی کے دن نرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کے لیے، ناشتے کے بعد وہ لان میں نکل آیا۔ گل اندام اپنے پرندوں کے ساتھ مشغول تھی۔ کاوش مسعود دلچسپی سے پرندوں کا اور حسبِ معمول انتہائی محبت سے گل اندام کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

نارنجی چونچ اور سیاہی مائل بھورے پروں والی مینا کو شور مچاتے ہوئے دیکھتے دیکھتے وہ مسکرا دیا۔ گل اندام کو مخاطب کر کے بولا۔

''صحبت کا اثر بھی نہ آیا آپ پر؟''

''کیا مطلب؟'' مٹھو میاں کو چوری کھلاتے کھلاتے وہ چونکی۔

''یہ بہت بولنے والا اور شور مچانے والا پرندہ ہے، پرانی داستانوں میں اس کا کردار کہانیاں سنانے والے کا ہوتا تھا۔ کتنے پرندے ہیں آپ کے پاس، چڑیاں، طوطا، مینا، بلبل، فاختہ، مور، کبوتر، کسی سے بھی چہچہانا نہیں سیکھا۔''

''ہر چند سال بعد آپ کو اس شکوہ، جواب شکوہ میں کیا لطف آتا ہے؟ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا جواب کیا ہوگا۔'' گل اندام اسے جواب دے کر مبہوت سی مور کو نیلے اور سبز پر پھیلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''شاید مور کی پرچھائیں پڑ گئی ہے آپ پر۔'' کاوش مسعود نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

گل اندام نے سوال پوچھنے کے لیے زبان کے بجائے نگاہوں کا استعمال کیا تھا۔

''مور آسانی سے گھلتا ملتا نہیں ہے دوسرے پرندوں کے ساتھ، الگ تھلگ رہنے والا مزاج ہے اس کا، شاید حسن کا زعم ہو۔'' اس نے اکسانے اور چھیڑنے والا لہجہ اپنایا۔

''زعمِ حسن کے ساتھ پیروں کی بدصورتی بھی تو جڑی ہوئی ہے۔'' گل اندام کی نظریں رقص کرتے مور پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''مگر آپ کا حسن تو بے عیب ہے۔''

''بے عیب اور باقی تو بس اللہ کی ذات ہے۔ انسان اور اشیاء کا حسن کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک دن ڈھل کر فنا ہو جاتا ہے۔'' گل اندام پہ اپنے پرندوں کی صحبت کا اثر نہیں ہوا مگر لکھاری شوہر کی صحبت میں فلسفیانہ باتیں آگئی تھیں۔

''محبت تو کبھی فنا نہیں ہوتی۔'' کاوش گل اندام کے ساتھ ایک مکمل اور خوبصورت ماحول محسوس کر رہا تھا۔

''محبت کرنے والے فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر محبت کے قائم دائم رہنے کا کیا جواز ہے۔''

گل اندام اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سرما کی دھوپ پرندوں اور پھولوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ کاوش نے ایک گہری سانس لے کر سگریٹ سلگایا۔ کبھی کبھی دونوں کے درمیان گفتگو ایک عجیب موڑ پر ختم ہوتی تھی۔ ایسا موڑ جس پر کھڑے ہو کر اس کے لیے سوچ کا ایک نیا در وا ہو جاتا تھا۔

کیا ہے یہ سب؟

''گل اندام بھی شاید محبت ہی کی طرح ہے۔ بہت خوب صورت، بے تحاشا حسین اور بے حد عجیب'' ہمیشہ کی طرح وہ یہ بات آج بھی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
ان کو زباں ملی تو ہم ہی پر برس پڑے

ذوالفقار علی بھٹو کے بنائے ہوئے نیک اطوار اور سادہ مزاج چیف آف آرمی اسٹاف نے 1977 میں اس شعر کی معنویت اور بھی اچھی طرح قوم پر واضح کردی۔

دوسرا مارشل لاء اور نیا حکمران تھا۔

عوامی لیڈر اور روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والا رہنما تخت اقتدار سے اتار کر تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ مخالفین کے لیے ٹکٹکی، کوڑے اور جیل کی سزائیں تھیں۔

فرزانے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے ملک سے باہر چلے گئے یا اپنی زبانیں اور قلم تالوں میں رکھ کر چین سکون کی زندگی بسر کرنے لگے، جن، دیوانوں کی زبانیں رکیں نہ قلم، ان میں وہی جالب بھی تھا جس کی دیوانگی بڑی پرانی تھی۔

کرگس کو ہما، صرصر کو صبا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء بندے کو خدا کیا لکھنا

کڑی سزائیں پا کر بھی دیوانے شاعر کا دماغ درست نہ ہوا۔ عوام کو بہلانے کے لیے حکومت نے جو "ریفرنڈم" کا کھیل تماشا لگایا تھا، اس پر بھی وہ بول اٹھا۔

ہو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرنڈم تھا

کاوش مسعود کے لیے یہ ایک مشکل وقت تھا۔ اس لیے نہیں کہ ایک بار پھر جمہوریت کی ٹرین پٹڑی پر سے اتر گئی تھی۔ نہ ہی اس لیے پریشان تھا کہ زبان و بیان کی آزادی پر قدغن لگ گئی تھی۔

اسے بس اپنی ملازمت اور اپنے ادبی کیریئر کی فکر تھی۔ وہ ملک کا جانا پہچانا اور مانا ہوا ادیب بن چکا تھا۔ اپنی تمام تر ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ اخبار میں کالم بھی لکھنے لگا تھا۔ سوشلزم اور جمہوریت کی تعریف میں اور حمایت میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہا تھا۔ تختہ دار پر چڑھ جانے والے لیڈر کی شان میں مدح کے جو جام بے دریغ لنڈھائے تھے۔ اب وہ جام الٹا کے رکھ دینے کا وقت آگیا تھا۔

اس نے ملک سے باہر سکونت اختیار کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک بیوی اور تین بچوں کے ساتھ باہر منتقل ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ معاشی مسائل حل کرنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ وہ خود ایک پرسکون، کسی حد تک پرتعیش زندگی گزار رہا تھا۔ اپنے بیوی بچوں سے وہ دیوانگی کی حد تک محبت بلکہ عشق کرتا تھا۔ انہیں معمولی سی تکلیف دینا بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

اس نے ملک سے باہر منتقل ہونے اور سکونت اختیار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب اس کے قلم کا رخ اسلام اور اس کی رحمت و برکات کی طرف ہو گیا۔ اسلامی حکومت اور مسلمان' دین دار حکمران معاشروں اور تہذیبوں کے لیے کس طرح خیر و فلاح کا باعث بنتے ہیں۔ قلم کے سورج مکھی کا رخ آفتاب اقتدار کی سمت ہوا تو اس کی تنقید اور مخالفت میں بھی لکھا جانے لگا۔ تھوڑے تھوڑے محدود پیمانے پر ہی سہی مگر لکھنے والے آمر و جابر اور اس کے وظیفہ خوار حمایتوں کے خلاف لکھ ہی رہے تھے۔

ادھر افغانستان میں امریکہ کی بزرگانہ سرپرستی اور پاکستان کی برادرانہ مدد کے زیر سایہ روس کے خلاف جہاد جاری تھا۔ افغان مہاجرین کے غول کے غول بے دریغ سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ ان میں آدھی سے زیادہ تعداد کراچی کا رخ کر رہی تھی۔ ملک کے دوسرے حصوں سے بھی روزگار کی تلاش میں لوگ یہاں آ رہے تھے۔ بس رہے تھے پھر یہاں کی اپنی آبادی جو خرگوش کے بچوں کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اب اس شہر میں مختلف ہاؤسنگ اسکیمیں، کثیر المنزلہ عمارتیں، فلیٹس بننے لگے تھے۔ مختلف مقامات پر کچی آبادیاں، کسی پھوڑے کی طرح شہر کے وجود پر ابھرنے لگی تھیں۔

پڑوسی ملک سے مہاجرین کے ساتھ ہیروئن، کلاشنکوف اور دہشت گردی بھی ہجرت کر کے یہاں

آ گئی تھی۔ کاوش مسعود نے ان سب کے پس منظر میں خاص طور پر روس کے خلاف افغان جہاد پر ایک ناول لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے وہ پہلے مکمل ہوم ورک کر رہا تھا۔ خاص طور پر وہ افغان مہاجرین سے کئی بار ملا۔ ان سے ناول کے لیے بہت سے مفید کلیو اور معلومات ملیں۔

ابھی ناول ایک تہائی مکمل ہوا تھا کہ سی ون تھرٹی طیارہ فضا میں ہی پھٹ گیا۔ آم کی پیٹی کے ساتھ ساتھ سربراہ مملکت، امریکن سفیر اور ڈپلومیٹ، کئی اعلا فوجی افسران، جن میں ایک بے مثال ادیب بھی تھا سب راکھ ہو کر پیوند خاک ہو گئے۔

کاوش مسعود کا ناول کھٹائی میں پڑ گیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے امیر المومنین رخصت ہو گئے تھے۔ افغانستان سے روسی فوجیوں کا انخلاء ہو رہا تھا اور اب وہاں مختلف دھڑے آپس میں ''جہاد'' کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کاوش مسعود نے بے دلی سے اپنا ناول مکمل کیا۔ وہ شائع ہوا مگر ایسی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ ہواؤں کا رخ بدل چکا تھا اور ساتھ ساتھ سورج مکھی کا بھی۔

جالب نے جس دبلی پتلی لڑکی کی وطن آمد پر کہا تھا۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے
ایک نہتی لڑکی سے

وہ لڑکی اب ملک کی وزیراعظم بن چکی تھی۔ دنیائے اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم، عوام کو خصوصاً جیالوں، متوالوں کو بڑی امیدیں تھیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات ہے کہ یہاں پر سرکار کی آمد کے ساتھ فیض کا سدا بہار مصرعہ چسپاں رہتا ہے۔

''تھا جس کا انتظار، یہ وہ سحر تو نہیں''

تو وہ سحر ابھی آئی نہیں تھی جس بہار کے انتظار میں عوام تھے، وہ بہار ہنوز خزاں کی دست رس میں تھی۔ جالب دیوانہ ایک بار پھر مایوس ہو گیا۔

حالات اب بھی وہی ہیں فقیروں کے
دن بدلے ہیں فقط وزیروں کے

ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

☆☆☆

سڑک پر بری طرح ٹریفک جام تھا۔ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے میں انتہائی مشکل پیش آ رہی تھی۔ بسیں، کاریں، رکشے، سوزوکی ہر قسم کی چار پہیوں والی گاڑیاں ایک کے پیچھے ایک ہارن بجا بجا کر اپنا اور دوسرے کا بلڈ پریشر ہائی کر رہی تھیں اور شور کی آلودگی میں اضافہ بھی۔

برانڈ نیو کرولا کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا کاوش مسعود اب باقاعدہ پریشان ہو چلا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اضطراب کی حالت میں کلائی سامنے کر کے اس پر بندھی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھتا اور پھر بے بسی سے سامنے اور دائیں بائیں گاڑیوں کے ہجوم کو یوں دیکھنے لگتا جیسے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ساری گاڑیاں کسی جادو کے زور سے غائب ہو جائیں گی۔ مگر یہ کراچی شہر کا ٹریفک جام تھا۔ اسے رواں دواں دیکھنے کے لیے ایک صبر آزما انتظار کی ضرورت تھی۔ کاوش مسعود نے ایک بار پھر وقت دیکھا اور پھر فیصلہ کر لیا۔

''مصری شاہ!'' اس نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

''جی سر!'' وہ اٹین شن ہو گیا۔

''میں پیدل گھر جا رہا ہوں، تم گاڑی لے آنا۔'' اسے حکم دے کر کاوش دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور حیرت کا اظہار کرتا یا اسے روکنے کی کوشش کرتا، وہ چند قدم چل کر آگے بھی جا چکا تھا۔ جس جگہ وہ ٹریفک جام میں پھنسا تھا یہاں سے اس کا گھر گاڑی کے ذریعے دس منٹ کی دوری پر تھا۔

اندرونی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ شارٹ کٹ رستے سے جا رہا تھا۔ گاڑی سے نکلتے ہی گرمی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ ہوا چل رہی تھی مگر موسم گرما کا آغاز ہو گیا تھا۔ اب کاوش مسعود کو موسموں کی شدت اور ان کی موجودگی کا یوں احساس نہیں ہوتا تھا

جیسے پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ اب وہ اپنے سینٹرلی ایئر کنڈیشن بنگلے سے نکل کر اپنی ایئر کنڈیشنڈ کار میں سفر کرتا۔ آفس پہنچتا تو یہاں بھی ٹھنڈا یخ کمرہ اس کی پذیرائی کو موجود ہوتا۔

آج کھلی فضا میں تیز تیز قدموں سے گھر کی سمت جاتے ہوئے وہ ذرا سی دیر میں ہی پسینے میں نہا گیا۔ پہلے تو اس نے ٹائی اتار کر کوٹ کی جیب میں ڈالی پھر کوٹ بھی اتار کر کندھے پر ڈال لیا۔

''واہ کاوش مسعود صاحب! آج تو آپ کو تیس سال پہلے کا دور یاد آرہا ہے جب اسی طرح سڑکیں ناپا کرتے تھے۔''

دل ہی دل میں اس استہزائیہ انداز میں اس نے سوچا۔

مگر گزرتے وقت نے کتنا کچھ بدل ڈالا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو چلا تھا۔ شہر میں سبزہ پہلے ہی کم تھا اب تو بالکل ناپید ہو گیا تھا۔ درخت کٹتے رہے اور ان پر بسیرا کرنے والے پرندے بھی اپنے مسکن کی بربادی پر خاموشی سے یہاں سے چلے گئے۔ جانے کہاں؟ شہر میں جا بجا کنکریٹ کے بدنما اور بدصورت پہاڑ سے کھڑے تھے جنہیں مختلف نام دے کر ان میں آبادی کو بسایا اور کھپایا گیا تھا۔

آبادی مسلسل اور بے ہنگم انداز میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وسائل کی کمیابی اور مسائل کی فراوانی کا آغاز کب سے ہو چکا تھا۔'' جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر تھمے گا'' کاوش کی سنجیدگی افسوس میں بدل گئی۔

سوچتے سوچتے اور چلتے چلتے وہ اپنے بنگلے کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔

چوکیدار نے اسے پہلے غور اور پھر حیرت سے دیکھا

''صاحب؟''

''خان! گیٹ کھولو۔'' کاوش مسعود واقعی بہت تھک گیا تھا۔ پچھلے آدھ گھنٹے سے وہ مسلسل پیدل چل رہا تھا۔ بہت سالوں سے پیدل چلنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ اندر پہنچا تو اس کی توقع کے عین مطابق اس کا انتظار ہو رہا تھا۔

''بس پندرہ منٹ اور!'' کاوش کہتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں گھس گیا۔ غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے میں اس نے صرف پندرہ منٹ ہی لگائے تھے۔ خاکستری رنگ کا ڈیزائنر قمیص شلوار پہن کر وہ لاؤنج میں آیا۔

''آئی ایم سوری جان! پہلے آفس میٹنگ پھر ٹریفک جام۔''

اس نے اپنے اکلوتے اور انتہائی لاڈلے بیٹے کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے۔ جواب تقریباً اس کے ہی برابر آ گیا تھا۔ آج بیٹے کا جنم دن تھا۔ ہر سال ہی وہ اس دن کو بہت یادگار طریقے سے مناتا تھا۔ آج کا دن کچھ اس لیے بھی شاندار اور یادگار طریقے سے منایا جا رہا تھا۔ کہ آج اس کا اولیول کا رزلٹ آیا تھا۔ اے پلس کے ساتھ کامیاب ہوا تھا۔

''بہت انتظار کرواتے ہیں بابا آپ!'' بیٹے نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

تم نے بھی تو دنیا میں آنے کے لیے بہت انتظار کروایا ہمیں۔'' کاوش مسعود نے ایک قہقہہ لگایا۔

''تو اس کا ہی بدلہ رہے ہیں؟'' بیٹا حاضر جواب تھا۔

''ہاہاہا!'' کاوش بہت خوش تھا۔ پیدل گھر آنے کی تھکن اور کلفت سب فراموش کر چکا تھا۔

''آپ ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئے؟'' گل اندام نے اچنبھے سے سوال کیا۔

''نہیں۔''

''پھر؟''

گاڑی ٹریفک جام میں شاید اب تک پھنسی ہوئی ہے۔ میں پیدل چلا آیا۔''

''کہاں سے؟'' بیٹے نے تعجب سے باپ کو دیکھا۔ جان چھڑکنے والا اس کا حیرت انگیز اور شاندار باپ۔

''سپر مارکیٹ کے پاس سے۔''

"وہ تو بہت دور ہے۔" گل اندام نے بے ساختہ اسے دیکھا۔

"جو دل کے قریب ہوں، ان کے لیے دور دراز کے فاصلے اہمیت نہیں رکھتے۔" کاوش نے بھی اسی بے ساختگی کا مظاہرہ کیا۔

"ویسے بھی اگر میں پیدل نہ آتا تو تم دونوں اب تک میرا انتظار کر رہے ہوتے۔"

کاوش نے اپنی بے حد خوبصورت بیوی کو محبت سے دیکھا، شادی کے برسوں بعد بھی اس کی خوبصورتی، دل کشی اور نزاکت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ یا پھر کاوش کی نظریں اب تک وہی تھیں۔ محبت کے اولین دنوں والی۔

"کیک کاٹیں؟" کاوش نے جملہ حاضرین کو مخاطب کیا۔

بیٹے نے چھری ہاتھ میں پکڑی اور کیک پہ لگی موم بتی بجھانے کے لیے جھکا پھر یک دم سیدھا ہوا۔

"بابا!" اس نے کاوش کو مخاطب کیا۔ "آپ تھک گئے ہوں گے؟" اس کی آنکھوں میں بڑی چمک دار لو تھی۔ محبت فخر، مان سب ہی کچھ تھا اس میں۔

"او یار! تھکن کیسی، جب اپنے پیاروں کے چہرے سامنے ہوں تو ساری تھکن اڑن چھو ہو جاتی ہے۔ چڑیاں تو آنگن سے اڑ گئیں۔ اب تم دونوں ہی سرمایۂ حیات بچے ہو میرے پاس"۔ شگفتگی سے آغاز کرتے ہوئے کاوش آخر میں سنجیدہ ہو گیا۔

"دن میں فون آیا تھا دونوں کا مبارک دینے کے لیے۔"

"میرے پاس بھی آیا تھا۔" کاوش نے آنکھوں میں آئی نمی کو اپنے اندر اتارا۔

دو سال پہلے گل افشاں اور چھ ماہ پہلے گل مہر بیاہ کر پردیس چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

سالگرہ کا تحفہ اس بار واقعی یادگار اور شاندار تھا۔ ایک ماہ کا تفریحی دورہ بیوی اور بیٹے کے ساتھ۔ بیٹا بہت خوش تھا۔ وگرنہ وہ آئے دن باپ سے یہی شکایت کرتا تھا کہ اسے اپنے باپ سے اتنا اور ایسا وقت نہیں ملتا جیسے عموماً وہ دوسرے بچوں کو دیکھتا تھا۔ کاوش، اس کی ہر فرمائش پوری اور ہر شکایت دور کرنے کے جتن کرتا ہی رہتا تھا۔ یہ تفریحی دورہ بھی بیٹے کا گلہ دور کرنے کی ایک کوشش تھی۔

شمالی علاقہ جات کا حسن و جمال، کاوش تو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بیوی کو بھی دکھا چکا تھا۔ بیٹا بھی مری، نتھیا گلی، گھوڑا گلی اور آس پاس کے علاقے گھوم چکا تھا مگر کاغان، ناران، سوات، وادیٔ ہنزہ اور چترال کا دل فریب حسن اس نے اب دیکھا تھا۔ وہ تو پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹے نے ہائیکنگ بھی کی اور کیمپنگ بھی' برف ساری پگھل چکی تھی اور بہار کا موسم اتنی شدت کے ساتھ جوبن پر آیا تھا۔ کہ آنکھیں بے تحاشا رنگوں اور بے پناہ حسن کو دیکھ دیکھ خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔

"ایسے درخت، ایسی پھول، ایسے فضا اور ایسی ہوا، ہمارے شہر میں کیوں نہیں۔ میرا جی چاہ رہا ہے ان سب کو وہاں لے جاؤں" بیٹا باقاعدہ مچل ہی اٹھا، کاوش ہنس پڑا۔

"یہ درختوں، جھاڑیوں، پھولوں اور سبزے کا جنگل ہے۔ ہمارا شہر انسانوں کا جنگل ہے۔ تم وہاں سے یہاں آکر بسیرا کر سکتے ہو مگر خبردار' ان چہکتے پرندوں، شاداب درختوں، نرم و نازک پھولوں اور مہکتی ہوئی تر و تازہ ہوا کو، وہاں نہ لے جانا، بڑے شہروں کی مسموم فضاء اور مصروف زندگی کو وہاں کے سخت جان باشندے ہی جھیل سکتے ہیں' یہاں کی نازک فطرت وہاں گئی تو پل بھر میں مرجھا جائے گی۔ دیکھو کتنا شفاف اور صحت افزا پانی ہے اس چشمے کا' یہ ایک گلاس پانی لے کر شہر کے کسی مصروف سگنل پر کھڑے ہو جاؤ' ساری شفافیت اور افادیت ایسے غائب ہو جائے گی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

کاوش نے اپنی تقریر کے اختتام پر بیٹے کے ساتھ مل کر قہقہہ لگایا۔ ویسے وہ ایک بردبار، کسی حد

تک سنجیدہ اور متین قسم کا مصنف اور انسان کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا مگر بیٹے کے ساتھ، وہ بھی اپنی نوعمری کے دور میں پہنچ جاتا تھا۔ کھلنڈرا اور شوخ ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہنستا، کھیلتا بولتا اور قہقہے لگاتا۔

پہاڑوں کے دامن میں بچے سبزے پہ لوٹ پوٹ ہوتے وہ دونوں سمندر کی طرح پرجوش اور گرم جوش لگ رہے تھے۔ اور دونوں کے ساتھ ساتھ مگر پھر بھی کچھ الگ سی محسوس ہوتی گل اندام ہمیشہ کی طرح سبک رو، دھیمی، خاموش سی ندی کی مانند تھی۔

قدرت کی صناعی اور فطرت کی کاریگری سے وہ بھی محظوظ ہو رہی تھی مگر وہی اپنے خاموش، دھیمے انداز میں، اسے پرندوں کا شوق تھا۔ یہاں بھی کسی ڈال، کسی پات پر کوئی رنگ برنگا پنچھی کوئی نت نئے رنگوں اور سریلی آواز کا پنچھی، اسے نظر آ جاتا تو حیرت اور دلچسپی آنکھوں میں مجسم کر کے اسے دیکھتی رہتی۔

ایک ماہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ دو امنڈتے، بپھرتے، متلاطم، پرجوش سمندر اور ایک دھیرج دھیرج سبج سبج پرسکون سی بہتی ندی، تینوں گھر لوٹ آئے۔

☆☆☆

ملک خداداد میں سیاست کا ہنگامہ زار ہمیشہ بپا ہی رہتا ہے۔ سیاست کا ہے کو تھی بس سرکش موجوں کا ایک سمندر تھا۔ لہر لہر بے چینی، اضطراب، بے قراری اور بے اعتباری، بھٹی لڑکی نے وزیراعظم بننے کے بعد پارٹی کے سب سے قابل اعتبار فرد کو منصب صدارت پر فائز کیا۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پھر یوں ہوا کہ

جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

قابل اعتماد صدر اور اپنی ہی پارٹی کے سینئر رکن نے کرپشن کے الزام میں حکومت برطرف کر دی۔ بی بی کے بعد اب مسٹر شریف کی باری تھی۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کی دفعہ میں ٹیکنوکریٹ خان صاحب صدر تھے۔ انہوں نے سابقہ روایت کو دہراتے ہوئے کرپشن کا الزام اور حکومت برطرف، دو پارٹیوں کے درمیان اقتدار کی میوزیکل چیئر ہو رہی تھی۔

بی بی، مسٹر شریف، پھر بی بی، جالب دیوانہ اس بار خاموش تھا۔ آنکھیں جو ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

یہ دنیا ہے، یہ زندگی ہے، یہاں جوانیاں بھی خودکو دہراتی ہیں اور کہانیاں بھی۔

شہر کے ایک مہنگے اور معروف کالج میں تیسرے سال کا یہ طالب علم بہت طرح دار اور بانکا نوجوان ہے۔ ملنے والے اور جاننے والے اسے ہو بہو اپنے باپ کی گزری جوانی کی تصویر کہتے ہیں۔ وہی لانبا قد کہ بات کرو تو سر اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھو، کسرت کر کے جسم کو اور بھی پرکشش اور سانچے میں ڈھلا بنا لیا تھا۔ چہرے کے خدوخال میں جاذبیت بھی تھی اور سحر بھی، رنگ ڈھنگ، چال ڈھال، بدن بولی ہر انداز سے، ہر اطوار سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ شاعر نے کبھی وقت کو للکارا تھا

اچھا میرا خواب جوانی ذرا دہرائے تو
وقت تو کہیں مگر قدرت اکثر اس للکار کا جواب اپنے انداز سے دیتی ہے۔ کبھی بیٹی اپنی ماں کی جوانی دہراتی ہے اور کہیں باپ کی جوانی ہیر پھیر کے اس کے بیٹے پر آ جاتی ہے۔

وہ پڑھائی میں بہترین تھا۔ اسپورٹس کا شوقین تھا۔ کالج میں ہر دل عزیز تھا۔ اور بالکل کاوش مسعود کی طرح حسن پرست اور عشق پیشہ، عاشق مزاج فطرت اپنی محبت کے حصول کے لیے ایسا ہی بے چین اور مضطرب جیسے مچھلی بن جل تڑپتی ہے۔ ایک سال پہلے محبت ہوئی تھی اسے۔

تانیہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنا کہ کسی مصور کا تصور ہوتا ہے۔ خواب ہوتا ہے وہ حسن، ادا اور ذہانت کا ملاپ تھی، تعبیر مسعود اگر اس پر دل ہارا تو

کوئی عجب بات نہیں تھی۔ اس کے پیچھے تو کالج کے آدھے سے زیادہ لڑکے اصلی یا مصنوعی آہیں بھرتے تھے۔ اصل بات تو یہ تھی، وہ کسے شرف قبولیت بخشتی ہے۔ اس کی نظر کرم فقط چند ہی ساتھیوں پر تھی۔

ان گنے چنے دوستوں میں تعبیر مسعود اور افنان حیدر سرفہرست تھے۔ تینوں کی ایک تکون تھی جو پورے کالج میں مشہور تھی اور اس تکون سے پہلے جو شہرت تھی وہ افنان حیدر اور تعبیر مسعود کی دوستی اور جوڑی کی تھی۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ نرسری سے کلاس فیلو، جیسے ابتدائی جماعتوں میں مضمون لکھا جاتا ہے۔ ''مائی بیسٹ فرینڈ'' پر تعبیر مسعود ہمیشہ لکھتا تھا۔

''افنان حیدر میرا بہترین دوست ہے۔ وہ میرا پڑوسی اور ہم جماعت ہے۔ ہم روزانہ اکٹھے پڑھتے ہیں اور ایک ساتھ کھیلتے ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔'' اس میں ایک ایک لفظ سچ تھا۔ پرائمری اسکول، ہائی اسکول، پھر کالج، دونوں کی دوستی میں کوئی تغیر آیا نہ تبدیلی، وقت کے ساتھ ساتھ اور بڑے ہو جانے پر رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ یہ جوڑی اب تکون بن گئی تھی۔ تانیہ اس تکون کا سب سے اہم اور پیارا نقطہ تھی۔ دونوں کے لیے اہم تھی، دونوں کو بہت پیاری تھی۔ تعبیر مسعود اس کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا۔ اچھی تو افنان کو بھی لگتی تھی مگر دوست اور دوستی کے احترام میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔

تانیہ شوخ بھی تھی اور پراعتماد بھی۔ تعبیر کے انداز بھی سمجھتی تھی اور بولتی نگاہیں بھی۔ تعبیر نے کھلم کھلا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

''مرنے لگا ہوں تم پر۔ اب مجھے اور مت مارو پلیز۔''

وہ جو تعبیر کے اشاروں کنائیوں کو ہنس کر اڑا دیتی تھی۔ اس بار کچھ کہہ نہ سکی، چپ چاپ اس نے تعبیر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سچائی کو دیکھا۔

''یہ سب بہت جلدی ہے تعبیر! ابھی ہم اسٹوڈنٹ لائف میں ہیں۔ آگے جانے کتنی دنیائیں کتنے لوگ ہیں جو ہمیں دریافت کرنے ہیں، ملنے ہیں۔ ابھی سے خود کو اور مجھے محدود مت کرو۔'' تانیہ کبھی کبھی تھوڑا گھبرا جاتی تھی۔ اس کی بولتی آنکھوں سے، اس کے جنون سے اس کی جذباتیت سے۔

''اچھا ہی ہوا مجھے جلدی محبت ہو گئی تم سے۔ اس سے پہلے کہ تمہیں کسی سے محبت ہو جائے۔''

''کسی سے تو اب بھی ہو سکتی ہے'' تانیہ کی شوخی عود آئی۔

''وہ کسی میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہونا چاہیے۔''

''دھمکی دے رہے ہو؟''

''محبت کو دھمکایا نہیں جا سکتا۔ اس سے صرف درخواست کی جاتی ہے۔ نرمی اور عاجزی کے ساتھ، جو میں تم سے کر رہا ہوں۔''

تعبیر کا لب و لہجہ دل چھو لینے والا تھا۔ مگر تانیہ پھر بھی پتا نہیں کیوں......

دراصل وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ تعبیر اس سے محبت کرتا تھا دیوانوں کی طرح، پاگلوں کی طرح، کبھی ایسی محبت کافی ہو جاتی ہے سامنے والے کو محبت پر مجبور کرنے کے لیے اور کبھی کبھی، کافی نہیں بھی ہوتی۔ تانیہ الجھی ہوئی تھی۔ اپنی الجھن تعبیر کو نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ نہیں سمجھتا۔ تانیہ جانتی تھی اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی الجھن کو سلجھانے والا، اسے سمجھنے والا افنان حیدر کے سوا اور کوئی نہیں۔ اپنی الجھن اس نے افنان کو بتا ہی دی۔

''آخر مجھے یہ کیوں نہیں لگتا کہ میں تعبیر سے پیار کرنے لگی ہوں؟''

''اس لیے کہ تم اس سے پیار نہیں کرتیں۔'' افنان نے سوچ سمجھ کر جواب دیا تھا۔

''مگر کیوں؟ جیسے وہ مجھے چاہتا ہے ایسے اگر کوئی کسی کو چاہے تو؟''......

''بے وقوف لڑکی! محبت دوسرے کے دل کی مرضی سے نہیں، اپنے دل کی مرضی سے ہوتی ہے۔'' افنان نے بڑا مدبر اور دانش ور بن کر اسے

سمجھایا تھا۔ تانیہ کو بات سمجھ آ گئی تھی۔ محبت اپنے دل کی مرضی سے ہوتی ہے۔

''تو میری مرضی کیا ہے؟ میری خوشی کیا ہے؟''

وہ سوچتی رہی اور پھر بہت جلد اسے اس سوال کا جواب مل گیا اس نے وقت ضائع کیے بغیر تعبیر کو بتادیا۔

''تعبیر! ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن سکتے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ ہونا ناممکن ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ایک بالکل غیر متوقع بات سن کر تعبیر بھونچکا رہ گیا۔

''مطلب یہ کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی۔''

تانیہ کی صاف گوئی نے اسے جیسے دہکتے ہوئے الاؤ میں گرادیا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اس کی حالت ایسے لاڈلے اور بگڑے بچے کی جیسی ہوگئی جس کے ہاتھ سے اس کا پسندیدہ کھلونا کھیلتے کھیلتے لے لیا گیا ہو یا پھر کوئی ایسا انسان جو بہت ہی خوفناک اور برا خواب دیکھ رہا ہو اور آنکھ کھلنے پر وہی خواب عین بیداری کی حالت میں بھی مجسم اس کے سامنے ہو۔ تعبیر کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

''اب اس ''مگر کیوں'' کا کیا جواب دوں؟''

تانیہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

''تم سوچو تو سہی میرے بارے میں' تمہیں محبت ہوجائے گی مجھ سے۔ یقین کرو میں بالکل بھی برا نہیں ہوں۔ اور میں تو اتنا چاہتا ہوں تمہیں، دنیا کا کوئی فرد تمہیں ایسے نہیں چاہ سکتا' میری طرح۔ تم پلیز میرے بارے میں سوچنا مت چھوڑو، یوں ایک دم سے فیصلہ مت سناؤ میں انتظار کرلوں گا۔ کبھی نہ کبھی تمہیں مجھ سے محبت ہوجائے گی۔ میری محبت منوالے گی خود کو، تم ...... مجھے معلوم ہے' مجھے یقین ہے۔''

تعبیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور یوں جلدی جلدی بول رہا تھا جیسے صحرا میں بھٹکتا ہوا بھوک پیاس کا مارا' لب مرگ مسافر جو دور سے چمکتے ریت کے ذروں کو پانی سمجھ کر جلدی جلدی اور تیزی سے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ وہ بھی ایسی ہی کوشش کررہا تھا۔

''بہت جذباتی ہو تم۔ بہت زیادہ' حد سے زیادہ۔'' تانیہ نے سرہلا کر تعبیر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تعبیر کے لیے ترحم اور افسوس تھا۔

''میں محبت کا مارا ہوں اور بس۔'' تعبیر کرلایا۔

تعبیر پلیز تم خود کو یہیں روک لو۔ ورنہ اپنے لیے زندگی بہت مشکل کرلو گے'' تانیہ کو اس کے جنون سے ڈر لگنے لگا۔ خوف محسوس ہورہا تھا اسے۔

''انسان جب ڈوبنے لگتا ہے نا تو اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا وہ یا تو سمندر کی تہہ میں ڈوب جاتا ہے یا پھر لہریں اسے اوپر اچھال دیتی ہیں۔ میں لہروں کے کرم کا منتظر ہوں۔''

''پتا نہیں کون سے خوابوں، خیالوں کی دنیا میں رہتے ہو تم، شاعری اور کہانیوں کی فلاسفی اصل زندگی میں اپلائی نہیں ہوتی۔ تم سمجھتے کیوں نہیں میں......''

جھنجلائی ہوئی تانیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''بات پوری کرو تانیہ!'' تعبیر کی آنکھیں کسی انہونی کے خوف سے پھٹ سی گئیں۔

''پوری بات یہ ہے کہ میں افنان سے...... میں افنان سے پیار کرتی ہوں۔''

تانیہ نے ایک طویل اور مشکل پل پار کر کے گہری سانس لی۔

تعبیر بغیر کچھ کہے تانیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ــــ اتنی بے یقینی اور حیرانی تھی کہ تانیہ شرمساری ہونے لگی۔

''تعبیر پلیز ایسے ری ایکٹ مت کرو کہ مجھے شرمندگی ہونے لگے۔''

تنگ آ کر اور کچھ شرمندہ سی ہو کر وہ بول ہی پڑی۔

تعبیر چپ چاپ اس کے سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھا تھا جیسے اس کرۂ ارض پر وہ ہی ایک اکیلا، تنہا

انسان بجا ہو۔آنکھوں میں وحشت اور نا امیدی لیے وہ جانے کب تک وہاں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔گفتگو تلخ کلامی کی حدود میں جا پہنچی تھی۔

"تم نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔" تعبیر نے اس پر الزام لگایا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ہاں،وہ مجھے پسند تھی مگر جب مجھے پتا چلا کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔میں پیچھے ہٹ گیا۔" افنان نے صفائی پیش کی۔

تم دوست نہیں،آستین کے سانپ ہو تعبیر کے الزامات ختم نہیں ہو رہے تھے۔اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

"تم بلاوجہ اتنے ہائپر ہو رہے ہو۔دنیا میں لڑکیاں کیا کم ہیں کیا پتا تانیہ سے اچھی کوئی مل جائے۔" افنان اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔کم از کم تعبیر کو تو ایسا ہی لگا،تب ہی وہ غرایا تھا۔

"بچہ سمجھا ہوا ہے کیا مجھے؟ تانیہ میری محبت ہی نہیں ہے،میرا جنون بھی ہے۔میری زندگی ہے۔اس کے بغیر ادھورا ہوں میں سمجھے تم۔"

تعبیر چیخ پڑا تھا۔

"وہ تم سے محبت نہیں کرتی،تم خود کو سنبھالو تعبیر،اپنا تماشا نہ بناؤ۔" افنان کا لہجہ درشت ہو گیا۔

"تماشا تو تو نے بنایا ہے میرا،تو نے اسے ورغلایا ہے۔"تعبیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"میں کیوں ورغلاؤں گا۔ورغلاتا جب،جب وہ تیری طرف مائل ہوتی،وہ مجھے صرف اپنا دوست سمجھتی ہے اور بس۔" افنان کے چہرے کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی سختی آ گئی۔

"یہ دوستی،محبت میں بدل جاتی اگر تجھ جیسا شیطان ہمارے بیچ میں نہیں آتا۔" تعبیر کا لہجہ چیخ رہا تھا۔مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔

"مائنڈ یور لینگویج تعبیر،میں تم دونوں کے درمیان نہیں آیا۔بلکہ تم میرے اور تانیہ کے بیچ زبردستی کھڑے ہو۔" دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔

"افنان! تجھے خدا کا واسطہ ہے یار،اس دوستی کا واسطہ جو ہمارے درمیان ہے۔پلیز یار!" تعبیر یکا یک ہی ڈھے سا گیا تھا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟"

افنان نے گڑبڑاتے ہوئے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو علیحدہ کیا،چند لمحے تعبیر کو دیکھتا رہا۔پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے۔میں،ابھی اسی وقت اس معاملے سے الگ ہوں۔" افنان نے دوستی اور محبت میں دوستی کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

"تم سمجھتیں کیوں نہیں،افنان کو،تم میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔وہ محض مذاق کر رہا تھا تم سے۔" تعبیر اسے سمجھاتے سمجھاتے جھنجلا گیا۔

تعبیر! بند کرو یہ سب،پیچھا چھوڑ دو میرا۔" تانیہ سختی سے بولی۔اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔افنان نے اس سے کہا تھا کہ وہ چوں چرا کیے بغیر تعبیر کی ہاں میں ہاں ملا دے۔

"موم کی گڑیا سمجھا ہوا ہے۔جہاں دل چاہے موڑ دو۔"

تانیہ بھڑک اٹھی۔افنان نے بڑی مشکل سے اس کا غصہ ختم کر کے سمجھانے کی کوشش کی مگر تانیہ سمجھ نہیں رہی تھی یا سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔اسے اب اپنے سامنے کھڑے تعبیر پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔

"رومیو،مجنوں اور فرہاد کے زمانے گزر گئے ہیں تعبیر یہ اکیسویں صدی ہے۔بی پریکٹیکل۔"

"تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا تانیہ! رحم نہیں آتا؟" تعبیر کی سماعتیں کچھ نہیں سن رہی تھیں سوائے اپنے دل کی دھڑکنوں کے وہ تانیہ کی بات سنے بغیر اپنا ہی راگ الاپ رہا تھا۔

"نہیں،مجھے غصہ آتا ہے تم پر۔" تانیہ کا لہجہ ڈو

ٹوک تھا۔

''تانیہ......!'' وہ ششدر رہ گیا۔

''تانیہ......!'' تعبیر نے جیسے کسی اندھی اور اتھاہ پاتال سے اسے پکارا تھا۔

''مجھے بخش دو، خدا کے واسطے۔'' تانیہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اچھا بس آخری بار ایک بات بتا دو، پھر کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔'' تعبیر کی آواز، پاتال میں سے آرہی تھی۔ عجیب سی، ٹوٹی پھوٹی سی بکھری بکھری سی۔

''کہو۔'' تانیہ نے ایک گہری سانس لی۔

(بس آخری بار......)

ابھی نہیں، مگر آنے والے وقت میں کبھی بھی، کون؟ میں یا وہ؟'' ادھورے ادھورے لفظوں ٹوٹے پھوٹے جملوں میں وہ اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔ لہجے میں وحشت تھی، آنکھوں میں دیوانگی۔

''میں یا وہ؟'' اس نے پھر دہرایا۔

''وہ......'' تانیہ نے فیصلہ سنا دیا۔

وہ پنگ پانگ کی گیند نہیں تھی، نہ ہی شٹل کاک جوان دونوں کی مرضی سے حرکت کرتی، اس نے اپنی مرضی کا فیصلہ کیا تھا۔

تعبیر لق و دق صحرا میں لب گور کھڑا تھا۔ اسے تسلی دینے کو آگے کوئی سراب بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

میوزیکل چیئر کا کھیل بھی اب اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ملک کے سارے طالع آزماؤں نے کیلنڈر کا دسواں مہینہ اپنے ایڈونچرز کے لیے موزوں سمجھا تھا۔ بارہ اکتوبر 1999ء کو ایک اور جنرل صاحب مسیحا بن کر (بقول ان کے، حادثاتی طور پر) ملک و قوم کی قسمت میں دخیل ہوئے۔ کاوش مسعود، پچھلی حکومت میں ایک اہم ادبی ادارے کی سربراہی کر رہے تھے۔ غیر ملکی سہ روزہ کانفرنس میں بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی بہت پذیرائی ہوئی، ان کے عہدے سے قطع نظر، ان کی ادبی خدمات اپنی جگہ مسلّم تھیں۔ جہاں ان کے ناقدین بہت تھے، وہاں ان کے حامیوں کا بھی ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔

کانفرنس کا تیسرا اور آخری روز تھا۔ اپنا مقالہ انہوں نے جس سیشن میں پڑھا، وہ پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے، طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی، انتہائی گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے وہ، بے چینی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ ہوٹل کے فون پہ پاکستان سے کال آئی تھی ان کے لیے کال سنتے سنتے وہ ڈھے گئے۔

واپسی کے سفر میں ایک عزیز دوست ہمراہ تھا۔ اسی نے کاوش کو اور باقی معاملات کو سنبھالا، ورنہ وہ تو کسی اور ہی عالم میں تھے، ہوش اور بے ہوشی کے درمیان' اندھیرے اور اجالے کے درمیان، قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے باہر آتے ہوئے بھی وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے، مگر جب گاڑی کا رخ ان کے اپنے علاقے کی طرف ہوا تو وہ چونک پڑے۔

''اسپتال کیوں نہیں چلتے، آپ نے تو کہا تھا وہ اسپتال میں ہے۔'' انہوں نے اپنے برادر نسبتی شاہد بھائی کی طرف دیکھا، جنہوں نے فون پہ انہیں تعبیر کے حادثے کے متعلق بتایا تھا۔ ایئرپورٹ پر وہ انہیں لینے آئے تھے۔ کاوش مسعود کی آواز سے وحشت چھلک رہی تھی۔

''وہ گھر آگیا ہے۔'' انہوں نے بہنوئی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ٹھیک ہے؟'' نہ جانے کیوں ان کا دل اب تک کسی نادیدہ مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔

''اب آرام سے ہے۔'' شاہد بھائی بھی مختصر جواب دے رہے تھے۔

باقی کا سفر خاموشی میں طے ہوا۔ وہ اپنے گھر پہنچے تو گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی ان کی نظر اپنے گھر کے سامنے پڑی تھی اور نادیدہ ہاتھ کی

گرفت ان کے دل پر بہت سخت ہو گئی تھی، اتنی سخت کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔

اپنا دل پکڑتے ہوئے ایک طرف کو جھکنے سے پہلے ان کی دھندلائی ہوئی نظروں نے کار کی کھڑکی سے ایک بار پھر باہر دیکھا، ان کے گھر کے آگے شامیانہ لگا ہوا تھا اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد وہاں جمع تھی۔

☆☆☆

دل کے پہلے دورے سے تو جلدی سنبھل گئے، مگر تعبیر کا یوں جانا، ان کی جان لے گیا تھا۔ گل اندام پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔

شاہد بھائی نے ہی انہیں ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تھا، دھیمے دھیمے لہجے میں وہ بتاتے رہے، بولتے رہے، کاوش مسعود کی سماعت تک ان کی آواز پہنچ رہی تھی، مگر دماغ ان باتوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا، پھر بھی وہ کوشش کرتے رہے، ان باتوں کو سمجھنے کی اور جو ان کی سمجھ میں بات آئی۔ وہ یہ تھی کہ محبت میں ناکامی پر ان کے بیٹے نے خودکشی کر لی تھی، بیٹا ان ہی کی طرح تھا نا، عشق میں مر مٹنے والا، جنونی، جذباتی۔

"لڑکی کیوں نہیں مانی؟ مجھ سے کہتا، مجھے بتاتا تو اس لڑکی کے آگے ہاتھ جوڑ لیتا، اس کے پیر پکڑ لیتا، اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے، اس کی زندگی کے لیے۔" وہ خیالات کے بھنور میں چکراتے رہے، پھر انہیں یاد آیا۔

"ہاں اس کا دوست آیا تو تھا افنان، بہت رو رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک بہت خوب صورت سی لڑکی تھی، اتنی حسین، اتنی پیاری، جتنی کہ گل اندام کی جوانی، شدت گریہ سے اس کی قاتل آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ جو کاوش کو یاد رہ گئی تھیں۔

"قلم اٹھانے کو اب جی نہ چاہتا تھا، نوکری سے بھی استعفیٰ دینے کا سوچ رہے تھے۔ جینے کا کوئی مقصد اب کہاں رہا، زندگی جیسے من من بھر کے قدم ہو گئی تھی، زبردستی گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔

گل اندام نے بہت دنوں بعد انہیں مخاطب کیا تھا۔

"یہ..... میری الماری میں رکھا تھا۔" ایک پرچا اس نے کاوش مسعود کی طرف بڑھایا۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور چہرے پہ عجیب سے تاثرات، پرچا اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کاوش مسعود کا ہاتھ بھی جانے کیوں کانپ سا گیا۔

☆☆☆

تعبیر فقط چند قدم ہی آگے گیا تھا، پھر واپس پلٹ آیا۔ وہ تانیہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر وہ فون پر بات کر رہی تھی، تعبیر کی طرف اس کی پشت تھی، وہ وہیں ٹھہر گیا اور بات ختم کرنے کا انتظار کرنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا افنان! آخر تم کر کیا رہے ہو؟ تعبیر کے سامنے تم اچھے دوست بن گئے، دوستی کی پاس داری کا ناٹک کرنے لگے اور ادھر مجھے اپنی آخری سانس تک چاہنے کا دعوا کر رہے ہو، سچ سچ بتاؤ، جھوٹ کس سے بول رہے ہو، مجھ سے یا تعبیر سے؟"

تعبیر کی اپنے پیچھے موجودگی سے بے خبر تانیہ الجھن بھری آواز میں افنان سے مخاطب تھی، کچھ دیر ٹھہر کر اس نے افنان کی بات سنی، پھر گویا ہوئی۔

"تعبیر اتنا معصوم اور بھولا نہیں ہے کہ تم اسے بے وقوف بناؤ گے اور وہ بن جائے گا اور ویسے بھی مجھے تمہاری یہ ڈرامے بازی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی، تم پہلی فرصت میں تعبیر کے سامنے معاملہ کلیئر کرو، میں نہیں چاہتی، کسی جھوٹی تسلی اور دلاسے کی آس میں رہے، وہ بہت ڈس ہارٹ ہو رہا ہے افنان، سچ میں، بہت ترس آ رہا تھا مجھے۔"

دھڑ...... دھڑ...... دھڑ، تعبیر کے اوپر سے پوری ٹرین گزر رہی تھی۔ وہ مرنے والا تھا، وہ مر رہا تھا، بالآخر وہ مر گیا۔

☆☆☆

آپ دونوں کو بہت بڑا دکھ دینے والا ہوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا، جینا نہیں چاہتا، جس

سے محبت کرتا ہوں، اسے پا نہیں سکتا، جس سے دوستی تھی، اس نے فریب دیا۔
میں نے جس سے محبت کی، اس نے مجھے مار دیا۔

آپ کا پیٹا!

آخری جملہ پڑھ کر کاوش مسعود پر بھی وہی ٹرین دھڑ دھڑ کر کے گزر گئی جو کبھی تعبیر پر گزری تھی۔ حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہوں نے گل اندام کو دیکھا جو اس کے سامنے بیٹھی انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ صدیوں کی اس چپ کو آج بہت سالوں بعد گل اندام نے توڑا تھا۔ کاوش سنتے جا رہے تھے اور زمین میں دھنستے جا رہے تھے۔

☆☆☆

عثمان سے میری نسبت طے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، اس سے پہلے انہیں عثمان بھائی کہتی تھی، اس وقت جب وہ میرے لیے عثمان بھائی تھے اور میں بلا جھجک اور بلا تکلف ان کے سامنے آ بھی جاتی تھی اور بات بھی کر لیتی تھی۔ وہ ایک باصلاحیت لکھاری تھے۔ افسانہ نگاری کا شوق مجھے بھی تھا، چند افسانے لکھ کر انہیں دیے، انہوں نے فرضی نام سے پوسٹ کر دیے، وہ شائع ہو گئے۔
گھر میں امی کے سوا اور کسی کو میرے اس شوق کا علم نہیں تھا۔ ابو اس قسم کے شوق اور مشاغل کو لڑکیوں کے لیے صحیح نہیں سمجھتے تھے، عثمان میری حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ مجھے لکھتے رہنا چاہیے۔
پھر ان کا ایک دوست ہمارے گھر اور زندگیوں میں داخل ہوا۔ ان کا بھائی، دوست اور خالہ کا بیٹا بن کر میرے لیے وہ ان حیثیات میں قابل احترام تھا، مگر جب بھی کبھی ہمارا آمنا سامنا ہوا، مجھے اس کی نظریں کچھ الگ محسوس ہوئیں، ایسی نگاہیں جیسے اس نے فراموش کر دیا ہو کہ میری نسبت کہیں طے ہے، مگر یہ بات میں نہیں بھولی تھی۔

اس کی آمد سے کچھ عرصہ قبل میں نے ایک افسانہ لکھا تھا۔ عثمان کو اس کے مرکزی کردار اتنے پسند آئے کہ انہوں نے ان ہی کرداروں اور ناموں کو لے کر اپنے نئے ناول کا آغاز کیا، پھر وہ بیمار ہو گئے، مگر اس عالم میں بھی وہ اپنے ناول پہ کام کرتے رہے، جیسے جیسے ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ اور بھی زیادہ تن دہی اور جنون کے ساتھ اپنا ناول مکمل کر رہے تھے۔ مری سینی ٹوریم جانے سے ایک دن پہلے شاہد بھائی میرے پاس ایک لفافہ لائے جس میں ایک پرچا تھا، اس میں لکھا تھا۔
"بہت معذرت خواہ ہوں، مگر زندگی کا آگے کا سفر آپ کے ساتھ طے نہیں کر سکتی۔ خود انکار کر دیں گے تو مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"
میں یہ پڑھ کر حیران رہ گئی، کچھ سمجھ میں نہ آیا، پھر نیچے مزید پڑھا، جس پر عثمان نے لکھا تھا۔
"یقین نہیں آتا کہ یہ سب تم نے لکھا ہے، کیا واقعی؟"
میں نے جواب میں فقط ایک لفظ لکھ کر انہیں بھجوا دیا۔ "نہیں۔"
لکھنے والے نے میرے نام سے جو لکھا۔ وہ یقیناً لکھائی بدل کر لکھا، مگر وہ میری لکھائی نہ تھی۔ عثمان میرا طرز تحریر پہچانتے تھے، اسی لیے انہیں یقین نہیں ہوا اور اس لیے بھی نہیں ہوا کہ جتنا وہ مجھے جانتے اور پہچانتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ میں اس طرح کی کوئی بات ان سے نہیں کہہ سکتی۔
میرا جواب پڑھ کر انہوں نے شاہد بھائی کے ذریعے ایک پیغام اور مجھے بھجوایا، آخری پیغام انہوں نے لکھا تھا۔
"تم اتنی دلکش ہو کہ تمہارے لیے کوئی انسان جرم کرنے کو، غلطی کرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ جذبہ محبت بڑی غارت گر شے ہے۔ میں نے اپنے دوست کو معاف کر دیا ہے، تم بھی کر دینا۔"
اگلے روز وہ اس شہر سے چلے گئے اور کچھ روز بعد دنیا سے بھی۔ میں نے ان کی آخری خواہش کا

احترام کرتے ہوئے ان کے دوست کو معاف کر دیا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ انہوں نے اپنے دوست کو دل سے معاف کر دیا تھا۔ بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ جتائے وہ دل کے اتنے ہی پیارے اور اعلا ظرف کے مالک تھے۔"

گل اندام نے ایک گہری سانس لی اور کاوش مسعود کو شرمندگی اور ندامت کے پاتال میں گرتے ہوئے یاد آ رہا تھا کہ عثان نے جانے سے پہلے آخری بار اس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"میں نے جس سے محبت کی یار! اسی نے مجھے مار دیا۔" کاوش نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایسا کیا لکھ دیا گل اندام نے؟"

"نہیں، اس نے تو کچھ نہیں لکھا، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔" عثان نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

گل اندام مزید آگے بول رہی تھی، سامنے دیکھتے ہوئے وہ جیسے سحر زدگی کے عالم میں تھی۔

"عثان کے انتقال کے بعد زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی، نئے رستے پہ چلنے کے لیے میں خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی، معاف کرنے کے باوجود بھی، اس انسان کے ساتھ آگے زندگی کا سفر، دل کی طلب لگ رہا تھا نہ خواہش، مگر میں نے خالہ جان کے بارے میں سوچا اور یہ بھی کہ انکار کی وجہ کیا بتاتی، سچ بولتی تو ایک نیا پنڈورا بکس کھل جاتا اور خالہ جان کا کیا ہوتا، ایک بیٹے سے وہ محروم ہو گئی تھیں، میرے انکار پر دوسرے سے بھی محروم ہو جاتیں...... پھر......"

گل اندام کی آنکھوں میں کرب کی لہریں تھیں۔

"پھر...... نئے سفر کے آغاز پہ شریک سفر نے ایک تحفہ مجھے دیا، جسے سرسری سا دیکھتے ہوئے بھی میں ٹھٹک گئی تھی، بری طرح چونک گئی تھی۔ جانے پہچانے نام، مانوس کردار، سنے ہوئے جملے کہ کبھی کبھی عثان اپنے ناولوں کے بعض جملے اور ٹکڑے جو انہیں پسند آتے تھے، مجھے بھی سناتے تھے۔

میں نے شریک سفر کو بے یقینی سے دیکھا۔ "یہ آپ نے لکھا ہے؟"

شریک سفر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "تمہیں کوئی شک ہے؟"

"مجھے شک نہیں یقین تھا۔ میں نے اس کے وجود پہ اس کی آنکھوں میں لکھا ہوا جھوٹ پڑھ لیا تھا۔ میں خاموش ہو گئی، پھر میرا بھی دل ہی نہ چاہا بولنے کو۔"

☆☆☆

گل اندام کب کی اٹھ کر جا چکی تھی۔ کاوش پر چابک اب تک برس رہے تھے، پہلے گل اندام کے لفظوں کے تھے، اب...... اب جانے کس بات کے تھے، آگہی کے، ادراک کے، پشیمانی کے، احساس جرم کے، وہ چابکوں کی متواتر مار سے ادھ موئے سے ہوئے جا رہے تھے۔ انتہائی تکلیف ہو رہی تھی۔ شدید کرب میں مبتلا تھے۔

سارا ماضی نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ کتنا آسان سمجھا تھا اس وقت، وہ سب کچھ، جس کے بوجھ تلے آج روح تک دبی ہوئی تھی۔

درد کی شدت سے ان کی چیخیں نکلنے کو تھیں، کتنا آسان سمجھا تھا اس وقت دل کے کہنے پر چلنا، نفس کے پیچھے پیچھے ہر قدم رکھنا چاہیے، وہ قدم کسی کے دل پہ، کسی کی زندگی پہ ہی کیوں نہ پڑیں، گل اندام کو پانے کے لیے وہ ہر حد سے گزر گیا، محبت کے نام پر اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے میں ہر منفی جذبہ دل میں سرائیت کر گیا تھا۔

جلن، حسد، بغض، کینہ، عناد، سب نے مل کر اسے سازشی بنا دیا تھا۔

وہ پبلشر کے پاس گیا تھا، جواب مانگنے، پبلشر نے عثان کا ناول منتخب کر لیا تھا، چھاپنے کے لیے۔

کاوش کے اپنے ناول کے لیے اس نے کہا۔ "میاں! دم نہیں ہے اس میں، کچھ اور لکھو۔"

کاوش جلا بھنا وہاں سے واپس آیا تھا، بستر مرگ پہ پڑے دوست کی آنکھوں میں امید کے آخری چراغ بھی اس نے بجھا دیے۔

اس کا دل اتنا کٹھور اتنا سخت اور اتنا بے رحم ہو گیا تھا کہ اس نے ایک مرتے ہوئے شخص سے وہ خوشی بھی چھین لی جو وہ بڑی آسانی اور آرام سے اسے دے سکتا تھا، مگر کاوش نے اس سے کہا کہ پبلشر نے انکار کر دیا ہے۔

عثمان کی مایوسی بھری آنکھیں اور ایک بے بس سی آہ بڑی دردناک تھی۔ تب اس نے کاوش سے کہا تھا۔

''میں نے جس سے محبت کی یار! اس نے مجھے مار دیا۔''

کاوش کو اب ادراک ہو رہا تھا کہ عثمان کا یہ فقرہ اپنی محبت کے لیے نہیں، بلکہ دوست کے لیے تھا۔ گل اندام کے جواب نے اسے دوست کی حقیقت سے روشناس کرا دیا تھا اور کیا معلوم کہ وہ دوست کا دوسرا جھوٹ بھی سمجھ گیا ہو۔

ہو سکتا ہے اسے پتا چل گیا ہو، کاوش کے چہرے پہ لکھے جھوٹ کو وہ جان گیا ہو۔ کیا خبر؟ کیا پتا؟ اس پر برستے چابکوں میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک ہی چھت تلے دو اجنبی رہ رہے تھے۔ خاموش طبع گل اندام جیسے بالکل ہی گونگی ہو چکی تھی۔ کاوش مسعود ضمیر کے کوڑے کھا کھا کر بالکل ہی ادھ موئے ہو رہے تھے۔

''خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو، میں اپنی ہی لگائی آگ میں جل رہا ہوں، بہت اذیت ہے، بہت تکلیف۔'' کاوش نے ایک روز بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''میں نے معاف کر دیا تھا۔'' گل اندام نے ان پہ ایک نظر ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

''بس کبھی محبت نہیں کر سکی۔'' لہجہ سادہ تھا، مگر جملے کی معنویت اور کاٹ نے کاوش کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جیسے کسی نے آرا چلا کر انہیں چیر ڈالا ہو۔ شدید اذیت نے ان کے چہرے کے نقوش مسخ کر دیے۔

''کیا کبھی محبت نہیں ہوئی؟ ان گزرے چونتیس سالوں میں کتنے سارے مہینے تھے، سینکڑوں ہفتے، ہزاروں دن اور ہزاروں گھنٹے، منٹ، سیکنڈز کیا کبھی ایک لمحے کے لیے بھی دل میں محبت محسوس نہیں ہوئی؟''

کاوش مسعود اس سے سوال کرنا چاہ رہے تھے، مگر انہیں ڈر لگنے لگا، وہ خاموش ہو گئے۔ ساری عمر وہ جس خزانے پہ فخر کرتے رہے۔ جس کی موجودگی کے احساس سے شادمان اور مسرور ہوتے رہے، مغرور ہوتے رہے۔

آج انکشاف ہوا کہ وہ خزانے کی جگہ خالی تھی۔

کچھ بھی نہیں تھا وہاں' قیمتی خزانے کی جگہ مٹی بھی نہیں تھی کہ مٹی بھی کچھ نہ کچھ حیثیت، وقعت اور اہمیت رکھتی ہے، وہاں تو بالکل خالی پن تھا، اجاڑ، ویرانہ، وحشت، وہی اجاڑ پن، ویرانی اور خالی پن کاوش مسعود کے اندر سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی مصروف زندگی اور وسیع حلقہ احباب سے پہلے ہی کنارہ کش ہو چلے تھے۔

ملازمت چھوڑی تو وہ تمام مفاد پرست بھی ساتھ چھوڑ گئے جو اپنے کاموں اور فائدوں کے لیے ان کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے، چند دوست تھے اور گل اندام کے بہن، بھائی سب اپنی اپنی مصروفیات میں گھرے ہوئے تھے، کبھی کبھار، کوئی بھولا بھٹکا چلا آتا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا جاتا۔

کاوش اس مچھلی گھر کے سامنے بیٹھے تھے۔ جو گل اندام نے بڑے شوق سے بنوایا تھا کبھی رنگ برنگی خوب صورت مچھلیاں صاف شفاف پانی میں ادھر سے ادھر تیر رہی تھیں، کاوش انہیں بہت غور اور محبت سے دیکھ رہے تھے، ان مچھلیوں کو گل اندام کی

پیار بھری نگاہیں دیکھتی تھیں۔ کاوش نے خود پہ ترس کھاتے ہوئے سوچا، مگر اگلے ہی لمحے خود اذیتی نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"کیا تم اسی قابل نہ تھے؟" اندر سے کوئی کہہ رہا تھا۔

کاوش نے اذیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں میں ایک شبیہہ لہرائی، انہوں نے آنکھیں فوراً کھول دیں، سامنے ہی کارنس پر وہ تصویر رکھی تھی، جس کی شبیہہ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تھی، کاوش نے اٹھ کر وہ تصویر اٹھالی اور اسے گود میں رکھ کر پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"میرا بیٹا! میرا پیارا بیٹا۔" اس نے سرگوشی کی اور تصویر پہ اپنے ہونٹ رکھ دیے، ان کے آنسو تصویر پہ گرنے لگے۔

"میرے جیسا بدقسمت باپ کوئی ہوگا؟ کیسی کڑی سزا ملی ہے مجھے میرے اعمال کی۔"

"اور مجھے کس بات کی سزا ملی ہے۔" کتنے عرصے بعد گل اندام کی کرب میں ڈوبی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ کاوش نے چونک کر اپنا جھکا ہوا سر تیزی سے اوپر اٹھایا۔ پتا نہیں وہ کب وہاں آکر کھڑی ہوئی تھی۔

"دن رات پاگلوں کی طرح یہ ہی سوچتی رہتی ہوں، کوئی جواب نہیں ملتا۔" ضبط کی تصویر بنی وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور اس کے شکوے کا جواب تو کاوش کے پاس بھی نہیں تھا، مجرمانہ خاموشی کے ساتھ ان کا سر پھر جھک گیا۔

گل اندام کا باغ باغیچہ، پھلواری سب اجڑنے کو تھا۔ پہلے وہ خود بھی مالی کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھی۔ تعبیر کے بعد سے اس نے ان پھولوں کو دیکھنا بھی بند کردیا تھا، جن کے ساتھ بیٹھی گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ مالی نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسرا مالی رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ گل اندام کے پالے ہوئے پرندے بھی اسے پکار پکار کر شاید تھک گئے تھے۔ ان کی چہکار بھی اب کم سنائی دیتی تھی۔

گھر کے ملازمین میں بہت پرانے دو میاں، بیوی تھے جو باقی بچے تھے۔ عبدالرشید ڈرائیوری کے ساتھ ساتھ اندر باہر کے کئی کام نمٹا دیتا تھا۔ ویسے بھی کافی عرصہ ہوگیا تھا ڈرائیور کی ڈیوٹی تو وہ اب کر ہی نہیں رہا تھا، مکین کہیں جاتے ہی نہیں تھے جو گاڑی چلانے کی نوبت آئے۔ اس کی بیوی نے باورچی خانے اور گھر کی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ دونوں میاں، بیوی محنتی اور مخلص تھے۔ طویل عرصے سے جن مالکوں کا نمک کھا رہے تھے، اب اپنے اخلاص اور وفاداری سے وہ اس نمک کو حلال کر رہے تھے۔

کاوش ایک تاسف کے ساتھ ان درختوں، پودوں، پھولوں کو دیکھ رہے تھے جو کم توجہ اور خزاں کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ درختوں سے جھڑے زرد سوکھے ہوئے پتوں کا ڈھیر، عبدالرشید ایک جگہ جمع کر کے ایک تھیلے میں بھر رہا تھا۔ پودے سر نیہواڑے کھڑے تھے۔ پرندے اپنے اپنے پنجروں میں سہمے ہوئے سے خاموش تھے، جیسے اپنی مالکن کے غم میں وہ بھی برابر کے شریک ہوں، پورے ماحول پہ ایک بدرنگی، بے رونقی اور اداسی چھائی ہوئی تھی، وہ یوں ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے، تب ہی سوکھے پتے سمیٹ کر عبدالرشید فارغ ہوگیا تھا، کاوش سے مخاطب ہوا۔

"صاحب! ایک بات کہنا تھی آپ سے۔"

"کہو۔" کاوش نیم توجہی سے اس کی بات سننے لگے، مگر سنتے سنتے ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

"گاڑی نکالو۔" وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر گل اندام کے پاس گئے۔ "ڈاکٹر کے پاس چلیں۔"

کاوش نے نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ باہر لے آئے۔ گل اندام کسی بے جان گڑیا کی طرح ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے چلنے کو کہا، چل دی، گاڑی میں بٹھایا، بیٹھ گئی، کاوش بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اسپتال جاتے ہوئے ان کی

سماعت میں اب بھی رشید کی آواز گونج رہی تھی۔

''فریدہ بتا رہی تھی کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، آج بھی چکرا کر اپنے کمرے میں گر پڑیں۔ اس نے کہا بھی کہ آپ کو بتا دیں، ڈاکٹر کے پاس لے چلیں تو بیگم صاحبہ نے منع کر دیا، فریدہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو بتا دوں۔ آپ اسپتال لے جائیں۔''

کاوش ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر نے جو ٹیسٹ لکھے وہ کروا کر لے گئے۔

رپورٹس پڑھ کر ڈاکٹر نے جو تشخیص بتائی اس نے کاوش مسعود پر آسمان گرا دیا۔ گل اندام کے اندر جو روگ تھا۔ پک پک کر ناسور بن گیا اور اس ناسور نے کینسر کی شکل اختیار کر لی تھی۔

''ڈاکٹر! کسی بھی طرح میری بیوی کو بچا لیں۔''

کاوش مسعود گڑگڑائے بالکل بچوں کی طرح۔

''ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے، شفا بھی، زندگی بھی، بیماری بھی، موت بھی، ہم علاج میں اپنی پوری کوشش کریں گے، آپ دعا کیجیے۔''

ڈاکٹر نے سنجیدگی اور ترحم سے اس عمر رسیدہ مشہور ادیب کو دیکھا جو پہلے اپنے بیٹے سے اور اب شاید اپنی شریک حیات سے محروم ہونے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی تجربہ کار نگاہوں نے گل اندام کو دیکھ کر اور علامات جان کر اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے کون سی بیماری ہے۔ ٹیسٹ رپورٹس نے اس خدشے کی تصدیق کر دی تھی۔ ڈاکٹر کی اپنے پیشے میں مہارت اور تجربہ بتاتا تھا کہ اب سال بھر سے زیادہ کی مہلت نہیں ہے۔

دونوں بیٹیوں کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ دوڑی دوڑی چلی آئیں۔ ''امی پلیز! باہر چلیں، وہاں علاج کی سہولتیں اور ٹیکنالوجی یہاں سے زیادہ ہے۔ ان شاءاللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' بیٹیاں اصرار کرنے لگیں۔

''ملک الموت کا وہاں داخلہ منع ہے کیا۔'' گل اندام پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''امی پلیز۔''

''سکون سے رخصت ہونے دو بیٹا! زندگی بھر سفر میں رہی ہوں، اب مزید نئے سفر کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

ان کے بے حد اصرار پر بھی گل اندام ملک سے باہر علاج کرانے پر راضی نہ ہوئی۔

گل اندام کو جانے کی بہت جلدی تھی، سال بھی پورا نہ کیا۔

☆☆☆

گل اندام کو تدفین کے لیے بیٹے کے پہلو میں ہی جگہ مل گئی۔ بیٹیاں اب باپ سے اصرار کر رہی تھیں ساتھ چلنے کے لیے داماد بھی اچھے تھے۔ انہوں نے بھی کاوش سے کہا کہ اکیلے کیسے رہیں گے۔ مگر کاوش نہ مانے۔

''اپنے بیٹے اور بیوی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔''

مسافر اپنے اپنے دیس کو واپس لوٹ گئے، گھر کا مالک اپنے دو ملازمین کے ساتھ وہیں رہ رہا تھا۔ بڑھتی عمر اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کا احساس پشیمانی بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ قبرستان جاتے اور تعبیر اور گل اندام کی قبروں پہ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ روتے کبھی مسکرا اٹھتے، گھر آتے تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، وہاں سے لاؤنج، لاؤنج سے لان، لان سے پھر اندر، وہ بے مقصد چکراتے پھرتے۔

کبھی الماریاں اور درازیں کھول کھول کر تعبیر اور گل اندام کے ملبوسات اور استعمال کی اشیا دیکھتے رہتے، پھر بہت احتیاط اور پیار کے ساتھ ایک ایک شے واپس جگہ پہ رکھ دیتے، قلم اٹھائے جیسے مدتیں گزر گئی تھیں، افسانے لکھنا جیسے بھول گیا تھا۔ کالم لکھنا کب کا چھوڑ دیا تھا، ملکی سیاست میں کیا کھیل تماشے ہو رہے ہیں، انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

رات کو سونے کے لیے آنکھیں بند کرتے تو بند آنکھوں کے پیچھے جیسے کوئی فلم سی چلنے لگتی، گزرا

وقت، بیتے واقعات، پچھلی زندگی ایک خواب وخیال سی لگتی، وہ سر جھٹک جھٹک کر خود کو اس آسیب سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے، مگر خیال کا آسیب پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ چمٹ جاتا۔ اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لیتا۔ ناچار وہ آنکھیں کھول کر بستر پہ اٹھ بیٹھتے اور پھر پوری رات یوں ہی گزر جاتی اور رات کا کیا ہے، جب ایک اتنی لمبی زندگی گزر جاتی ہے تو رات بھی گزر جاتی ہے، چاہے کانٹوں پہ ہی سہی۔

ایک روز فش ایکوریم میں ادھر سے ادھر گھومتی بے قرار مچھلیوں کو دیکھ کر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اک دم کھڑے ہو گئے۔

”رشید! گاڑی نکالو۔“

کتنے برسوں بعد وہ آج اس علاقے میں آئے تھے، جہاں کی جون ہی بدل چکی تھی۔ نہ سڑکیں وہ تھیں، نہ فٹ پاتھ۔ کئی پرانی عمارتوں اور سینماؤں کو گرا کر پلازے اور شاپنگ مال بن گئے تھے۔ وہ جوبلی سینما بھی ٹوٹ کر شاپنگ سینٹر بن گیا تھا، جس میں انہوں نے گل اندام کے ساتھ وحید مراد اور زیبا کی ’ارمان‘ دیکھی تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے اس وقت انہیں یہ ہی محسوس ہوا تھا کہ سب کچھ دائمی ہے، ان کا اور گل اندام کا ساتھ، ان کے درمیان محبت اور اسکرین پر نظر آتا یہ دلنواز اور ہر دلعزیز ہیرو اور تیکھی اداؤں والی خوب صورت اور نازک ادا ہیروئن، یہ سب جو آج دیکھ رہے ہیں، سدا یوں ہی رہے گا، مگر وقت کتنا ظالم ہے، تقدیر کتنی ستم گر اور زندگی کتنی بے مہر کہ کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔

گاڑی کے ساتھ ساتھ ان کا خیال بھی سفر کر رہا تھا۔ وہ جس علاقے سے گزر رہے تھے، وہاں کبھی بڑے بلند و بالا گھنے درخت اور ان پر چہچہاتے پرندے ہوا کرتے تھے، اب نہ وہ درخت رہے نہ ان پہ آباد گھونسلے اور پرندے، جب مکان ہی نہ رہے تو مکین سوائے سفر یا دربدری کے اور کیا کریں۔

”اس سڑک پہ لو۔“ مین روڈ سے اندر ایک ذیلی سڑک پہ انہوں نے گاڑی مڑوائی اور تھوڑی دور آگے جا کر رکوالی۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ بڑے سے کھلے گیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ ہر سو سکون اور خاموشی کا راج تھا۔ وہ اپنی یادداشت کے سہارے اس چھوٹے سے شہر کے ایک مکین کو ڈھونڈنے لگے، مگر بغیر نام و نشان کے ساری آرام گاہیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ ایک گھنٹے سے وہ پاگلوں کی طرح عثمان کی قبر ڈھونڈ رہے تھے جو ل کے نہیں دے رہی تھی، تھک ہار کر وہ ایک قبر کے پاس گھٹنوں کے بل ڈھے گئے۔

”مجھے سزا دو، میں نے اپنے دوست کو مار دیا، میں نے سب کی جان لے لی، مجھے سزا دو اور سزا دو۔“

ہسٹریائی کیفیت میں چیختے چیختے وہ منہ کے بل نیچے گر پڑے۔ رشید سمیت کئی لوگ ان کی طرف دوڑے تھے۔

اف یہ کم بخت دل، جوانی سے ہی دغا باز تھا، بڑھاپے میں بھی یہ عادت نہ چھوڑی، دغا دے گیا نا دوسری بار بھی۔

☆☆☆

ملک کے مشہور و معروف ادیب کے لیے اسپتال میں ملاقاتی بھی آئے اور پھول بھی، لوگوں نے انہیں فراموش نہیں کیا تھا، نظر انداز نہیں کیا تھا۔ انہیں خوش ہونا چاہیے تھا، لوگوں کی اس عنایت اور محبت پر، مگر جانے کیوں وہ خوش نہیں تھے، بالکل بھی نہیں، رات کے سناٹے اور تنہائی میں سوچتے سوچتے اچانک ہی ان پر انکشاف ہوا کہ رات کے آنچل میں بہت سے راز، بہت سے بھید اور بہت سارے اسرار چھپے ہوتے ہیں جو اس کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہے، اس میں یہ اپنے راز انڈیل دیتی ہے۔

اسپتال میں گزری پانچویں رات اچانک ہی ان کے اندر ایک جھماکا سا ہوا، بڑی تیز روشنی چمکی اور سب کچھ ان پہ واضح ہو گیا۔ وہ چھیل چھبیلی، ناز و انداز والی نخریلی ادائیں دکھاتی دنیا، جسے پانے کے

لیے جس کے حصول کے لیے انہوں نے اپنی پوری عمر کھپا دی، صحیح غلط کی تمیز کیے بغیر، جائز، ناجائز کی پروا کیے بغیر، جس دنیا کے حصول کی ہر ممکن کوشش اور جتن کرتے رہے وہ دنیا اپنے اصل مکروہ اور بدصورت چہرے کے ساتھ ان کے سامنے تھی جسے دیکھ کر ہی انہیں گھن آرہی تھی۔

کیا میں اس دنیا پر فریفتہ تھا؟ ان کی حیران پھٹی پھٹی آنکھیں اس بدصورت بڑھیا کو دیکھ رہی تھیں۔ جسے پانے کے لیے انہوں نے عثمان کے ساتھ کیا کچھ کیا، جس کے لیے پاگل ہو کر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے قلم کو ایک مقدس امانت سمجھنے اور اسی طرح برتنے کے بجائے ایک بکاؤ مال بنا دیا۔

وہ لوگ جو دنیا کی حقیقت کو اس کی اصلیت کو پہچان گئے تھے۔ سب کچھ بتا گئے تھے کہ کوئی نصیحت پکڑے، کوئی عبرت حاصل کرے، وہ جو ایک نبی کئی سو سال کی عمر گزارنے کے بعد ملک الموت کو سامنے دیکھ کر کہنے لگے۔

"مجھے پتا ہوتا کہ زندگی اتنی سی ہے تو یہ کٹیا بنانے کے بجائے ایک درخت کے نیچے ہی زندگی گزار دیتا۔"

کاوش مسعود کی اندر کی آنکھ اب کھلی تھی۔ حالانکہ ساری عمر کھلی آنکھوں سے صفحات سیاہ کرتے رہے اور لکھے صفحات پڑھتے رہے۔ کسی نے کہا تھا۔

"دنیا کچھ نہیں سوائے عبرت کے۔"

جب دونوں ہاتھوں سے دنیا سمیٹنے کی دھن ہوتی ہے تو ایسی باتیں بہت جلد فراموش کر دی جاتی ہیں۔ مگر یہ اب کیوں یاد آرہی ہیں؟ اب کیوں خیال آرہا ہے کہ واقعی کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں، دنیا کچھ بھی نہیں۔

پنجاب کے صوفی شاہ حسین نے کہا تھا۔

"خاموش رہو، دنیا قابل ذکر جگہ نہیں۔"

کاوش منصور خاموشی سے لیٹے سوچتے رہے...... سوچتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ انہیں نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ نرس معمول کے چیک اپ کے لیے آئی تھی۔

"جانتی ہو، میں کون ہوں؟" اچانک ہی وہ نرس سے مخاطب ہوئے۔

"جی ہاں، میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں، میں نے آپ کی کتابیں بھی پڑھی ہیں، آپ کاوش مسعود ہیں۔" نرس نے ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

کاوش مسعود چند لمحے اسے خاموشی سے دیکھتے رہے، پھر ایک سرگوشی میں بڑبڑائے۔

"میں کاوش مسعود نہیں، کاوشِ بے سود ہوں...... کاوشِ بے سود......" وہ دیوانوں کی طرح بار بار ایک ہی بات دہرا رہے تھے۔

نرس نے پہلے انہیں ترحم سے دیکھا، پھر خوف سے اور پھر وہ جا کر ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹرز اپنی پوری سی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انتہائی اور شدید سزا کا طالب دل مزید دھڑکنے سے انکاری ہو گیا تھا۔

اگلے دن کے تمام اخبارات میں پہلے صفحے پہ خبر شائع ہوئی تھی۔

ملک کے مشہور و معروف ادیب، سینئر لکھاری اور کالم نگار پچھتر برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی طویل ادبی خدمات......

☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

ایک تھی چھوٹی

کہتے ہیں کہ کئی سال پہلے، کسی بہت دور کے ایک چھوٹے سے قصبے میں خالہ جی کے بڑے سے آنگن میں دو بہویں آباد تھیں۔ لوگ انھیں چھوٹی اور بڑی کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے نام نہیں تھے! نام تو دونوں کے ہی بہت پیارے تھے مگر مشہور وہ اپنے لقب سے ہوئیں۔

کیسے؟

بات تو بہت عام سی ہے۔ پہلے خالہ جی اپنی بڑی بہو کو اس کے نام سے ہی پکارتی تھیں مگر جب سے چھوٹے بیٹے کی دلہن لائی تھیں اکثر باتوں باتوں میں بڑی اور چھوٹی کا حوالہ دے جاتیں، کیونکہ بڑی بہو نہ صرف گھر میں بڑی تھی بلکہ قد و قامت میں بھی۔ دیکھنے میں ہی جٹی لگتی جبکہ اس کے برعکس چھوٹی بہو درمیانے قد کی، نرم نازک سی تھی۔ اس لیے ان کے نام بھی بڑی اور چھوٹی پڑ گئے یعنی کہ نئی بہو کے آنے سے بڑی بہو کو نیا نام اور پہچان مل گئی۔ خالہ جی کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی انھیں اسی نام سے پکارنے لگے۔

حیرت کی بات تھی کہ دونوں عادتوں میں بھی اپنے نام کی طرح ہی ثابت ہوئی تھیں۔ بڑی بہو کی عادت تھی۔ ہر چھوٹی بات پر بہت بڑے بڑے ہنگامے کرنے کی۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہونے کے بجائے، بڑی بڑی خوشیوں کی تلاش میں رہتی، اس لیے نہ کبھی خود خوش رہتی اور نہ کسی کو رہنے دیتی تھی۔

جبکہ چھوٹی بہو...... اپنے نام کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھ کر سامنے والے کا دل جیت لیتی۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر اس طرح خوش تی جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ اس لیے وہ خود بھی خوش رہتی اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

''امی! پانی بہت ٹھنڈا ہے، مجھ سے نہیں دھلتے برتن۔'' بارہ سالہ عاصمہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو گرم رضائی میں دبکی شازیہ نے سر باہر نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

''تیرا چاچا کام سے واپس آ گیا؟'' شازیہ نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں امی! چاچی سالن گرم کر رہی ہیں۔'' عاصمہ نے ماں کو رپورٹ دی۔

''ہوں، اس کا مطلب کہ تیرا چاچا آنے ہی والا ہے۔ چل تُو آ کر سو جا۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔'' شازیہ نے نرمی سے کہا۔

''مگر امی برتن......'' عاصمہ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے گرم رضائی میں گھس جائے مگر امی کا کہنا نہ مانتی تو کئی دن تک اس کی شامت آنی تھی۔

''تیری چاچی ہے ناں، دھو لے گی خود ہی، اسے بہت شوق ہے دوسروں کے کام کرنے کا۔'' شازیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

عاصمہ کو آدھی بات سمجھ میں آئی اور آدھی نہیں! وہ جلدی سے سر ہلاتی اپنے بستر میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

"کیا کر رہی ہو چھوٹی بہو! خالد نہیں آیا ابھی تک کیا؟" خالہ جی غسل خانے سے واپس آتے ہوئے باورچی خانے میں روشنی دیکھ کر وہاں چلی آئیں۔

"جی آگئے ہیں۔ ابھی کھانے کے برتن اٹھائے ہیں۔ وہ ہی دھو رہی ہوں۔" ٹھنڈے پانی کے نیچے، تیزی سے ہاتھ چلاتی ماہ نور نے کہا۔

"مگر یہ سارے برتن تو تمہارے نہیں ہیں۔" خالہ جی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ماہ نور نے مڑ کر ایک نرم نگاہ ان پر ڈالی۔

"بس خالہ جی! دھل گئے سب برتن۔" ماہ نور نے کہتے ہوئے نلکا بند کیا اور اپنے دوپٹے سے ہاتھ خشک کرنے لگی۔

"بڑی بہو کو اپنے کام خود کرنے دیا کر، تُو اکثر

اس کے برتن دھو دیتی ہے مگر وہ تیری پڑی ایک پلیٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتی ہے۔"

خالہ جی نے ہمیشہ کی طرح اسے "مت" (عقل) دینے کی کوشش کی۔ ماہ نور نے مسکراتے ہوئے سب چیزیں اپنی جگہ پر رکھیں اور باورچی خانے کی لائٹ بند کر کے خالہ جی کو سہارا دیتی ان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"میاں جی اکثر کہتے تھے کہ کبھی بھی کسی نیکی یا عمل کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز مت کرنا۔ انسان کے چھوٹے چھوٹے عمل مل کر، نیکیوں کا پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔"

ماہ نور نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا اور خالہ جی کو بستر پر لٹا کر انہیں رضائی اوڑھانے لگی۔

"میاں جی کی کیا بات تھی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میاں جی نے اپنی نواسی کا رشتہ میرے بیٹے کو دیا۔ میں میاں جی کے پاس اکثر دم کروانے جاتی تھی۔ بہت نیک اور خدا ترس شخص تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔"

خالہ جی نے کہا تو ماہ نور نے فوراً آمین کہا اور خالہ جی کے کمرے کی لائٹ بند کرتے ہوئے چلی گئی۔ سونے سے پہلے خالہ جی کے ذہن میں میاں صاحب کی باتیں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

خالہ جی بڑی سی حویلی میں مقیم میاں جی کی کئی سالوں سے مرید تھیں۔ سفید داڑھی اور سادہ سے حلیے کے مالک، میاں صاحب کے مزاج میں عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی جوان بیٹی اور داماد کئی سال پہلے ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ تب سے ماہ نور کی ذمہ داری وہ اٹھا رہے تھے۔ گھر میں بہوویں تھیں مگر میاں صاحب نے ماہ نور کی ذمہ داری کبھی کسی اور کو نہیں سونپی تھی۔ اپنی شریک حیات کی وفات کے بعد وہ ماہ نور کی زیادہ فکر کرتے تھے۔ ان کے تینوں بیٹے اپنے باپ کو اکثر تسلی دیتے کہ ماہ نور ہماری بھی بچی ہے مگر میاں صاحب کی ایک ہی رٹ تھی کہ

"میں اپنی زندگی میں، اپنے ہاتھوں ہی ماہ نور کو رخصت کرنا چاہتا ہوں۔"

اس لیے وہ ماہ نور کے رشتے کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ جب خالہ جی کو یہ بات پتا چلی تو انھوں نے بنا کسی تاخیر کے ماہ نور کا ہاتھ مانگنے کا فیصلہ کر لیا۔

خالہ جی کے دونوں بیٹے میاں جی کے سامنے ہی پلے بڑھے تھے۔ اس لیے جب خالہ جی نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے ماہ نور کا رشتہ مانگا تو میاں جی نے فوراً ہاں کر دی۔ وہ اپنی بڑھتی عمر اور بیماری کی وجہ سے ماہ نور کے فرض سے جلد از جلد سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ ماہ نور کو اپنی آنکھوں کے سامنے رخصت کر کے وہ بہت مطمئن اور خوش تھے۔

ماہ نور کی شادی کے تقریباً تین ماہ بعد ہی میاں جی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماہ نور کے لیے اپنے تین بڑے ماموؤں کے ہوتے ہوئے بھی میکے کی مضبوط بنیاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

☆☆☆

"چھوٹی بہو! میرے سوٹ کی چادر ملی یا نہیں؟ میں نے بتایا بھی تھا کہ الماری کے اوپر والے خانے میں رکھی ہوئی ہے۔ سوٹ تو خالد نے اتار دیا مگر لگتا ہے کہ چادر وہاں ہی پڑی رہ گئی ہے۔ جلدی سے استری کر دو، مجھے درس میں جانا ہے۔"

خالہ جی نے صحن میں سے آواز لگائی تو پریشان چہرہ لیے ماہ نور کمرے سے باہر نکلی۔

"خالہ جی! میں نے بہت کوشش کی ہے مگر میرا ہاتھ نہیں پہنچ رہا الماری کے اوپر والے خانے تک۔"

ماہ نور نے شرمندگی سے کہا تو خالہ جی سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"میری غلطی ہے، میں نے رات خالد سے شاپر تو اتروا لیا مگر یہ نہیں دیکھا کہ اس میں پورا سوٹ ہے بھی یا نہیں۔ پچھلی بار شبنم نے اسی طرح بے ترتیبی سے میرے کپڑے شاپرز میں ڈال کر اوپر والے خانے میں رکھ دیے تھے کہ پیٹیوں اور صندوق میں

رکھنے کے بجائے، ایسے آسانی رہے گی مگر......"
خالہ جی گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنے ایسے کام محلے کی لڑکیوں سے کروا لیتی تھیں کیونکہ شازیہ کو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔
"خالہ جی! آپ نے کام بھی تو کسے کہا ہے۔"
اسی وقت شازیہ وہاں آگئی اور طنزیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
"کیا مطلب؟" خالہ جی نے پوچھا۔
"خالہ جی! آپ ماہ نور کا قد تو دیکھیں۔ کتنا چھوٹا ہے۔ پیڑھی پر چڑھ کر بھی اس کا ہاتھ نہیں پہنچا جبکہ میں کتنے آرام سے اتار کر لے آئی ہوں۔"
شازیہ نے فخریہ انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی آف وائٹ چادر آگے بڑھائی۔
"شکر ہے، چل ماہ نور! جلدی کر، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" خالہ جی نے چادر خاموش کھڑی ماہ نور کی طرف بڑھائی تو شازیہ منہ بنا کر رہ گئی۔
"اونہہ! نہ شکریہ اور نہ کچھ اور......" شازیہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ وہ اپنی برتری ثابت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کی برتری کو سراہنے یا تسلیم کرنے والے لوگ ذرا کم کم ہی تھے۔ یہ بات ہی اسے غصہ دلا دیتی تھی۔

☆☆☆

"میں سچ کہہ رہی ہوں عاصمہ کے ابا! خالہ جی نے ہمیشہ میری حق تلفی کی ہے۔ پہلے مجھے کبھی بھی وہ مقام نہیں دیا جو ایک بڑی بہو کا بنتا تھا اور جب سے وہ میسنی ماہ نور آئی ہے، ان کی ساری ہمدردی اور محبت اس کے لیے ہی رہ گئی ہے، ہر بات میں اس کی تعریف، کیا میں کسی سے کم ہوں؟"
شازیہ اپنے سرتاج کے سامنے شکایت نامہ کھولے بیٹھی تھی جو رجسٹر پر زمینوں کا حساب کتاب لکھتا کئی بار رکا تھا۔
"کیا ہے بھئی؟ ہر وقت ایک ہی رونا۔ پہلے تم اکیلی تھیں تو اس بات کا رونا روتی تھیں کہ اماں تم سے زیادہ کام کرواتی ہیں۔ آرام کرنے کا موقع ہی نہیں دیتیں اور اب جب ان کی ساری ذمہ داری ماہ نور نے اٹھالی ہے تو تب بھی تمہیں شکایت ہے، کسی حال میں تو خوش رہنا سیکھو۔"
سرتاج نے حساب کتاب غلط ہونے کا سارا غصہ اس پر نکالا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔
"اونہہ! سب مجھے ہی غلط کہتے ہیں۔ عاصمہ! اٹھ ذرا، جا کر دیکھ تیرا باپ ضرور تیری دادی کے پاس گیا ہے۔ ذرا سن کر تو آ، دونوں کیا باتیں کر رہے ہیں۔"
عاصمہ اپنے سامنے کتابیں پھیلائے اسکول کا کام کر رہی تھی ماں کی بات پر مجبوراً سر جھکائے اٹھ گئی مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ منع کر دے۔ اس کا ابھی بہت سا کام پڑا ہوا تھا جو اس نے سونے سے پہلے مکمل کرنا تھا۔
"امی! میری کتابوں کا خیال رکھیے گا۔ نہیں تو یہ تینوں خراب کر دیں گے!"
عاصمہ نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھا جو اسے منہ چڑانے لگے۔
"اچھا جا! کچھ نہیں کرتے یہ۔" شازیہ نے لاپروائی سے کہا تو عاصمہ وہاں سے چلی گئی۔
"عاصمہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" عاصمہ جو دادی کے کمرے کی پچھلی سائیڈ والی کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اپنے پیچھے ماہ نور کی آواز سن کر اچھل ہی پڑی۔ ماہ نور کے ہاتھ میں پرات تھی جس میں چاول تھے۔ عاصمہ سمجھ گئی کہ وہ اسٹور سے چاول نکال کر لائی ہے۔ نہیں تو شام کے وقت گھر کے پچھلے حصے میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔
"کچھ نہیں چاچی! وہ بس ایسے ہی......"
عاصمہ نے گھبرا کر کہا تو ماہ نور نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔
"عاصمہ! اچھی بچیاں کبھی بھی دروازوں یا

دہلیزوں میں کھڑی ہو کر چھپ چھپ کر کسی کی باتیں نہیں سنتی ہیں۔ اس کا بہت گناہ بھی ہے اور اگر کوئی دیکھ لے تو آپ خود سوچو کہ......"

"چاچی! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے آپ کسی کو کچھ مت بتانا، نہیں تو ابا مجھے بہت ماریں گے۔" عاصمہ نے ڈر کر ماہ نور کا ہاتھ پکڑ لیا اور منتیں کرنے لگی۔

"اچھا ٹھیک ہے، مگر تم بھی وعدہ کرو کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گی۔" ماہ نور نے نرمی سے کہا تو عاصمہ نے جھٹ سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"امی میں چاچی سے پڑھ لیا کروں، مجھے کئی چیزیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔"

ایک دن تنگ آ کر عاصمہ نے کہا تو شازیہ نے سر ہلا دیا۔ عاصمہ خوشی خوشی اپنے کتابیں اٹھا کر ماہ نور کے پاس چلی گئی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ نہیں آتا ہے، میں بھی سب جانتی ہوں مگر میرے پاس تمہاری طرح فالتو وقت نہیں ہے کہ بچوں کو پڑھا سکوں۔"

عاصمہ کو ماہ نور بہت توجہ سے پڑھا رہی تھی، جب شازیہ نے آ کر اپنے مخصوص تیز انداز میں کہا۔ ماہ نور نے سر اٹھا کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"جی بھابھی!" اور دوبارہ عاصمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"یہ بات تم ویسے بھی کہہ سکتی تھیں، ہر بات پر احمقوں کی طرح مسکرانا ضروری نہیں ہوتا۔"

شازیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ماہ نور سادگی سے بولی۔

"میاں صاحب کہتے تھے کہ مسکراہٹ سے خوب صورت تحفہ کچھ نہیں ہوتا، اس لیے دوسروں کو یہ تحفہ دیتے رہا کرو۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔"

"اونہہ محبت......" شازیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور سر جھٹکتی وہاں سے چلی گئی۔ پیچھے سے آتی خالہ جی نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔ اس لیے پاس آ کر بولیں۔

"تو بھی کس کے ساتھ سر کھپاتی ہے، بڑی بہو کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کب سمجھ میں آتی ہیں۔ وہ بہت بڑی ہے ناں، اس لیے صرف بڑی بات ہی سمجھ سکتی ہے۔"

خالہ جی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تبصرہ کیا تو ماہ نور سر ہلا کر رہ گئی جبکہ عاصمہ نے کچھ سوچتے ہوئے چاچی کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

"بڑی بہو! میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی، میرا مقصد تمہاری برائی کرنا نہیں تھا۔"

صبح مردوں کے گھر سے جاتے ہی، شازیہ شدید غصے میں خالہ جی کے پاس پہنچی اور کل شام کہے ہوئے ان کے چند جملوں کو بنیاد بنا کر لڑنے لگی۔ خالہ جی وضاحت دے دے کر تھک گئیں۔ شازیہ نے اپنے اندر چھپا کئی دنوں کا حسد اور جلن، غصے کی شکل میں، لفظوں میں ڈھال کر، ماہ نور کو بھی بے نقط کی سنا دیں۔ ماہ نور اسے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی، جس پر شازیہ کو اور غصہ آ گیا۔ وہ ماہ نور کو مختلف القاب سے نوازنے لگی مگر ماہ نور نے اسے پلٹ کر جواب نہیں دیا اور گھر کے کام کرتی رہی۔ دوپہر تک گھر میں یہ ہنگامہ چلتا رہا۔ بالآخر تھک ہار کر شازیہ منہ پھلا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

"شام کو عاصمہ کے ابا آئیں گے تو وہی بات کریں گے، اب ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔"

کمرے میں بند ہونے سے پہلے شازیہ نے اعلان کیا۔ خالہ جی کا دل اس کے رویے سے بہت خراب ہوا، اس لیے وہ اداسی سے منہ لپیٹ کر لیٹ گئیں۔ عاصمہ نے شرمندگی سے اس منظر کو دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس کے بتانے کی وجہ سے ہی اتنی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ دادی اور چاچی دونوں کا اداس چہرہ دیکھ چکی تھی۔

"چاچی بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ میں نے جان

بوجھ کر گھر میں لڑائی کروائی ہے۔"
عاصمہ نے بے چینی سے سوچا اور ماہ نور کو ڈھونڈتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی آئی۔ ماہ نور کچھ سامان ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔ اس نے مصروف سے انداز میں پلٹ کر عاصمہ کی طرف دیکھا۔
"کچھ چاہیے عاصمہ؟" ماہ نور نے اپنے مخصوص نرم انداز میں پوچھا۔ عاصمہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔
"چاچی! میں نے تو امی کو ویسے ہی وہ بات بتائی تھی۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ......"
عاصمہ نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ ماہ نور نے الماری کا خانہ خالی کیا اور خودکلامی کی۔
"دیمک ساری لکڑی کھا گئی ہے۔"
ماہ نور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر سامنے کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ دیکھو عاصمہ! لکڑی کی بنی مضبوط اور پرانی الماری کو دیمک کے چھوٹے چھوٹے بے شمار کیڑوں نے کیسے کھوکھلا بنا دیا ہے۔"
عاصمہ نے آگے ہو کر دیکھا جہاں لکڑی بھربھری ہو کر جھڑ رہی تھی اور اس میں سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے، بے شمار کیڑے چل رہے تھے۔
"اف چاچی!" عاصمہ ڈر کر فوراً پیچھے ہٹی۔
"بالکل اسی طرح، جب چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں، شکوے شکایتیں جمع ہو جائیں تو وہ رشتوں کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ میاں صاحب کہتے تھے کہ بولنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ کہیں تمہاری کہی معمولی سی بات، کسی کے دل میں شک اور نفرت کا وہ کیڑا نہ بن جائے، جو اچھے بھلے دلوں کو کھوکھلا بنا دے......!" ماہ نور نے نرمی سے کہا۔
"چاچی آپ بہت اچھی ہیں، آپ کتنی اچھی اچھی باتیں کرتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ رات کے برتن میں جان بوجھ کر چھوڑ دیتی تھی تاکہ آپ دھو دیں اور آپ چاہتیں تو میری اس دن والی حرکت کے بارے میں سب کو بتا سکتی تھیں مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، کاش آپ میری امی ہوتیں یا میری امی بھی آپ کی طرح ہو جائیں۔"
عاصمہ نے پیار سے دونوں بازو ماہ نور کی کمر کے گرد لپیٹ لیے۔ ماہ نور نے مسکرا کر اس کا سر تھپتھپایا۔
"تم بھی میری بچی ہو عاصمہ۔"
ماہ نور نے پیار سے کہا۔ جب اس کی نظر گم صم سی کھڑی شازیہ پر پڑی۔
"وہ میں چھوٹے کے لیے دودھ لینے آئی تھی۔"
شازیہ نے فوراً کہا اور جلدی سے مڑ گئی مگر ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں پھیلی نمی دیکھ لی تھی۔

☆☆☆

ایک چھوٹے سے واقعے نے، کسی کے دل کو بہت تیزی سے بدل دیا تھا۔
پھر وقت بھی بہت تیزی سے بدلا......
کہتے ہیں کہ کئی سال پہلے، بہت دور، کسی چھوٹے سے قصبے میں خالہ جی کے بڑے سے آنگن میں دو بہویں آباد تھیں۔
ایک تھی چھوٹی اور ایک تھی بڑی...... آنے والے وقت میں، جن کے پیار اور اتفاق کی مثالیں سب دینے لگے۔
اور یہ سب ہوا تھا، اس چھوٹی بہو کی وجہ سے۔
کیونکہ وہ جو چھوٹی تھی ناں، وہ بڑے بڑے پتھر دل لوگوں کو، اپنی محبت، ایثار اور صاف نیت سے موم کرنا جانتی تھی۔

❁

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیہا علی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

فرزانہ بتول

وہاں داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے اس نے احترام کی حدود میں قدم رکھا ہو۔ وہ بولتی خاموشی کو محسوس کرتا ہوا وہیں گر سا گیا تھا۔ اور گر تو وہ بہت پہلے ہی چکا تھا۔ لیکن احساس اب ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے لوگوں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ پھر اس نے تھک کے آنکھیں موند لی تھیں۔ اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ تب ہی اس کے کانوں نے ایک شفیق آواز سنی تھی۔ لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ آنکھیں کھول کے بولنے والے کو دیکھ سکتا۔

"رو لینا چاہیے اپنے دکھوں پر پچھتاووں اور غلطیوں پر اور دوسروں کے دکھوں پر بھی ان کے دل ٹوٹنے کی اذیت کو محسوس کرتے ہوئے۔" اور اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی اور رو دیا تھا۔ جیسے یہ سب اس کے لیے ہی کہا گیا ہو۔

"محبت کرنے والوں کا آنسوؤں سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے محبوب کی محبت کی داستان میں بھی بے شمار آنسو موجود ہیں اور پھر اللہ کے محبوب سے محبت کرنے والوں کا بھی آنسوؤں سے بہت مضبوط تعلق ہے۔" کہنے والے کی آواز میں بھی محبت کی نمی شامل ہوئی تھی۔ اور بولنے والا چپ ہو گیا تھا۔ تب ہی کسی نے بہت نرمی سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یار! دیکھا تو نے اس سال تو خوب صورت لڑکیاں

ناولٹ

جوق در جوق ہماری یونیورسٹی میں داخل ہو رہی ہیں۔"
ارتضیٰ ملک کینٹین میں بیٹھ کر برگر کھا رہا تھا جب شیرو نے بریکنگ نیوز سنائی تھی اور اس کی پلیٹ میں سے برگر اٹھا کے کھانے ہی والا تھا کہ ارتضیٰ کی گھوری سے اس کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا تھا۔
"کھا لینے دے یار! صبح سے بھوکے پیٹ سینکڑوں لڑکیوں کے فارم جمع کروائے ہیں۔ اور تو نے تو یہ بڑی بڑی آنکھیں صرف مجھے گھورنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔"
"ہاں تو کیا ضرورت تھی تمہیں حاتم طائی بننے کی' لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ وہ خود بھی تو کروا سکتی تھیں۔" ارتضیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔
"تجھے تو پتا ہے یار مجھ سے خوب صورت لڑکیوں کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔" شیرو نے خباثت سے مسکراتے ہوئے وضاحت کی تھی۔
"میں تو کہتا ہوں تو بھی جا کے اپنا کوئی امپریشن بنا لے۔" شیرو نے ارتضیٰ کو بھی مشورہ دیا۔
"مجھے امپریشن بنانے کے لیے فضول حرکتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارتضیٰ ملک کسی لڑکی طرف نظر بھر کے دیکھ لے' یہ ہی کافی ہے۔ لڑکیاں تو فورا" سے پہلے لٹو ہو جاتی ہیں۔ ارتضیٰ ملک کو کیا سمجھتے ہو تم۔" وہ غرور سے گردن اکڑاتے ہوئے بولا۔
"ہاں پر میری ایسی قسمت کہاں۔" شیرو مایوسی سے بولا۔ "تجھے پتا ہے' پروفیسر احمد نے وارننگ دی تھی کہ ہم نے اب ان کا پیریڈ بنک کیا تو وہ ہمارے پیرنٹس کو بتا دیں گے۔" شیرو نے یاد آنے پر جلدی سے ارتضیٰ کو بتایا۔ جو تیز تیز قدم اٹھاتا اس سے آگے چل رہا تھا۔
"تو جائیں بتا دیں۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو مہو! اگر تمہارے ابا جان منع کر رہے ہیں تو یقینا" کوئی وجہ ہو گی۔ تم اس طرح روڈ ہو گی تو ان کو دکھ ہو گا۔"
"آپ لوگ مجھے کوئی وجہ تو بتائیں امی۔" مہو نے روتے ہوئے سر اٹھا کر کہا تھا۔
"وہ منع کر رہے ہیں' بس یہی وجہ کافی ہے۔" صباحت بیگم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے۔ میں دادا جان سے خود بات کروں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔" مہو نے پرعزم لہجے میں کہا۔
"یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو تم انکار ہی ہو گا۔" صباحت بیگم نے مہو کو باز رکھنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی خواہش ختم ہونے کی خواہش کی تھی۔
دادا جی کے کمرے میں قدم رکھتے ہی مہو کو احساس ہوا تھا کہ دادا جان پریشان ہیں۔ وہ تمام بتیاں بجھائے بیڈ پر آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ مہو نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا کہ اگر دادا جان اس کے آنسو دیکھیں گے تو اور پریشان ہوں گے۔
"آؤ مہو بیٹا!" دادا جان کی نحیف آواز کمرے میں گونجی اور وہ خاموشی سے ان کے ہاتھ کو بوسہ دے کر وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی اور پھر ان کے چہرے کو دیکھتے ہی مہو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کوئی بات نہیں کرے گی۔
"دادا جان' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے فکرمندی سے ان کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ٹھیک ہوں بیٹا! جس کی اتنی معصوم سی بیٹی ہو اسے کیا ہو سکتا ہے بھلا۔" وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولے۔
"تم بتاؤ' کچھ کہنا تھا تمہیں۔" وہ مہو کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے بولے۔
"نہیں دادا جان! آج آپ باہر نہیں آئے تو میں آپ کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔"
"اچھا چلو پھر چلتے ہیں باہر۔" وہ محبت سے مہو کی پریشان شکل دیکھ کر بولے۔ وہ دادا جان کا ہاتھ تھام کر ابھی ٹی وی لاؤنج کے داخلی دروازے تک ہی پہنچی تھی

کہ سامنے سے مہو کے بابا جان شیراز شاہ آتے دکھائی دیے۔

"السلام علیکم بابا۔" وہ قریب آتے ہی بولے اور عقیدت سے اپنے بابا سرفراز شاہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

"مہو! بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم انہیں باہر مت لے کر جاؤ۔" وہ سختی سے بولے۔

"نہیں شیراز! مہو نے نہیں کہا۔ میں خود باہر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ تھک گیا ہوں لیٹ لیٹ کر۔"

"ایسی بات ہے تو میں لے چلتا ہوں آپ کو۔ کچھ لوگ بھی ملنے آئے ہوئے ہیں آپ سے۔" شیراز شاہ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے تھے۔

"مہو! تم جاؤ اندر اور یہ دروازہ بھی بند کر دینا وہ لوگ یہیں لان میں بیٹھیں گے۔" مہو سرہلاتی اندر چلی گئی

"شیراز! تمہارا رویہ دن بدن مہو کے ساتھ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے بات کرتے ہیں بیٹیوں سے۔" سرفراز شاہ نے تنبیہی لہجے میں بیٹے سے کہا تو شیراز شاہ کے اٹھتے قدم لمحے بھر کو رکے تھے اور انہوں نے باپ کے چہرے کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا بابا جان کو کچھ یاد نہیں ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں ہی سوچا تھا، کہنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ سر جھکا کر صرف اتنا کہا۔

"جی بابا جان کوشش کروں گا۔"

✡ ✡ ✡

ارتضیٰ ملک گھر میں داخل ہوا تو اس کی پہلی نظر اپنی ماں پر پڑی تھی، جو ہمیشہ کی طرح تسبیح لیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گیا اور فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگائی۔

"ارتضیٰ کچھ کھاؤ گے بیٹا!" تب ہی اس کی ماں نے اپنے خوبرو اور وجیہہ بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ چاہیے ہوگا تو لے لوں گا کچن سے، آپ ہر وقت سر پر سوار نہ ہوا کریں۔" وہ بدتمیزی سے کہتا ہوا کچن سے نکلا اور ٹی وی کھول کر صوفے پر ڈھے سا گیا۔

"تم اتنی جلدی گھر کیسے آگئے۔ ابھی تو گئے تھے یونیورسٹی۔" وہ پریشانی سے کہتی ہوئی اس کے برابر آبیٹھی تھیں۔

"تو آپ کو کیا پریشانی ہے، میرے ہر معاملے میں نہ بولا کریں آپ۔ ہزار دفعہ منع کیا ہے آپ کو۔" وہ ریموٹ میز پر پٹخ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ

تاسف سے اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کے بابا سے بات کرتی ہوں کہ سمجھائیں اسے۔" وہ فیصلہ کرتے ہوئے پھر سے تسبیح پڑھنے لگی تھیں۔

✡ ✡ ✡

شیراز شاہ نے راہداری میں قدم رکھا ہی تھا کہ انہیں مہو کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ بے اختیار بڑھتے چلے گئے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئے تھے۔ سرونٹ کوارٹر کے چھوٹے سے صحن میں وہ ڈرائیور کی بیٹی کے ساتھ گول گول گھومتے ہوئے کوئی نظم گا رہی تھی۔ شیراز شاہ کو لگا تھا وہ کہیں اور پہنچ گئے ہیں۔ جب مہو نے ان کی انگلی تھام کر چلنا شروع کیا تھا اور انہوں نے صرف یہ چیک دیکھنے کے لیے کہ مہو سہارے کے بنا چل سکتی ہے کہ نہیں ایک لمحے کو اپنا ہاتھ اس کے نازک ہاتھ سے چھڑایا تھا اور چند قدم دور جا کھڑے ہوئے تھے ان کے ہاتھ چھڑاتے ہی ننھی سی مہو دھڑام سے گری تھی۔ شیراز شاہ کا دل بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے روتی ہوئی مہو کو سینے سے لگایا تھا۔

تب ہی سرفراز شاہ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ "گرا دیا نا شیراز اس کو کل بھی تجھے سمجھایا تھا یہ ابھی سہارے کے بنا نہیں چل سکتی۔ تجھے پتا نہیں کس بات کی جلدی ہے۔" سرفراز شاہ نے روتی ہوئی مہو کو شیراز کے ہاتھوں سے چھینا تھا۔ اور شیراز شاہ

شرمندہ شرمندہ سے ان کے پیچھے چل دیے تھے۔ ابھی بھی کچھ کرنے کی آواز آئی تھی اور وہ ماضی سے حال کی طرف لوٹے تھے۔
سامنے مہو اور ڈرائیور کی بیٹی شاید گھومتے گھومتے گر گئی تھیں اور اب بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ شیراز شاہ یک ٹک مہو کو ہنستے ہوئے دیکھ رہے تھے تب ہی ہنستی ہوئی مہو کی نظر ان پر پڑی تھی اور اس کی ہنسی کو بریک لگی تھی۔ شیراز اس کے دیکھنے پر جلدی سے رخ موڑ گئے تھے۔
ہائے ممی! بابا نے دیکھ لیا۔ اب ڈانٹ پڑے گی۔
میں نہیں کھیل رہی تمہارے ساتھ۔" وہ پریشانی سے کہتے ہوئی بھاگی تھی۔
شام کو سب دسترخوان پر جمع تھے سوائے مہو کے' سب سے پہلے سرفراز شاہ نے اس کی غیر حاضری کو محسوس کیا تھا۔
زلیخا! مہو بی بی کو بلاؤ۔"
"میں گئی تھی شاہ جی انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔"
"اچھا کھانے کی ٹرے لے آؤ۔" وہ دسترخوان سے اٹھتے ہوئے بولے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہوئے انہیں اندھیرے کے باعث کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ کمرہ روشن ہوتے ہی انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئے مہو نظر آئی تھی۔
"دادا جان! آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔ آپ نے کیوں زحمت کی" وہ فوراً کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ وہ مہو کے عالی شان بستر پر بیٹھ گئے تھے۔ مہو نیچے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔
"مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ وجہ پوچھ سکتا ہوں اس بھوک ہڑتال کی؟" وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے تھے۔
"نہیں دادا جان ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"
"مجھے صرف سچ سننا ہے مہو۔"
"دادا جان وہ..." مہو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بتائے یا نہ۔ "وہ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔ میری ساری فرینڈز لے رہی ہیں۔ پلیز دادا جان۔"
سرفراز شاہ اس کی بات سنتے ہی ساکت رہ گئے تھے۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے مہو کے چہرے کو دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کسی اور کا چہرہ نظر آ رہا تھا مہو کے بجائے۔ وہ یک ٹک مہو کو دیکھ رہے تھے اور ان کے کانوں میں ماضی کی آواز گونجی تھی اور وہ لرز کے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سید سرفراز شاہ نے اپنے والد کی علالت کے بعد ان کی گدی سنبھالی تھی اب وہ اپنے علاقے کے گدی نشین تھے۔ لاکھوں لوگ ان کی سخاوت اور رحم دلی کے گرویدہ تھے۔ ان کی درگاہ ہر خاص و عام کے لیے تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ کھانا کھاتے تھے۔ سرفراز شاہ نے بھی اپنے والد کی کمی کو بہت اچھی طرح پورا کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں خدا محبت کی زندگی سے زندہ رکھتا ہے۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹے شیراز شاہ اور ایک بیٹی شہربانو سے نوازا انہوں نے بیٹی کی محبت کے حق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھتے ہوئے پورا کیا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ پیر سرفراز شاہ کی جان ان کی بیٹی میں قید ہے۔ وہ ابھی گھر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ شہربانو جلدی سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی تھی۔
"شکر ہے ابا جان آپ آ گئے' مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"
تب ہی ان کی بیگم جہاں آرا نے شیربانو کو ٹوکا تھا۔
"شیربانو! بابا کو سانس تو لینے دو۔ آتے ہی شروع ہو جاتی ہو۔ تم نہیں پتا ہے نا اتنے لوگوں کو کھانا پیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں وہ۔"
"ہاں تو بابا جان! آپ خود کیوں پیش کرتے ہیں کھانا۔ کسی اور کو کہہ دیا کریں۔" شیربانو جلدی سے بولی۔
"نہیں بیٹا! اگر تمہیں پتا چل جائے کہ بھوکے کو عزت سے کھانا کھلانے کا کتنا ثواب ہے تو تم ساری زندگی کوئی اور کام نہ کرو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے

بولے "ہاں بولو کیا ضروری بات کہنی ہے تمہیں۔"

"وہ بابا جان مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے' بھائی کی دفعہ تو کسی کو اعتراض نہیں تھا اب اماں مجھے منع کر رہی ہیں کہ تم آگے نہ پڑھو شیراز بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ کوئی ضرورت نہیں ہے پڑھنے کی 'پلیز بابا جان۔" وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھو بیٹا 'ہمارے خاندان میں اس کی گنجائش نہیں نکلتی۔" وہ رسانیت سے بولے تھے۔

"کیوں آپ کو اعتبار نہیں ہے مجھ پر۔" وہ رو دی تھی۔ اور پھر اس کی بھوک ہڑتال اور رونے نے سرفراز شاہ کو مجبور کر دیا تھا۔ اور بیٹے کی مخالفت کے باوجود شیر بانو کو شہر کی یونیورسٹی میں داخل دلوا دیا تھا۔ اور یونیورسٹی کے ایک سال نے شیر بانو کو سرتاپا بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ احسن جو کہ یونیورسٹی کا سب سے بہترین لڑکا تھا' کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اور حیا و لحاظ کے سارے سبق بھلائے وہ اپنی ماں کو بتا چکی تھی کہ وہ شادی کرے گی تو صرف احسن سے ورنہ وہ مر جائے گی۔ جب اسے پتا چلا کہ کچھ لوگ اس کے رشتے کے سلسلے میں آ رہے ہیں تو اس نے احسن سے کہا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو رشتہ لینے کے لیے بھیجے۔ احسن نے فوراً" اپنے ماں باپ سے بات کی۔ اور اگلے ہی دن احسن کے ماں باپ سوالی بن کر سرفراز شاہ کے گھر موجود تھے۔

"ہم اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر چکے ہیں۔" سرفراز شاہ کے اتنے واضح انکار نے ملک احسن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اور راہ اختیار کرے گا اور پھر شہر بانو نے رات کی تاریکی میں اپنے شاہ محل کی چوکھٹ کو عبور کیا اور اپنے ماں باپ کو لاکھوں لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ سرفراز شاہ پوری عمر اس رات کی تاریکی کو بھول نہیں سکے تھے اور شیراز شاہ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اسی لیے وہ اپنی تین سالہ بیٹی مہو سے رخ پھیر گئے تھے۔ ان کے لیے صرف ان کا بیٹا اسفند شاہ ہی کافی تھا۔ وہ اسفند شاہ کو انگلینڈ بھیج دینا چاہتے تھے لیکن صباحت بیگم بیٹے کی جدائی برداشت کرنے کے حق میں نہ تھیں مگر شیراز شاہ کے آگے ان کی ایک نہ چل سکی اور اسفند شاہ چھوٹی سی عمر میں ہی سات سمندر پار پہنچ گیا۔

مہو کی ایک بات نے سرفراز شاہ کو دوبارہ سے اسی رات کی تاریکی میں دھکیل دیا تھا۔

"پلیز دادا جان' آپ بھروسا رکھیں اپنی تربیت پر میں آپ کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے کبھی ضد نہیں کی' صرف پہلی اور آخری بات مان لیں۔ میری آئندہ بھی کچھ نہیں مانگوں گی آپ سے۔" وہ ان کے قدموں میں بیٹھی کہہ رہی تھی اور سرفراز شاہ نے اپنا

لرزتا ہوا ہاتھ مہو کے سر پر رکھا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا شیراز سے کل اسفند بھی آ رہا ہے وہ تمہارا ایڈمیشن کروا دے گا۔"
سرفراز شاہ ایک مرتبہ پھر محبت کے ہاتھوں مجبور ہوئے تھے۔ "لیکن بیٹا یاد رکھنا جب بیٹی گھر سے باہر نکلتی ہے تو باپ دادا کی عزت ساتھ لے کر نکلتی ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس عزت میں اضافہ کرو یا اسے مٹی میں ملا دو۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اور مہو پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں مسجد جا رہا ہوں مہو تم کھانا کھا لینا۔" وہ کہہ کر رکے نہیں اور تیزی سے باہر نکلے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات کے تین بجے جب ارتضیٰ گھر میں داخل ہوا تو ملک صاحب جو اسے نرمی اور پیار سے سمجھانے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے وہ ارادہ ارتضیٰ کی حالت دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ان کے قریب آ کر رکا تھا۔
"کہاں تھے تم؟ یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔" وہ اس کے قریب آتے ہی دھاڑے تھے۔
"میں وہ میں.... دوستوں کے ساتھ تھا۔" ہکلاتے لہجے میں اس نے بمشکل جواب دیا تھا۔
"اور یہ ڈرنک کب سے شروع کی تم نے۔" وہ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔
"ڈرنک تو نہیں ہے بابا۔" اور ملک صاحب کی برداشت جواب دے گئی۔ ان کا ہاتھ پوری قوت سے اٹھا اور ارتضیٰ ملک کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے ارتضیٰ! آئندہ شکل مت دکھانا مجھے، آج تک میں نے تمہاری ہر غلطی کو معاف کیا، غلط کیا۔ میں نے پہلی بدتمیزی پر ہی یہ ہاتھ اٹھایا ہوتا تو آج تم یہاں نشے میں دھت میرے سامنے نہ کھڑے ہوتے۔" وہ بے بسی سے کہتے ہوئے صوفے پر گر گئے تب ہی مسز ملک بھاگتی ہوئی آئی تھیں اور لاؤنج کا منظر دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ ارتضیٰ گال پر ہاتھ رکھے دو زانو

فرش پہ بیٹھا تھا اور ملک صاحب کی چہرے پر اذیت رقم تھی۔ شاید انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔
"ملک صاحب!" وہ وہیں سے چلائی تھیں اور گرتی پڑی ان تک پہنچی تھیں۔
"بخشو گاڑی نکالو۔ ملک صاحب کو اسپتال لے کر جانا ہے اور صابر تم چھوٹے صاحب کو کمرے میں لے جاؤ۔" وہ چادر اوڑھتے ہوئے ملازم کو ہدایت دے رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"جب میں نے کہا تھا کہ مہو بابا جان سے کوئی بات نہیں کرے گی تو اس کی ہمت کیسے ہوئی بات کرنے کی۔" شیراز شاہ کو جب سے بابا جان کی اجازت کی خبر ملی تھی غصے سے ان کی حالت خراب تھی۔ صباحت بیگم ان کے زیر عتاب تھیں کیونکہ مہو سے تو آج تک انہوں نے بات نہیں کی تھی۔
"دیکھیں اسفند آ رہا ہے۔ اس کے سامنے گھر کا ماحول خراب مت کریں۔ میرا بیٹا اتنے سالوں کی جلا وطنی کاٹ کر آ رہا ہے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں آپ چھوڑ دیں اس بات کو۔" وہ شیراز شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی تھیں۔
"میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کبھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی۔ میں گارنٹی دیتی ہوں اس کی۔"
"اگر مہو کی وجہ سے میرے باپ دادا کی عزت پر کوئی حرف آیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ بتا دو بتا اپنی لاڈلی کو۔" وہ غصے سے کہتے ہوئے باہر نکلے تھے اور صباحت بیگم دل تھام کر رہ گئی تھیں۔
اسفند کے آتے ہی گھر کے در و بام سج گئے تھے۔ مہو کو لگا جیسے وہ مضبوط ہو گئی ہے۔ شیراز شاہ کی بے رخی نے ہمیشہ اسے اندر سے توڑے ہی رکھا تھا لیکن اب اسے لگا تھا کہ اسفند اسے شیراز شاہ تک پہنچا سکتے ہیں کیونکہ شیراز شاہ کو صرف اسفند سے ہی محبت تھی اور

جب سے اسفند آیا تھا مہو کو ان کی جان لیوا گھوریوں سے بھی نجات ملی ہوئی تھی۔ ابھی بھی وہ لان میں بیٹھی اسفند اور شیراز شاہ کو بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور وہ اسفند کی کسی بات پر زور سے ہنس دیے تھے اور مہو کی آنکھوں میں آنسو گئے تھے تب ہی اسفند شاہ کی نظر اس پر پڑی تھی۔

"آؤ مہو! تم بھی کھیلو ہمارے ساتھ۔" وہ اپنا ریکٹ ہاتھ میں لیے اس کی جانب آیا تھا۔

"نہیں، آپ لوگ کھیلیں۔" اور شیراز شاہ فوراً اپنا ریکٹ وہیں چھوڑ کے اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اسفند نے تاسف سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر مہو پر نظر ڈالی تھی۔ جو خاموشی سے اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

"مہو!" اسفند محبت سے اس کو پکارتا وہیں گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔

"اسفند بھائی! آپ کیوں آئے میری طرف' بابا ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ کتنے عرصے بعد تو مجھے ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کو ملی تھی اور وہ بھی ختم ہو گئی میری وجہ سے۔" وہ روتے ہوئے اسفند سے شکوہ کر رہی تھی۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا کی یہ خود ساختہ ناراضی آخر ختم کب ہوگی؟" وہ پریشانی سے بولا تھا۔ مہو اس کے چہرے پر تشویش دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی اور وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب اس بے وجہ مسکراہٹ کا کیا مقصد ہے؟"

"آپ پریشان نہ ہوں بھائی' مجھے عادت ہے ان کے ایسے رویے کی۔" وہ اپنی وجہ سے اسفند کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اور ہاں تمہارا ایڈمیشن فارم جمع کروا دیا ہے میں نے' انٹرویو ڈیٹ بھی آ گئی ہے۔ تم پریشان نہ ہونا مہو! بابا جان کو میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مہو کے لیے یہ تسلی ہی کافی تھی کیونکہ کبھی کبھی بہت تھوڑا بھی بہت کافی ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ابھی وہ سو کر اٹھا ہی تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجی اسکرین پر اس کی ماں کا نام جگمگا رہا تھا۔ بادل نخواستہ اس نے فون اٹینڈ کیا۔

"جی فرمائیں۔"

"ارتضیٰ! تمہارا باپ تمہاری وجہ سے موت کے منہ تک پہنچ گیا ہے اور تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ تم اسپتال آکر ان کی خیر خیریت ہی معلوم کر لو۔" وہ ارتضیٰ کے فون اٹینڈ کرتے ہی پھٹ پڑی تھیں۔ اللہ نے پتا نہیں کس غلطی کی سزا دی ہے ہمیں جو تم جیسی اولاد دے دی۔"

"غلطی ان کی ہے۔ کیا ضرورت ہے میرے معاملات میں اتنا انوالو ہونے کی اور انہوں نے سارے نوکروں کے سامنے تھپڑ مارا مجھے' وہ احساس نہیں ہے آپ کو اور ہاں بتا دیجیے گا ان کو کہ میں یہ گھر چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا ان کو جانا ہے تو چلے جائیں شوق سے۔" ارتضیٰ کے ان زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کو سن کر فون کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا' فون کے ٹکڑے دیکھ کر انہیں لگا تھا کہ یہ ٹکڑے ان کے دل کے ہیں وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

☼ ☼ ☼

"مہو! پیکنگ ہو گئی تمہاری' جلدی چلو دیر ہو رہی ہے۔" اسفند اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"جی بھائی ہو گئی۔" وہ گاؤن پہن کر حجاب ٹھیک کر رہی تھی۔ "بھائی میں بابا جان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' آؤ میں کوشش کرتا ہوں۔" اور وہ جلدی سے اس کے پیچھے چل دی تھی۔ دو بار دستک دینے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اسفند نے بے چارگی سے مہو کی طرف دیکھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے مہو! تم دادا جان اور امی جان سے مل آؤ۔" وہ کہتا ہوا باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ مہو

بھی بوجھل دل کے ساتھ شاہ محل کی چوکھٹ عبور کر گئی تھی۔

"تمہارا لیٹ ایڈمیشن ہوا ہے تو سب سے پہلے کسی لڑکی سے نوٹس لے کر پچھلا کور کرنے کی کوشش کرنا اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ویک اینڈ پہ جب تم آؤ گی تو میں تمہیں سمجھا دوں گا۔" وہ جانتا تھا کہ مہو پریشان ہے اسی لیے اس کی توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کروانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے رونے میں مصروف تھی۔" فار گاڈ سیک مہو! بس کرو اب۔ میں نے کہا نا کہ بابا کو سمجھاؤں گا۔

اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو فوراً" مجھے فون کر دینا اور اچھے سے پڑھنا۔ وہاں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کوئی۔ بھی پرابلم ہو تم مجھے بتاؤ گی۔ پرامس۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا اور مہو نے محبت سے اپنے خوبرو بھائی کو دیکھا تھا جو اس کی فکر میں ہلکان ہو رہا تھا۔

دادا جان کی بات اس کی سمجھ میں اب آئی تھی کہ ہم سب کی زندگیوں میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی طرف سے ہمیشہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور خیر ہی کا کوئی عنصر ہماری زندگی میں شامل ہوتا ہے لیکن وہ اور بات ہے کہ ہم اس آنے والی خیر کا خیر مقدم کرتے ہیں یا اسی بات کی کھوج میں لگے رہتے تھے کہ ہمارے ساتھ بُرا کون کر رہا ہے۔ کون لوگ ہماری زندگیوں کو الجھا رہے ہیں اور مہو نے اس کے مضبوط ہاتھ کو تھاما اور خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ خدا نے اس کی زندگی میں اس ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کو شامل کیا تھا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔

اس کی توقع کے برعکس یونیورسٹی میں خاموشی تھی کیونکہ داخلے کے وقت کا رش اور شور اب ٹل چکا تھا اور مہو۔ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں" کی عملی تفسیر بنی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی ایک سیاہ کار اس کے قریب سے گزری اور کچھ دور جا کر رک گئی اس میں سے دو لڑکے برآمد ہوئے تھے۔ ایک لمبے بالوں والا لڑکا اسی سمت میں آ رہا تھا۔ جہاں مہو ساکت کھڑی تھی اور دوسرا آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھائے دور سے ہی اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔

"ایکسکیوزمی" اس نے حجاب اور عبایے میں ملبوس اس خوب صورت لڑکی کو مخاطب کیا جو شکل سے بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔"

"جی!" مہو نے فوراً" جواب دیا تھا۔

"کوئی پریشانی ہے آپ کو؟"

"جی وہ مجھے انگلش ڈپارٹمنٹ تک جانا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہاں ہے 'آج میرا فرسٹ ڈے ہے۔" مہو نے جلدی سے اپنی مشکل بتائی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں ہم لوگ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ۔" اور مہو اس کے پیچھے چل دی۔

"ارتضیٰ تو نہیں چلے گا؟" شیرو نے گاڑی کے پاس رک کر ارتضیٰ سے پوچھا جو بی ایم ڈبلیو کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"نہیں میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں تم جاؤ۔" وہ مہو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"آجانا یار! نہیں تو اس بڈھے پروفیسر کی غصے کی زیادتی کے باعث کی نس پھٹ جائے گی۔ شیرو نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا نا آجاؤں گا تو جا۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔ اور مہو کلاس کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر سر نے پوچھا وہ لیٹ کیوں آئی ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔

"مس یہ آگئی کلاس۔" اور وہ اپنے خیالوں سے چونکی تھی وہ اسے دروازے کے باہر چھوڑ گیا تھا۔ مہو نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھایا تھا۔

"سر! مے آئی کم ان؟"

ڈھلتی عمر کے پروفیسر نے خالصتاً" پروفیسرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"آئی ایم سوری سر! میرا لیٹ ایڈمیشن ہوا ہے۔"

"او کے مہرالنساء' سٹ ڈاؤن۔" اور وہ سب سے پچھلی کرسی پر بیٹھ گئی تب ہی اس کی نظر اپنی کلاس فیلو ہانیہ پر پڑی۔ جو اسے دیکھ کے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اور مہو کی جان میں جان آئی' اسے دیکھ کر اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنے سارے انجان چہروں میں کوئی تو شناسا چہرہ نظر آیا تھا۔

"خاور! آپ ارتضیٰ ملک اور شہریار خان کو بلا کے لائیں۔" پروفیسر صاحب نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا اور کچھ ہی دیر میں ارتضیٰ ملک اور شہریار عرف شیرو دونوں کلاس روم میں داخل ہوئے تھے۔

"جی شیرو صاحب! کیا ارادہ ہے آپ کا؟ آج دس دن بعد کلاس اٹینڈ کی وہ بھی بلاوے پہ اور تم ارتضیٰ ملک! اپنے باپ کی شرافت کا ہی لحاظ کرلو اور پڑھ لو کچھ۔" ساری کلاس کے سامنے اس عزت افزائی نے ارتضیٰ کا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا۔

"آپ کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے مجھے اور آئندہ میرے باپ سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دے رہا تھا۔ "اپنا منہ بند ہی رکھا کریں۔ یہ نہ ہو ہمیشہ کے لیے بند کرنا پڑے مجھے۔" وہ بغیر کسی ڈر اور خوف کے علی الاعلان دھمکی دے رہا تھا۔

تب ہی خاور اٹھا اور اس نے ایک زوردار طمانچہ ارتضیٰ کے منہ پر جڑ دیا تھا اور پھر تو ایسی ہاتھا پائی شروع ہوئی کہ سیکیورٹی کو بلانا پڑا تھا۔ مہو کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا اور ہانیہ جلدی سے اس تک پہنچی تھی جو زرد رنگت لیے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

"آر یو او کے' مہو؟"

"ہانیہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"اس ارتضیٰ کی تو عادت ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی پروفیسر یا طالب علم سے اس کا جھگڑا ہوتا ہے۔ پتا نہیں کتنے جنموں کا غصہ نکالتا ہے یہ یہاں آکر۔ تم چھوڑو ان کو' آؤ کینٹین چلتے ہیں۔" اور وہ غائب دماغی سے اس کے ساتھ چل دی تھی۔

* * *

"ہانیہ! یہ روز ایسے ہی جھگڑا کرتا ہے۔" وہ ابھی تک صبح والے جھگڑے کے زیر اثر تھی۔

"تو اور کیا؟" ہانیہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ "پر ہینڈسم کتنا ہے نا' ساری لڑکیاں مرتی ہیں اس کی بے خوفی اور خوب صورتی پہ اور دوسرا اس کے پاس پیسہ اتنا ہے کہ کھڑے کھڑے پورا شہر خرید لے۔" ہانیہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"استغفراللہ۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں' اتنے اِل مینرڈ۔ اللہ بچائے ایسی خوب صورتی اور امارت سے جو انسان کو انسان ہی نہ رہنے دے۔"

"اب ایسے تو نہ کہو۔ اتنا خوب صورت انسان ہے وہ۔" ہانیہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

"انسان وہ ہوتا ہے جو اشرف المخلوق ہونے کے تمام تقاضوں پر پورا اترے۔ یہ کیسا انسان ہے؟"

"بس کرو مہو یار! تم تو اس کے انسان ہونے پہ ہی شک کر رہی ہو۔"

اچھا چلو بس کرتے ہیں۔ سو جاؤ اب' صبح جلدی اٹھنا ہے۔" وہ بتی بند کرنے کے لیے اٹھی۔

✲ ✲ ✲

ارتضیٰ ملک پہ تو جنون سوار تھا کہ وہ خاور کے ٹکڑے کرکے کتے کے آگے ڈال دے۔ "اس کی ہمت کیسے ہوئی مجھے تھپڑ مارنے کی۔ میں بدلہ لے کر رہوں گا' دیکھ لینا تم۔" وہ شیرو کو مخاطب کرتے ہوئے غصے سے بولا تھا۔

"بس کرو یار! بدلہ لے تو لیا ہے تم نے اور انکل کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ اور کوئی پریشانی افورڈ نہیں کرسکتے تو چل کینٹین چلتے ہیں' غصہ تھوک دے یار۔" شیرو اس کا ہاتھ تھام کر کینٹین کی طرف چل دیا تھا۔

ادھر داخل ہوتے ہی اس کی سب سے پہلی نظر حجاب کیے بیٹھی مہو پہ پڑی تھی جو گلابی رنگ کے حجاب میں گلابی گالوں اور بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے نہایت خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ مہو

ہانیہ سے باتوں میں مصروف تھی۔

"چلو جی ایک اور ملانی کا اضافہ ہو گیا ہے ہماری کلاس میں۔"

"ارتضیٰ یار! ملانی ہے تو کیا ہوا! اس کی بیوٹی تو چیک کر ذرا۔"

"اوئے ارتضیٰ! تو یہاں ہے یار' ساری یونیورسٹی چھان ماری میں نے۔" وقار چلاتے ہوئے بولا تھا۔

"چل اب مل ہی گیا ہے تو سناؤں اپنی بریکنگ نیوز' وہ گل تھی نا۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"تھی کا کیا مطلب؟" ارتضیٰ نے سکون سے سوال کیا۔

"وہ یار' گل جب تو نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا نا تو اس نے سوسائیڈ کر لی۔" یہ سن کر پوری کینٹین میں سناٹا چھا گیا تھا۔

"اوہو۔ بہت افسوس ہوا۔" اس سناٹے کو ارتضیٰ کی تمسخر اڑاتی آواز نے توڑا تھا۔

"چل یار شیرو! اس کے جنازے میں چلتے ہیں۔"

"شرم کر ارتضیٰ! اتنی خوب صورت لڑکی تیری وجہ سے مر گئی۔" شیرو نے روہانسی آواز میں کہا تھا۔

"اچھا! تو اس لیے رو رہا ہے کہ تیری وجہ سے کیوں نہیں مری۔" ارتضیٰ نے اس کے افسوس کا مذاق اڑایا تھا۔

"وہ اپنی سو کالڈ محبت کی وجہ سے مری ہے' میں نے نہیں مارا اس کو جو تو یوں سیدھا سیدھا الزام لگا رہا ہے مجھ پر۔"

"جو بھی ہے ارتضیٰ' وجہ تو تم ہی تھے نا۔" وقار نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں میں ہی تھا' وجہ کر لو جو کرنا ہے تم دونوں کو۔" ارتضیٰ نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"اور ہاں' یہ میرا اور گل کا معاملہ تھا۔ وہ مر گئی معاملہ ختم۔ اب میں کوئی اور بات نہیں سننا چاہتا بس۔" وہ اپنی بات ختم کر کے رکا نہیں تھا اور کینٹین میں بیٹھے تمام لوگوں کے دل ارتضیٰ کی سفاکیت نے ہلا کر رکھ دیے تھے۔ مہو فق رنگت لیے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

"او مائی گاڈ! ہانیہ تم اس شخص کی تعریفوں میں ہلکان ہو رہی تھیں۔" "جس میں احساس اور خلوص نام کی کوئی چیز نہیں اور مجھے سب سے زیادہ حیرت تو ان بے وقوف لڑکیوں پر ہوتی ہے۔ انہیں جب پتا ہے کہ مرد کی فطرت کیا ہوتی ہے پھر بھی وہ باز نہیں آتیں۔"

"یار مہو! گل کو محبت تھی ارتضیٰ سے۔" وہ گل کی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"محبت بہت وسیع معنی رکھتی ہے یار! کسی ایک خاکی پتلے کے پیچھے اپنی زندگی تیاگ دینا کہاں کی محبت ہے اور جو اپنے آپ سے محبت نہ کر سکے' وہ کسی اور سے کیا محبت کرے گا۔" مہو نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"اتنا برا بھلا مت کہو۔ اگر تمہیں محبت ہو گئی نا تو پھر دیکھنا۔" ہانیہ اسے ڈراتے ہوئے بولی تھی۔

"محبت اور مہرالنساء شاہ کو؟ یہ تو مرتے دم تک نہیں ہو سکتا۔" اور ارتضیٰ جو میز پہ چابیاں بھول گیا تھا اور واپس لینے آیا تھا۔ اس نے مہو اور ہانیہ کی تمام باتوں کو غور سے سنا تھا۔ ارتضیٰ نے مہو کی بات کو چیلنج کی طرح قبول کر لیا تھا۔

کینٹین سے فارغ ہو کر مہو سیدھی لائبریری پہنچی تھی کیونکہ اسے کچھ نوٹس بنانے تھے۔

"مہو میں ہاسٹل جا رہی ہوں۔ تم اپنا کام ختم کر کے آ جانا۔" ہانیہ اسے لائبریری میں چھوڑ کر خود چلی گئی۔ وہ تن دہی سے نوٹس بنانے میں مصروف تھی جب ارتضیٰ ملک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ارے آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ بے تکلفی سے بولتا ہوا اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

"جی آپ کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے؟" مہو نے ٹھنڈے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ آپ کو ایک پارٹی کی دعوت دینی تھی۔"

"سوری میں نہیں آ سکوں گی۔" وہ جواب دے کر پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔

"کیا مطلب نہیں آئیں گی؟ آپ کو ویلکم کہنے کے

لیے پارٹی ارینج کی گئی ہے۔ آپ کے اعزاز میں پارٹی ہے اور آپ ہی نہیں آئیں گی تو کیا خاک مزہ آئے گا۔" ارتضٰی نے خلاف عادت طویل بات کی تھی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف مت کریں۔ شکریہ۔" وہ کہہ کر رکی نہیں اور ارتضٰی خباثت سے مسکرایا۔

"اب آئے گا مزہ۔ خود کو حلوے کی طرح پیش کرنے والی لڑکیوں میں کیا مزہ ہے بھلا۔۔۔"

وہ بھاگم بھاگ ہاسٹل پہنچی تھی تاکہ ہانیہ کو بتا سکے لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ہانیہ فون پر مصروف تھی۔

"آپ فکر نہ کریں پاپا میں ٹھیک ہوں۔ آپ خوامخواہ ٹینشن لے رہے ہیں۔ بہت اچھا ماحول ہے۔ پیسے بہت ہیں پاپا' جب کچھ چاہیے ہوگا میں خود بتا دوں گی۔ آپ خود سے کچھ مت بھیجئے گا۔" ہانیہ کی آواز نے مہو کے قدم جکڑ لیے تھے۔ کاش! کبھی اس کا باپ بھی پوچھے کہ مہو مر گئی یا زندہ ہے۔ اس کی یہ حسرت آنسوؤں کی صورت بہنے لگی تھی تب ہی بیگ میں پڑا اس کا سیل فون بج اٹھا۔ گھر کے لینڈ لائن نمبر سے فون تھا۔ اس نے فوراً" آنسو صاف کرتے ہوئے فون اٹینڈ کیا۔

"السلام علیکم دادا جان!"

"وعلیکم السلام' دادا کی جان مہو! تم تو وہاں جاکر بھول ہی گئی ہو اپنے بوڑھے دادا کو۔" مہو کے سلام کرتے ہی وہ محبت سے شکوہ کر رہے تھے اور مہو کے آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے تھے اور اس نے بہتے آنسوؤں سے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ جب بھی وہ ناشکری کے کسی راستے پر پہلا قدم رکھتی ہے' خدا اسے پھر سے شکر کے راستے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

"مہو کیا ہوا ہے؟" اس کی چپ نے دادا جان کو تشویش میں مبتلا کیا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں ہوا اور آپ نے میرے دادا جان کو بوڑھا کیوں کہا؟ میرے دادا جان تو دنیا کے سب سے زیادہ ہینڈسم دادا جان ہیں۔" مہو نے لاڈ سے کہا۔

"دادا جان' آپ سب لوگ بہت یاد آرہے ہیں۔ سب ٹھیک تو ہیں نا۔"

"ہاں سب تو ٹھیک ہیں بس میرا دن نہیں گزرتا تمہارے بغیر۔"

"اس کا مطلب ہے اسفند بھائی آپ کا خیال نہیں رکھ رہے۔" وہ تفتیش سے بولی تھی۔

"نہیں اسفند بہت خیال رکھتا ہے میرا' بس بات یہ ہے کہ اگر اللہ دل میں سب کے لیے ایک جیسی محبت ڈال دے تو پھر تو دنیا میں کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔"

"جی دادا جان جس اللہ نے آپ کے دل میں میری محبت پیدا کی وہ بابا کے دل میں بھی تو کر سکتا تھا نا' لیکن ایسا نہیں ہے۔" وہ افسردگی سے بولی تھی۔

"ہاں مہو ایسا نہیں ہے۔ اچھا مہو' کل اسفندیار آئے گا تمہیں لینے۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

"چلو اللہ حافظ۔" سرفراز شاہ کے دل مہو کی افسردگی نے بوجھل کر دیا تھا اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مہو کو اصل وجہ بتا دیں گے ہے۔ تو کٹھن مرحلہ' لیکن کرنا پڑے گا اور سرفراز شاہ کے آنسو یہ سوچ کر ہی بہنے کو تیار تھے کہ ان کی بیٹی کا گناہ اب مہو کو بھی پتا چل جائے گا۔ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے اپنی اولاد کے عیبوں کی وضاحت کرنا۔۔۔

"کیا ہوا مہو سب ٹھیک ہے نا۔" ہانیہ نے مہو کی روئی روئی آنکھوں کو تشویش سے دیکھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔ بس دادا جان بہت اداس ہیں' کہہ رہے تھے کل اسفند بھائی آئیں گے مجھے لینے۔"

"مہو یار تم کتنی خوش قسمت ہو نا' تمہارا بھائی کتنا خیال رکھتا ہے تمہارا' ہر روز فون کر کے پوچھتا ہے۔ تمہیں لینے بھی آرہا ہے اور ایک میرا بھائی ہے' اپنے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اس کو یاد ہی نہیں کہ کوئی بہن بھی ہے اس کی۔" ہانیہ دکھ سے بولی تھی۔

"لیکن تمہارے پاپا اتنا خیال تو رکھتے ہیں تمہارا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بہن بھائیوں کی باٹنڈنگ زیادہ ضروری ہوتی ہے۔" اور مہو یہ سوچ کر حیران ہوئی تھی کہ جس محبت کے نہ ملنے کی وجہ سے مہو کی جان نکلنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ ہانیہ کے لیے وہ ضروری بھی نہیں ہے۔ اس کو وہ چاہیے جو مہو کی نظر میں غیر ضروری ہے اور اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ ہم کبھی بھی اپنے حصے کی مل جانے والی محبت پر راضی نہیں ہوتے۔ ہم ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ خواہش آدم کی مٹی میں ملادی گئی ہے۔۔۔

✿ ✿ ✿

وہ گھر پہنچی تو سرفراز شاہ اور صباحت بیگم شدت سے اس کے منتظر تھے اور شیراز شاہ اس کے آتے ہی کہیں باہر چلے گئے تھے اور رات کے آٹھ بجے تک بھی ان کے لوٹنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی جب افضل نے یہ پیغام دیا کہ اسے دادا جان بلا رہے ہیں۔

"جی دادا جان بلایا آپ نے۔" اس نے کمرے کے دروازے میں رک کر پوچھا تھا۔

"ہاں مہو! آؤ اندر آجاؤ' بیٹھو۔" اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے مہو۔" سرفراز شاہ لرزتی ہوئی آواز میں بولے تھے اور مہو کرسی سے اٹھ کر ان کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے دادا جان کوئی پریشانی ہے کیا؟" مہو نے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے تشویش سے پوچھا تھا۔

"ہاں مہو پریشانی ہے' مسلسل پریشانی' سلسلہ وار اذیت۔" وہ دکھ سے بولے۔

دادا جان نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ تمام حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ "اور اسی دن سے شیراز شاہ کو بیٹیوں سے نفرت ہوگئی۔ وہ کہتا ہے بیٹیاں محبت کی لاج نہیں رکھتیں وہ میری بیٹی کے گناہ کی سزا اپنی بیٹی کو دے رہا ہے' میں معافی مانگتا ہوں مہو تم سے اپنی بیٹی کی طرف سے' میری بیٹی کی وجہ سے تمہارے حصے میں اذیت آئی۔" معاف کر دینا۔ مگر اس کو کوئی بددعا مت دینا مہو میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔" مہو نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں دادا جان آپ ایسے مت کریں پلیز۔ آپ گلٹی فیل مت کریں۔ آپ کا کیا قصور ہے بھلا۔ آپ اپنی مہو کو جانتے ہیں' وہ کبھی کسی کو بددعا نہیں دے سکتی۔" پھر وہ سرفراز شاہ کے گلے لگ کر اپنے اور ان کے مشترکہ دکھ پہ بے تحاشا روئی

✿ ✿ ✿

اگلے دن یونیورسٹی جاتے ہوئے اس کا دل بوجھل تھا۔ لیکن اسے جانا تو تھا ہی کیونکہ پہلے ہی بہت حرج ہوچکا تھا اس کا۔ یونیورسٹی پہنچتے ہی یہ بری خبر اس کی منتظر تھی کہ ہانیہ واپس نہیں آئی۔ ابھی اس کی کلاس میں وقت باقی تھا اور وہ یونیورسٹی کے لان کے نسبتاً پرسکون گوشے میں بیٹھ گئی تھی۔ تب ہی ارتضیٰ ملک اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا۔ وہ اسے دور سے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا تھا۔ مہو رو رہی تھی۔

مہو کے آنسو دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا تھا۔

"کیا ہوا مہرالنسا؟" اس کی تشویش میں ڈوبی آواز نے مہو کو چونکا دیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے فوراً اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر کچھ نہیں ہوا تو آپ رو کیوں رہی ہیں؟ کسی نے بدتمیزی کی ہے تو بتائیں۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی اور ارتضیٰ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ دیکھ کر مسکرایا۔

"آپ اتنا گھبراتی کیوں ہیں مجھ سے؟" ارتضیٰ نے جاتی ہوئی مہو کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا

اور اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ارتضیٰ نے حجاب کے ہالے میں موجود اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ روئی روئی آنکھوں اور سرخ پڑتی ناک کے ساتھ وہ بے انتہا خوب صورت نظر آ رہی تھی۔

"مجھے جانے دیں پلیز' راستہ چھوڑیں۔"

"اوکے میم! جائیے اور ہاں آئندہ کسی کے سامنے مت روئیے گا۔ کوئی ہلاک ہو گیا تو آپ ہی ذمہ دار ہوں گی۔" اور مہو اس کے راستے سے ہٹ جانے کا شکر ادا کرتی ہوئی بھاگی تھی۔ ارتضیٰ کے قہقہے نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

"اوئے تو کمینوں کی طرح یہاں کھڑا ہنس رہا ہے اور ہم تجھے ہاسٹل میں ڈھونڈ رہے تھے۔" شیرو دور سے دیکھ کر ہی چلایا تھا۔

"اور ہائے داوے یہ مہرالنسا سے کیا باتیں کر رہا تھا تو؟" وقار نے رازدانہ انداز میں ارتضیٰ سے پوچھا تھا۔

"ویسے ایک بات صاف صاف سن لے اور سمجھ بھی لے کہ یہ لڑکی تیرے چکر میں آنے والی نہیں۔"

ارتضیٰ کو تو آگ ہی لگ گئی تھی۔ "کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟"

"تم میں وٹامن جی بھی کی کمی ہے۔ یعنی گڈ کیریکٹر اور اسے دیکھ کر یہ ہی لگتا ہے کہ اسے اچھے کردار کے لوگ پسند ہیں۔" وقار نے اسے آئینہ دکھایا۔

"یہ لڑکیاں اوپر سے کچھ ہوتی ہیں اور اندر سے وہی ایک جیسی' پیسے پہ مرنے والی۔" ارتضیٰ نے غصے سے کہا۔

"اچھا چل پھر اس کو سیٹ کر کے دکھا۔" وقار نے چیلنج کیا تھا اور ارتضیٰ ملک کوئی چیلنج چھوڑتا نہیں تھا۔

"اور اگلے مہینے کی ٹھیک اسی تاریخ کو وہ لڑکی میرے ساتھ فارم ہاؤس جانے پر تیار نہ ہو تو کہنا۔" وہ کہہ کر خباثت سے ہنسا۔

"دیکھ لے ارتضیٰ! بہت بڑا کام ہے یہ۔" وقار نے اسے باز رکھنا چاہا تھا۔

"تم جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ہو گا بڑا کام ارتضیٰ ملک کے لیے سب کچھ آسان ہوتا ہے۔"

"اور اگر تو یہ نہ کر سکا تو پھر جو میں کہوں گا وہ تو کرے گا۔" وقار نے ارتضیٰ کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "کیوں شیرو۔"

"دفع کرو یار! کس غلط کام میں پڑ رہے ہو۔ ارتضیٰ! کچھ نہیں کرے گا تو اس معصوم لڑکی کے ساتھ۔" شیرو نے غصے سے کہا تھا۔

"اب ارتضیٰ ملک پیچھے نہیں ہٹے گا اور تو بھی کر لینا عیش اس کے ساتھ۔ اتنا غصہ کیوں دکھا رہا ہے۔"

"دفع ہو جاؤ ارتضیٰ تم تو۔" شیرو کی نظروں میں مہو کا سراپا گھوما تھا جس کو دیکھ کر نظر آپ ہی عزت سے جھک جاتی ہے۔ شیرو اسے پرے دھکیلتے ہوئے واک آؤٹ کر گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ کینٹین میں بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ جب وہ دوبارہ اس کے سامنے آیا تھا۔ وائٹ شرٹ اور بلیو جینز میں بازو کہنیوں تک فولڈ کیے ہوئے وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ بلاشبہ اللہ کی بہترین تخلیق تھا۔ وہ اس کے برابر والی خالی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔

"کیسی ہیں مہرالنسا آپ؟" اس کے بیٹھتے ہی مہو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے آپ کہاں جا رہی ہیں۔ بیٹھئے نا پلیز' مجھے بس آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پھر ڈسٹرب نہیں کروں گا پلیز۔" اور مہو نے سوچا' روز روز ڈر کر بھاگنے سے بہتر ہے اس کی ضروری بات ابھی سن لی جائے۔

"جی فرمائیں۔" وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں۔" وہ کہنیاں میز پہ رکھ کر آگے ہوتے ہوئے بولا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں' میں صرف اس لیے بات

نہیں کرنا چاہتی آپ سے کیوں کہ میں اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ بات ختم۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا۔

"بات ختم نہیں ہوئی مس مہرالنسا! شروع ہوئی ہے' میں بس سب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کیا میرا محبتوں پہ کوئی حق نہیں ہے۔ سب مجھے غلط سمجھتے ہیں۔ کبھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں ایسا کیوں ہوں اور غلط ہمیشہ وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ غلط ہوا ہو۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ میرا رویہ غلط ہوتا ہے پر کوئی اس رویے کے پیچھے چھپی محرومی کو نہیں سمجھ سکتا۔" اس نے رک کر مہو کا چہرہ دیکھا تھا جو بے توجہی اس کی بات سن رہی تھی۔ "میں چار سال کا تھا جب میرے والدین کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔" اور مہو جو بے توجہی سے اس کی بات سن رہی تھی ایک دم چونکی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

"اوہ سو سیڈ۔" بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا

"پھر میرے ابا کے ایک کزن مجھ پر رحم کھا کر اپنے ساتھ لے گئے' مگر ان کی بیگم مجھے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھیں' لیکن اپنے میاں کو انکار نہ کر سکیں اور پھر ان کی تمام ناپسندیدگی مجھے سہنی پڑی ان کے گھر کی کسی چیز پہ میرا حق نہیں تھا ان کے بچے ہمیشہ مجھے یہ احساس دلاتے کہ میں ان کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ ان کے بڑے بیٹے نے چوری کی اور الزام مجھ پر لگا دیا اس دن میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔" دھیمے لہجے اور آنکھوں میں آنسو لیے اپنی زندگی کی تلخ حقیقت سنا تا وہ مہو کو کوئی اور ہی ارتضٰی لگا تھا یہ وہ اکھڑ اور بد مزاج ارتضٰی تو لگ ہی نہیں رہا تھا۔

"پھر میں نے ورکشاپس اور مختلف جگہوں پر چھوٹے موٹے کام شروع کیے اور اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے جس کے کندھے پر سر رکھ کر رو سکتا۔ میری زندگی رشتوں سے بالکل خالی ہے۔" اس نے چپ ہو کر اپنے آنسو صاف کیے تھے۔ مہو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کہے۔ اچانک اسے گل یاد آئی تھی۔

"گل کے ساتھ تو تھا نا آپ کا رشتہ پھر کیوں ختم کیا آپ نے؟" ارتضٰی کو توقع نہیں تھی کہ وہ سوال کرے گی۔

"میں گل کو صرف اپنی اچھی دوست سمجھتا تھا لیکن وہ بہت غلط سمجھ بیٹھی میری دوستی کو۔ میں ابھی یہ شادی والی ذمہ داری افورڈ نہیں کر سکتا تھا سو میں نے انکار کر دیا تو اس نے اپنی زندگی ختم کر لی۔ اس بات میں بھی سب مجھے قصوروار سمجھتے ہیں۔" ارتضٰی نے تفصیلاً وضاحت کی۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" مہو نے ایک اور سوال داغا۔

"وہ اس لیے کہ جب بھی میں آپ کے سامنے آتا ہوں' آپ گھبرا جاتی ہیں اور ڈرتی ہیں مجھ سے' آپ کے اس طرح ڈرنے سے میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہوں۔ میں بس یہ کلیئر کرنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا آپ یقین کر رہی ہیں نا میری بات کا.....؟"

"جی' لیکن آپ کس کس کو وضاحتیں دیتے پھریں گے۔ آپ کم از کم ٹیچر کے ساتھ تو اپنا رویہ بہتر کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے آپ کے لیے۔" مہو نے رسانیت سے ارتضٰی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"جی میں کوشش کروں گا اینڈ تھینکس مہرالنسا۔ میری بات سننے کے لیے۔" وہ آنکھوں میں تشکر لیے بولا تھا۔

"اٹس او کے۔ میں چلتی ہوں اب کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

اور مہرالنسا نے سوچا تھا کہ بظاہر پرسکون نظر آنے والے چہروں کے پیچھے درد کی کتنی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔

دوسری طرف ارتضٰی نے سوچا تھا' شکر ہے بے

وقوف لڑکی ہے۔ یقین کر ہی لیا ہوگا میری رام کہانی کا۔ اب یہ ہمدردی محسوس کرے گی اور پھر آہستہ آہستہ محبت۔ وہ کیا کہتے ہیں "ہولے ہولے ہو جائے گا پیار" وہ گنگناتے ہوئے کلاس کی طرف چل پڑا تھا۔

اگلے دن اس نے مہو کو وہ سارے نوٹس لا دیے تھے جن کو بنانے کے لیے اسے گھنٹوں یونیورسٹی میں بیٹھنا پڑتا تھا۔

"تھینکس ارتضیٰ۔" مہو نے تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"اس میں شکریہ والی کیا بات ہے؟ اب تو ہم دوست ہیں نا اور دوستوں میں سوری اور تھینکس نہیں ہوتا۔" وہ حد درجہ بے تکلفی سے بولا تھا اور مہو حیران تھی کہ وہ اس کی دوست کب سے بن گئی؟ لیکن وہ خاموش رہی تب ہی ہانیہ وہاں پہنچی اور ایک خاموش نظر ارتضیٰ پہ ڈال کر وہ مہو کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔

"یہ تم کیا راز و نیاز کر رہی ؟" ہانیہ نے بینچ پر بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔

"شرم کرو ہانیہ! میں بھلا کیا بات کروں گی وہ خود ہی یہ نوٹس دینے آیا تھا اور جیسا تم اس کو سمجھتی ہو نا ایسا نہیں ہے وہ۔" اور مہو نے "الف" سے "یے" تک ساری کہانی ہانیہ کو بتادی تھی۔

"پھر بھی بچ کر رہنا اس خوب صورت جن سے' پتا ہے' کیسے دیکھتا ہے وہ تمہیں۔" ہانیہ نے مہو کو متنبہ کیا تھا۔

"حد ہوتی ہے ہانیہ بدگمانی کی۔" اور پھر تو جیسے ارتضیٰ کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روز کسی نہ کسی بہانے مہو اور ہانیہ کے پاس آ بیٹھتا اور وہ تینوں ادھر ادھر کی باتوں میں بہت سا وقت گزار دیتے....

✡ ✡ ✡

"مہو آج فنکشن ہے یار! اپنا کوئی ڈریس ہی دے دو۔ تمہارے تو اتنے خوب صورت ڈریسز ہوتے ہیں تم نے تو گاؤن ہی پہننا ہے نا...."

"لے لو جو لینا ہے۔ ہر وقت نددیدی ہی بنی رہتی ہو۔"

ہانیہ نے جلدی سے مہو کی واڈروب کھولی' سفید رنگ کی خوب صورت فراک پر ہانیہ کی نظر جم سی گئی تھی۔

"یار مہو یہ اتنا لمبا فراک ہے پہن لو اور حجاب کرلینا' گاؤن پہننا ضروری تو نہیں ہے اور ویسے بھی ادھر کون سا تمہارے ابا آرہے ہیں۔"

"نہیں ہانیہ! میں گاؤن میں زیادہ کمفرٹیبل فیل کرتی ہوں۔"

"میں دیکھتی ہوں' کیسے نہیں مانتیں تم میری بات۔" ہانیہ نے دبنگ لہجے میں کہا تھا اور پھر مہو کو ہانیہ کی بات ماننا ہی پڑی۔ پیروں کو چھوتے ہوئے لمبے' نگینوں سے جڑے فراک میں مہو نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود ہانیہ نے اس کا میک اپ کیا تھا۔ آخر کار اسے ہانیہ کو باہر دھکا دینا پڑا تھا اور وہ اپنا حجاب سیٹ کرکے باہر آئی تھی اور اب وہ پوری یونیورسٹی میں ہانیہ کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ پوری یونیورسٹی میں چہل پہل تھی۔

وہ فراک کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب خاور نے اس کا راستہ روکا تھا۔

"ارے واہ! آج تو آپ کا قتل کرنے کا ارادہ ہے۔" وہ آگے ہوتے ہوئے شوخی سے بولا اور مہو کی جان نکل گئی۔

"پلیز راستہ چھوڑیں۔" وہ منمنائی تھی۔

"اور اگر نہ چھوڑوں تو...." وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور مہو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے' ہاتھ چھوڑیں میرا۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔

"خاور! ہاتھ چھوڑو مہو کا۔" ارتضیٰ نے دور سے صورت حال بھانپتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"کیوں تو ماما لگتا ہے اس کا۔" اور ارتضیٰ کے تن بدن میں آگ لگی تھی وہ شیر کی طرح خاور پہ جھپٹا تھا۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی مہو کو ہاتھ لگانے کی' ہاتھ توڑ دوں گا تمہارے۔" اور ان کی ہاتھا پائی سے مہو کی رہی سہی جان بھی نکل گئی تھی۔ ارتضیٰ کے زوردار گھونسے سے خاور بے جان ہو کر گرا تھا۔

"بس کرو ارتضیٰ! مر جائے گا یہ۔" بہت دیر بعد مہو کی سمجھ میں آیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے غصے سے بے قابو ہوتے ارتضیٰ کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"ارتضیٰ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے چھوڑ دو اس کو۔" اور ارتضیٰ نے ایک نظر روتی ہوئی مہو کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تھا اور فوراً پیچھے ہٹا تھا۔ مہو نے ارتضیٰ کو بازو سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹا تھا اور وہ خاموشی سے روتی ہوئی مہو کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ مہو نے ابھی تک زور سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ چھوڑ دے گی تو وہ پھر وہی حرکت کرے گا۔ ارتضیٰ بھی کسی ٹرانس کی کیفیت میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ جب کسی نے بہت زور سے ارتضیٰ کے سر میں کوئی چیز ماری تھی اور مہو کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹا اور وہ دور جا کر گرا۔

"ارتضیٰ۔" مہو کی چیخ نے سب کو رکنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔ اپنی لمبی فراک کی وجہ سے وہ گرتے گرتے بچی تھی۔

"آنکھیں کھولو ارتضیٰ۔ پلیز آنکھیں کھولو۔" ارتضیٰ کے سر سے فوارہ کی طرح نکلتے خون نے مہو کے سفید دامن کو داغ دار کر دیا تھا۔ تمام لوگوں نے حیرت سے پاگلوں کی طرح روتی ہوئی مہو کو دیکھا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے' لیکن وہ ابھی تک وہی لباس پہنے بیٹھی تھی۔

"مہو مہو کپڑے بدل لو۔" اس نے سکتے کی کیفیت میں بیٹھی مہو سے کہا تھا تب ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ہانیہ! وہ میری وجہ سے مشکل میں ہے۔ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ تم نے دیکھا اس کے سر سے کتنا خون بہہ رہا تھا۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔

ہانیہ' دعا کرو اسے کچھ نہ ہو' پلیز تم دعا کرو۔ میری تو قبول نہیں ہوتی۔" اور ہانیہ پریشانی سے مہو کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ارتضیٰ کی چوٹ کا دکھ تو مجھے بھی ہے' لیکن یہ مہو کو کیا ہوا ہے؟

"او کے مہو میں دعا کروں گی۔ تم کپڑے بدل لو اور ریلیکس ہو جاؤ۔ خواہ مخواہ اتنی ٹینشن لے رہی ہو۔"

"وہ اتنی اذیت میں ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ خواہ مخواہ' ہانیہ کسی سے پوچھو اس کی حالت کیسی ہے اب؟"

"او کے مہو میں شیرو کو فون کر کے پوچھتی ہوں تم فکر مت کرو۔ یہاں سگنل نہیں آ رہے ہیں۔ باہر جا کر بات کرتی ہوں۔ تم کپڑے بدل لو اتنی دیر میں۔" ہانیہ نے مہو کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"شیرو سے بات ہوئی ہے میری۔ اس نے بتایا کہ خون بہت بہہ گیا تھا' لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" مہو نے سکون کا سانس لیا تھا اور اب وہ شکرانے کے نفل ادا کر رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں مہو۔" ہانیہ نے جائے نماز کے پاس بیٹھتے ہوئے مہو کو مخاطب کیا۔

"پوچھو۔"

"تمہیں ارتضیٰ سے محبت تو نہیں ہو گئی؟" ہانیہ کے سوال پوچھتے ہی مہو کو ہنسی کا شدید دورہ پڑا تھا پھر ہنستے ہنستے وہ رونے لگی تھی۔

"میری زندگی میں محبت کی گنجائش نہیں نکلتی ہانیہ اور نہ ہی مجھے محبت کرنے کی اجازت ہے۔" مہو نے سرخ ہوتی ہوئی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو پونچھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"محبت کو ہماری زندگی میں شامل ہونے کے لیے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے مہو یہ تو اتنی ال مہنرڈ ہے کہ دستک دیے بغیر ہی دل کے نہاں خانے میں گھسی چلی آتی ہے اور ایسی شاطر کہ دل میں بیٹھتے ہی دماغ کو اپنے بس میں کرنا جانتی ہے۔" ہانیہ نے مہو کو کہا۔

www.urdusoftbooks.com

"ڈراؤ مت مجھے ہانیہ! مہرالنساشاہ کو محبت نہیں ہو سکتی' کبھی بھی۔" اور پھر ساری رات اس نے کسی تسبیح کی طرح اس بات کا ورد کیا تھا کہ مہرالنساشاہ کو محبت نہیں ہو سکتی۔

☆ ☆ ☆

"شیرو! میں کہہ رہا ہوں نا ڈاکٹر سے بات کر' مجھے کل یونیورسٹی جانا ہے۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ اتنا گہرا زخم ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ یونیورسٹی جانا ہے' تمیز سے لیٹ ادھر۔" شیرو نے ارتضیٰ کی بات سن کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو سمجھ نہیں رہا۔ پلیز بات کر کے دیکھ ڈاکٹر سے۔" ارتضیٰ نے شیرو کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا جس کو ساری رات نیند والی دواؤں کے زیر اثر بھی مہو کی روتی ہوئی آنکھیں ڈسٹرب کرتی رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں اس کو کس بات کی جلدی ہے۔" وقار نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان کی گفتگو سنتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"یار! کل لاسٹ ڈیٹ ہے نا ہماری شرط کی اور یہ جلد از جلد مہو تک پہنچنا چاہتا ہے تاکہ شرط جیت سکے۔" وقار نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو وقار۔" ارتضیٰ نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں بند کروں بکواس۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔" وقار نے کہا تھا۔

"ہاں ہے مجھے جلدی مہو تک پہنچنے کی اور اسے فارم ہاؤس لے جانے کی' اب تو دفع ہو جا یہاں سے۔" ارتضیٰ غصے میں بھڑکتا ہوا بولا تھا۔

"دیکھا شیرو! کیا کہا تھا میں نے اسے اور کیا جلدی ہو سکتی ہے بھلا۔" وقار تاسف سے کہتا ہوا کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ جب دھاڑ سے دروازہ کھول کر ہانیہ داخل ہوئی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا کہ تمہارا اصلی چہرہ سامنے آ گیا۔ اس کی اچھی نیت نے اس کو بچا لیا۔" اور ارتضیٰ گھبرا کے کھڑا ہوا۔

"میری بات سنو! ہانیہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ مذاق کر رہا تھا۔"

"ایک لفظ اور مت کہنا ارتضیٰ۔" وہ غرائی اور الٹے قدموں واپس بھاگی تاکہ محبت کی اذیت میں پنڈولم کی طرح جھولتی مہو کو ایک جھٹکے سے نکال باہر کرے۔ مہو کے مسلسل زبانی انکار کے باوجود وہ اس کے دلی اقرار کو جان چکی تھی۔ وقار نے شرط ہار جانے کی ڈر سے سب کچھ ہانیہ کو بتا دیا تھا۔۔۔ "ہانیہ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا۔" مہو سرسراتی آواز میں بولی تھی۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا مہو! میں وقار کے کہنے پر وہاں گئی تھی۔ اس نے باقاعدہ شرط لگائی تھی کہ وہ تمہاری عزت تار تار کر کے دکھائے گا۔"

اور مہو اس کی بات سنتے ہی وہیں ڈھے سی گئی تھی۔

"ہانیہ! اگر ایسا ہو جاتا تو میں کیا منہ دکھاتی اپنے دادا جان کو۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہانیہ ہمیشہ میرے ساتھ کیوں برا ہوتا ہے۔ کیوں؟" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ محبت آتش فشاں کے لاوے کی طرح اس کے دل میں پھٹ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا ہو گیا شیرو! وہ مہو کو بتا دے گی سب کچھ اسے رو کو کچھ کرو میں مر جاؤں گا۔ اس کی نظروں سے گر کر' شیرو پلیز کچھ کرو' تم فون کرو ہانیہ کو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ بہت پاکیزہ ہے۔ میں اسے بے عزت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" ارتضیٰ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔ آنکھیں ضبط کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ارتضیٰ۔" شیرو حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں! یار یقین کر میرا میں مانتا ہوں کہ

پلان میں نے بنایا تھا لیکن اس کی معصومیت اور پاکیزگی نے میری کایا پلٹ دی یار! مجھ جیسے وحشی کو اس نے انسانوں کی فہرست میں کھڑا کر دیا' مگر اب سب ختم ہو گیا۔" وہ بے بسی کے احساس سے رو دیا تھا اور وقار نے حیرانی سے روتے ہوئے ارتضیٰ کو دیکھا۔

✡ ✡ ✡

رات کے ایک بجے مہو شدید بخار میں جل رہی تھی۔ ہانیہ نے آخری حل یہی سوچا کہ وہ اس کے گھر فون کر دے۔ اس نے لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا تھا ۔ تیسری بیل پر فون اٹھایا گیا تھا۔

"ہیلو! اسفند بھائی بات کر رہے ہیں؟" ہانیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں' شیراز شاہ بات کر رہا ہوں' آپ کون؟" شیراز شاہ نے ہانیہ سے پوچھا۔

"جی میں ہانیہ بات کر رہی ہوں۔ مہو کی دوست۔"

"جی فرمائیں۔" شیراز شاہ نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ دراصل مہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا مہو کو۔" وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

"اچھا میں ابھی آ رہا ہو آپ خیال رکھیے گا مہو کا۔" شیراز شاہ مہو کو فوراً اسپتال لے کر پہنچے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کب تک ہوش آ جائے گا؟ آخر ہوا کیا ہے' کچھ پتا تو چلے۔"

"کسی شاک کی وجہ سے بے ہوش ہیں۔ جلد ہی ہوش آ جائے گا شاہ جی! آپ پریشان نہ ہوں۔"

ڈاکٹر نے شیراز شاہ کو تسلی دی تھی۔ اور وہ پھر سے مرجھائی ہوئی مہو کے سرہانے بیٹھ گئے تھے۔ پہلی بار ان کے ہاتھ مہو کے لیے اٹھے تھے وہ اپنے آنسو روک نہیں پائے تھے اور روتے روتے مہو کا بے جان ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا اور محبت کی نمی سے مہو نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کچھ پل لگے تھے اسے صورت حال کو سمجھنے میں۔ وہ اپنے باپ کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"بابا۔" بہت مشکل سے اپنی تمام تر ہمت کو جمع کر کے اس نے آواز دی۔ اور وہ بے قراری سے آگے بڑھے۔

"جی بابا کی جان۔" اور پھر وہ ان کے سینے سے لگی شدت سے رو دی۔ اور مہو نے ایک بار پھر اپنی ناشکری کا ماتم کیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"یہ کوئی طریقہ ہے بھلا' بتا کر جاتا تو کون سا میں نے روک لینا تھا۔" گھر میں سرفراز شاہ کی غصے اور پریشانی سے بری حالت تھی کیوں کہ شیراز شاہ گھر میں کسی کو بتائے بغیر مہو کے پاس چلے گئے تھے اور فون بھی اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ تب ہی انہیں گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور وہ تیزی سے باہر بھاگے۔ ان کے اٹھتے قدم ٹھٹک کر رکے تھے۔ شیراز شاہ بیٹی کو بازو کے حلقے میں لیے ان ہی کی طرف آ رہے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں بابا جان آپ کا فون اٹینڈ کر سکا۔ وہ دراصل مہو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو۔۔۔"

"کیا ہوا مہو کو۔" سرفراز شاہ نے شیراز شاہ کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

"آپ کو ہی بتائے گی۔ مجھے تو نہیں بتایا اس نے۔" شیراز شاہ نے کہا۔

"دادا جان مجھے آرام کرنا ہے۔" مہو نے بمشکل آواز نکالی۔

"ہاں ہاں' چلو اندر۔ آپ جائیں بابا جان۔ میں اپنی بیٹی کے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔" اور سرفراز شاہ ہکا بکا کبھی شیراز شاہ کو دیکھ رہے تھے اور کبھی مہو کے بے جان سے وجود کو۔

✡ ✡ ✡

اگلے دن وہ اپنے زخم کی پرواہ کیے بغیر یونیورسٹی پہنچا تھا۔ ہانیہ اسے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پہ نظر آئی تھی ۔ مہو اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"ہانیہ! مہو کہاں ہے؟" وہ بے قراری سے پوچھ رہا

تھا۔ بلیو جینز اور وائٹ شرٹ میں سر پر بندی ہوئی پٹی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ پہلے والا ارتضیٰ ملک تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا۔

"نام مت لو اپنی گندی زبان سے اس کا چلی گئی ہے وہ یہاں سے افسوس ارتضیٰ! اس نے تمہیں کیا سمجھا اور تم کیا نکلے۔" ہانیہ نے افسوس سے ارتضیٰ کو کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے ہانیہ۔" وہ منمنایا۔

"سب جان چکی ہوں ارتضیٰ اور میں دعا کرتی ہوں کہ تمہیں بھی محبت ہو اور جان لیوا ہو۔ محبت کی پکڑ میں تمہارا دل بھی آئے تو تمہیں احساس ہو کہ لوگوں کے محبت بھرے دلوں کو توڑنا کیسا ہوتا ہے۔ تم اپنے زندہ ماں باپ کو مار سکتے ہو تو وہ مہو کیا چیز ہے؟ تم اس عورت کے نہ ہو سکے جس نے تمہیں جنم دیا تو کسی اور عورت کی عزت کی کہاں فکر ہو گی تمہیں۔" ہانیہ نے ارتضیٰ کو آئینہ دکھایا تھا جس میں اس کا خوب صورت چہرہ بہت ہی بھیانک نظر آ رہا تھا۔ ہانیہ کہہ کر چلی گئی اور لفظوں کی بازگشت چھوڑ گئی۔

بہت عرصے بعد وہ اپنے گھر آیا۔ اس نے ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا جب اسے بابا کی پریشان سی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا ارتضیٰ' یہ چوٹ کیسے لگی؟" وہ گھبرا کر اس کے قریب آئے۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں بیٹا' چوٹ کیسے لگی؟" انہوں نے احتیاط سے اس کی پیشانی سے بال ہٹائے۔

"بتاؤ تو کیا ہوا ہے ارتضیٰ؟" وہ ایک بار پھر محبت سے پوچھ رہے تھے۔

"میرا دل پکڑ میں آ گیا ہے بابا! ایسی پکڑ جو جان لیوا ہے۔" وہ کسی نادیدہ نقطے پہ نظریں جمائے بولا تھا۔ انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما اور اس کی صبیح پیشانی کو چوما تھا۔ ارتضیٰ اس محبت بھرے لمس پر تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اب وہ ان کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں بابا۔"

"ایسے مت کرو ارتضیٰ! میرا دل پھٹ جائے گا۔"

وہ بے قراری سے ارتضیٰ کو کندھوں سے اوپر کرتے ہوئے بولے۔ وہ چاہتے تھے کہ ارتضیٰ معافی مانگے مگر اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو وہ اس طرح اپنے قدموں میں بیٹھا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اب وہ ان کے سینے سے لگا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ تب ہی مسز ملک گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے حیرت و پریشانی سے ان باپ بیٹے کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو مہو! خدا نے تمہاری سن لی' شیراز کو اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا آخر' تمہیں پتا ہے مجھ سے بھی معافی مانگ کر گیا ہے۔ اللہ جو کرتا ہے' بہتر ہی کرتا ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر مہو کو دیکھا تھا جو ان کے گھٹنے پر سر رکھے گم صم سی بیٹھی تھی۔

"جی دادا جان! اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے لیکن ہم کبھی سمجھ نہیں پاتے۔"

"مہو' شیراز بتا رہا تھا کہ تم کسی شاک کی وجہ سے بیمار ہوئی تھیں۔ کیا ہوا تھا؟" وہ نرمی سے پوچھ رہے تھے۔ اور مہو کا دل چاہا تھا کہ ایک ایک حرف ان کو بتا کر اس اذیت سے چھٹکارا پا لے۔

"کچھ نہیں دادا جان' ڈاکٹرز تو ایسے ہی کہہ دیتے ہیں۔" اس نے آنکھوں کی نمی کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے نوٹ کیا ملک صاحب! ارتضیٰ جب سے واپس آیا ہے بہت چپ چپ لگ رہا ہے کوئی بات ہی نہیں کرتا اور کچھ پوچھو تو ہوں ہاں کرتا رہتا ہے۔ کل تہجد کے وقت میں اٹھی تو لان میں بیٹھا تھا بہت پریشان لگ رہا ہے۔ مجھے آپ بات کریں' آپ کا لاڈلا ہے۔ آپ کو بتا دے گا۔" مسز ملک نے اپنی پریشانی ظاہر کی تھی۔

"ہاں میں کرتا ہوں بات۔" پھر ان کے پوچھنے پہ ارتضیٰ نے ایک ایک لفظ ان کو بتا دیا۔

"ایسے ہمت مت ہارو۔ ایک بار کوشش کر کے

دیکھو' جاؤ وہاں اور بات کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ساری بات سننے کے بعد انہوں نے مشورہ دیا تھا۔ اور وہ اسی وقت جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ دل میں امید و ناامیدی کی کیفیت لیے وہاں پہنچ گیا تھا لیکن اب لوگوں سے کیسے دریافت کرے کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ دل میں ہزار ہا وسوسے خدشات اور بے بسی لیے وہ پگڈنڈی کے سرے پہ بیٹھ چکا تھا۔ تاحد نظر ہرے بھرے کھیت تھے۔ لوگ حیرت سے اسے زمین پہ بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ شام ڈھلنے کو تھی اور دل کی امید غروب ہونے کی تیاری کر رہی تھی تب ہی ایک دس سالہ بچہ اس کے قریب آکر زور سے بولا۔

"سلام صاحب جی' کہاں جانا ہے آپ نے؟" وہ کیا جواب دیتا اس نے بس خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"آپ آئیں جی میرے ساتھ۔" بچے نے کہا اور ارتضیٰ خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

"کیا نام ہے صاحب جی آپ کا؟" بچے نے پھر سے پوچھا وہ پھر بھی چپ رہا تھا۔

"چلیں چھوڑیں جی میرا نام عبداللہ ہے۔ میرے ابا نے رکھا تھا جی' میرا نام' میرا ابا بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔" عبداللہ نے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ "میری ماں جو مر گئی تھی۔ صرف چار سال کا تھا جی میں۔" اور اس نے مڑ کر ارتضیٰ کو دیکھا کہ شاید وہ افسوس کرے لیکن ارتضیٰ کی آنکھوں میں ٹھہرے افسوس کو دیکھ کر وہ پھر سے پگڈنڈی پر چلنے لگا تھا۔

"ہاں جی تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ بہت ہی روتا تھا جی میں' جب میری ماں مری تھی۔ ایک روز ابا نے کہا تو ایسے مت رویا کر عبداللہ! میرا دل پھٹ جائے گا' میں تو جی فورا" ہی چپ کر گیا۔ میں نے سوچا ماں بھی نہیں ہے اور اگر ابا کا بھی دل پھٹ گیا تو میرا کیا بنے گا۔ اس کے بعد نہیں رویا جی میں۔" چلتے چلتے ارتضیٰ کو ٹھوکر لگی' وہ گرتے گرتے بچا۔

"سنبھل کر جی' یہ راستہ بہت خراب ہے پر اس کی منزل بہت اچھی ہے۔ شاہ جی کہتے ہیں منزل اچھی ہو تو راستے کی مشقت برداشت کر لینی چاہیے۔ ہمارے شاہ جی ایک دن کہہ رہے تھے' زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ تو میں نے کہا شاہ جی میں تو نکا سا بچہ ہوں۔ ابھی میرا کیا مقصد ہے بھلا؟ تو انہوں نے پتا ہے کیا کہا؟" اس نے ایک دفعہ پھر رک کر ارتضیٰ کی شکل دیکھی۔ "تو انہوں نے کہا کہ عبداللہ! تو اپنے باپ کی زندگی کی مشقت پر غور کر' مقصد مل جائے گا۔ پھر جی میں اپنے ابا کے ساتھ کام پہ گیا۔ پھلوں کی ریڑھی لگاتا ہے میرا ابا۔ صبح سے شام تک وہ کھڑا رہتا ہے پھر میں نے سوچا ابا کی ٹانگیں کتنی درد کرتی ہوں گی' بس میری زندگی کا مقصد یہ ہی ہے کہ ابا کی روز شام کو ٹانگیں دباؤں' ویسے آپ کی زندگی کا مقصد ہے کوئی؟" عبداللہ نے سوال داغا تھا۔

ارتضیٰ کی آنکھوں میں ٹھہرے افسوس نے آنسوؤں کی شکل اختیار کی تھی۔ اور وہ ایک بار پھر گرتے گرتے بچا تھا جب عبداللہ نے اس کا ہاتھ تھاما

"آئیں جی میں آپ کو مسجد تک چھوڑ دیتا ہوں۔ بس قریب ہی ہے' ادھر سے۔" اور اس مسجد میں داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے اس نے ادب کی حدود میں قدم رکھا ہو۔ وہ بولتی خاموشی کو محسوس کرتا ہوا وہیں گر سا گیا تھا۔ اور گر تو وہ بہت پہلے ہی چکا تھا لیکن احساس اب ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا جیسے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ پھر اس نے تھک کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ تب ہی اس کے کانوں نے ایک شفیق آواز سنی تھی۔ لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ آنکھیں کھول کے بولنے والے کو دیکھ سکتا۔ "رو لینا چاہیے' اپنے دکھوں پر پچھتاوں' اور غلطیوں پر۔ دوسروں کے دکھوں پر بھی ان کے دل ٹوٹنے کی اذیت کو محسوس کرتے ہوئے۔" اور اس نے فورا" حکم کی تعمیل کی تھی اور رو دیا تھا جیسے یہ سب اس کے لیے ہی کہا گیا ہے۔

"محبت کرنے والوں کا آنسوؤں سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے محبوب کی محبت کی

داستان میں بھی بے شمار آنسو موجود ہیں۔ اور پھر اللہ کے محبوب سے محبت کرنے والوں کا بھی آنسوؤں سے بہت مضبوط تعلق ہوتا ہے۔" کہنے والے کی آواز میں بھی محبت کی نمی شامل ہوئی تھی۔ بولنے والا چپ ہو گیا تھا۔ تب ہی کسی نے بہت نرمی سے اس کا کندھا ہلایا تھا اس نے بہت دیر بعد نظر اٹھا کر اس شخص کو دیکھا تھا۔

"آپ کو شاہ صاحب بلا رہے ہیں۔" وہ ادب سے ہاتھ باندھے ارتضٰی سے مخاطب تھا۔ ارتضٰی اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ "مسجد کی پچھلی جانب یہ کمرہ شاہ صاحب کے گھر سے متصل ہے۔ خیال رکھیے گا۔" اس نے ارتضٰی کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ دوبار دستک دینے کے بعد بہت آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ اسے اس کمرے میں بٹھا گیا تھا جہاں ایک بزرگ نفل پڑھنے میں مشغول تھے۔ دبیز پردوں اور قالین کے ساتھ یہ کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا اور نظریں جھکائے وہیں قالین پہ بیٹھ گیا۔

"بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔" چند منٹ بعد ارتضٰی نے ان کی آواز سنی تھی۔

"جی۔" اس نے ہلکی آواز میں کہا تھا۔

"تھکنا نہیں چاہیے بیٹا! آدم کی فطرت میں بے بسی کا عنصر اتنی جلدی نہیں آنا چاہیے، جتنی جلدی تمہارے چہرے پر نظر آیا ہے۔"

"میں بہت گناہ گار ہوں۔" اس نے نم لہجے میں پہلی بار اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔

"جو جتنا گناہ گار ہوتا ہے اتنی ہی شدت سے معافی کا خواستگار بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ صرف اسے ہی اپنے گناہوں کا پتا ہوتا ہے۔ آدم نے اپنی چھوٹی سی غلطی کی ہزاروں سال معافی مانگی تھی اور تم ابن آدم ہونے کے باوجود اتنی جلدی آس کھو رہے ہو۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔

"آپ میرے لیے دعا کریں گے؟" ارتضٰی نے

بہت آس سے پوچھا تھا۔

"کروں گا کیوں نہیں کروں گا۔ میری ایک شرط ہے" تب ہی کھڑکی طرف کا دروازہ کھول کے مہو اندر داخل ہوئی تھی۔

"دادا جان" آپ کا کھانا ادھر۔" اس کے باقی الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ وہیں پتھر کی طرح ساکت ہوئی تھی۔ ارتضیٰ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔

دادا جان نے حیرت سے آنکھیں بند کیے ارتضیٰ کو دیکھا تھا اور مہو کو جو وہیں پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

"ہانیہ! وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔" اس نے باہر نکل کر ہانیہ کو فون کر کے مطلع کیا تھا۔

"وہ دادا جان کو سب کچھ جھوٹ سچ بتا دے گا۔ کیا عزت رہ جائے گی۔ تم بتاؤ میں کیا کروں؟؟"

"دیکھو مہو! پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی جاؤ اور بات کرو اس سے۔" ہانیہ نے جواب دیا تھا۔

"میں کیسے جاسکتی ہوں یار!" مہو منمنائی تھی۔

"کوشش کرو۔ ہمت کرنے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔" ہانیہ نے اس کی ہمت بندھائی۔ اور وہ فون رکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے سے نکلتے ہی اس کا سامنا بابا جان سے ہوا تھا۔

"بابا جان! وہ... اگر آپ اجازت دیں تو میں باہر چلی جاؤں افضل کی بیوی کے ساتھ؟؟"

"چلی جاؤ۔" بابا جان نے نرمی سے کہا تھا۔

مسجد سے متصل مہمان خانے پہنچتے ہی اس کی نظر ارتضیٰ پر پڑی تھی جو کسی بزرگ کو کھانا کھلانے میں مصروف تھا۔ وہ وہیں رکی اور افضل کی بیوی کو اس کو بلانے کے لیے بھیجا۔ وہ سست قدموں سے چلتا ہوا آیا اور سر جھکائے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مہو نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ سر کا زخم نمایاں تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ترس آیا تھا اس پر۔ وہ جو غصے اور بے عزتی سے بھرپور الفاظ سوچتی آئی تھی ایک دم سب کچھ بھول گئی۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔" نم لہجے میں جیسے اس نے منت کی تھی۔ ارتضیٰ نے یک دم سر اٹھا کر اس کی خوب صورت نم آنکھوں کو دیکھا اور مسکرا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں۔" ارتضیٰ نے جواب دیا تھا۔ اس کے مسکرانے پہ مہو کو تپ چڑھی تھی۔

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو آئندہ یہاں نظر آئے تو....."

"ٹھیک ہے تمہارے کہنے پر جا رہا ہوں لیکن واپس آؤں گا۔" اس کی آنکھوں میں محبت کا حزن دیکھ کر نہ جانے کیوں ارتضیٰ کو حوصلہ ہوا تھا۔ محبت آشکار ہو جائے تو اگلے دل کا راز محبت بھی افشا کر کے چھوڑتی ہے۔ وہ اس کو دیکھتے ہوئے "اللہ حافظ" کہتا گزر گیا تھا۔ مہو وہیں کھڑی اس وجاہت کے پیکر کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

مہو نے سوچا کہ میں نے اس سے کیوں نہ پوچھا کہ وہ کیوں مجھے ذلیل کرنا چاہتا تھا؟ اس نے اتنے جھوٹ کیوں بولے مجھ سے؟ وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکی۔ یقیناً" اس نے دادا جان کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ اسی لیے اتنے سکون سے واپس جا رہا ہے۔ اس سوچ نے اس کے قدموں تلے زمین کھینچی تھی۔ بے بسی کے احساس سے وہ وہیں بیٹھی رو رہی تھی۔ اگلے دن جو ہوا تھا مہو نے سوچا کہ کاش وہ اسے واپس جانے کو نہ کہتی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ شیراز شاہ کی چنگھاڑ سے کھلی تھی۔ ایک دم گھبرا کر وہ باہر بھاگی۔

"یا اللہ خیر!" آوازیں ڈرائنگ روم سے آ رہی تھیں۔ اس کے قدموں میں تیزی آئی تھی اور ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر اسے چکر سا آ گیا تھا۔ ایک عورت شیراز شاہ کے پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ سامنے صوفے پہ ارتضیٰ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ بیٹھا تھا اور سرفراز شاہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ ایک تواتر سے ان کے آنسو ان کی داڑھی کو تر کر رہے تھے۔ صباحت بیگم بھی نم آنکھیں فرش پر جمائے بیٹھی تھیں۔ مہو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ واپس مڑنے

کو ہی تھی جب شیراز شاہ کے الفاظ نے اس کے قدم وہیں جما دیے تھے۔

"تمہاری عزت کا تو پاس رکھا نہیں تم نے اور اب میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آگئے ہو تم۔ بابا جان! اسے کہیں جائے یہاں سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

شیراز شاہ غصے سے بے قابو ہو رہے تھے۔

"ایسا مت کہو شیراز! یہ بیٹی ہے میری۔" سرفراز شاہ نے نم لہجے میں کہا۔

"بابا جان! آپ اب بھی اس کی وکالت کر رہے ہیں' آپ تو بے حد محبت کرتے تھے اس سے پھر کیا کیا اس نے ہمارے ساتھ۔" صدمے اور غصے سے شیراز شاہ کی آواز پھٹ گئی۔ اب بھی وہ بے یقینی سے پوچھ رہے تھے۔ اور سرفراز شاہ کے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ وہ اوندھے منہ گرے جب شہربانو کی سرسراتی آواز نے سب کو ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"بابا جان!"

✡ ✡ ✡

اسپتال کے ٹھنڈے یخ برآمدے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ اس سناٹے کو صرف مہو کی سسکیاں توڑ رہی تھیں۔ تب ہی شہربانو بیگم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ جو رونے میں مصروف تھی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا مہو۔" انہوں نے نم آنکھوں اور لہجے سے تسلی دی۔

"ارتضیٰ ابھی ڈاکٹر سے مل کر آیا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" مہو نے ایک دم تنفر سے ان کا ہاتھ جھٹکا۔

"یہ سب کچھ آپ کے بیٹے کی وجہ سے ہوا ہے' اسے شوق ہے لوگوں کو برباد کرنے کا بتا دیجیے گا اسے اگر میرے دادا جان کو کچھ ہوا تو....." اس کی باقی بات ارتضیٰ پہ نظر پڑتے ہی رک گئی تھی۔

"نانا جان کو ہوش آگیا ہے۔" ارتضیٰ کی بات سنتے ہی وہ تیزی سے اندر بھاگی تھی۔ شیراز شاہ نم آنکھیں لیے باپ کے سرہانے کھڑے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتی مہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ باہر چلے گئے تھے۔ مہو کو ان کا انداز عجیب سا لگا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی تھی۔ ان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں دادا جان؟" مسلسل رونے کی وجہ سے مہو کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو چکی تھیں۔

"ایک بات مانو گی مہو؟" سرفراز شاہ بہت آس سے پوچھ رہے تھے۔

"جی آپ حکم کریں۔" مہو نے کہا۔

"میں نے تمہارے لیے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اب تمہیں اس کی لاج رکھنی ہے' میں چاہتا ہوں کہ ارتضیٰ کے پرپوزل کو ایکسیپٹ کر لیا جائے۔" دادا جان آہستہ سے بولے' وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"دادا جان! وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ آپ نہیں جانتے اس کے بارے میں' میں آپ کو بتاتی ہوں۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے ایک عزم سے بتانے لگی۔

"میں سب جانتا ہوں مہو! اتنے سالوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جڑ جائے گا۔" دادا جان نے اس کی بات کاٹی۔

"دادا جان! آپ اپنی بیٹی کی محبت میں مجھے قربان کر رہے ہیں۔" وہ بے یقینی سے پیچھے ہٹی۔

"نہیں مہو' شک مت کرو۔ میں تمہاری محبت کے لیے اپنی انا قربان کر رہا ہوں' میری بچی۔" دادا جان نے آنکھیں بند کی تھیں اور مہو کو محبت کی اس باخبری پہ ایک بار پھر رونا آ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں مہو! تم نے میرا مان رکھنے کے لیے کبھی خود سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا' لیکن میں تمہاری آنکھوں کے ہر رنگ سے واقف ہوں۔" دادا جان کی بات سنتے ہی مہو نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔

"تمہارا مان رکھنا میری محبت پہ قرض ہے۔ میں یہ قرض اتارنا چاہتا ہوں' میرا ساتھ دو مہو' تم نہیں جانتیں کہ ارتضیٰ نے عاجزی کے رستے پہ پہلا قدم رکھ دیا ہے اللہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بلندی تک لے

جائے گا۔ اور میں اس بلندی پہ تمہیں اس کے ساتھ دیکھنا پسند کروں گا۔ نکاح ابھی ہو گا۔ پتا نہیں اللہ مجھے مہلت دیتا ہے یا نہیں میں یہ قرض اتار کر سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔" وہ بولتے بولتے تھک سے گئے تھے۔

مہو کے رونے میں شدت آئی۔ تب ہی شیراز شاہ ارتضیٰ ملک احسن اور شہربانو بیگم مولوی کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ارتضیٰ نے بے چینی سے ریڈ اور وائٹ کلر کے سوٹ میں ریڈ دوپٹہ لیے کھڑی روتی ہوئی مہو کو دیکھا تھا۔ مہو اور ارتضیٰ کو صوفے پر بٹھا دیا گیا۔

"بسم اللہ کریں مولوی صاحب۔" شیراز شاہ کی آواز پہ مہو کا دل لرز کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ تمام لوگ وہاں سے چلے گئے اور وہ بس خالی خالی نظروں سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں سے ارتضیٰ ملک اٹھ کر گیا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دادا جان کو دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"میں نے جو ساری زندگی تم سے محبت کی ہے مہو! بے میں تمہارے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔" وہ مہو کی آنکھوں میں ٹھہرے ڈر اور خوف کو دیکھتے ہوئے محبت سے بولے۔

"مجھے معاف کر دیں دادا جان۔" مہو نے دادا جان کا ہاتھ تھاما۔

"مجھے معاف کر دیں۔"

"چلو مہو بیٹا گھر جا کے کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر آ جانا۔" شیراز شاہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے بولے۔

"نہیں بابا پلیز مجھے یہیں رہنے دیں۔" مہو نے فکر مندی سے دادا جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے کچھ کھایا بھی نہیں۔" شیراز شاہ سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے بابا میں صبح آ جاؤں گی دادا جان کو لے کر۔"

"اس کو میرے پاس رہنے دو شیراز۔" دادا جان مہو کی پریشان شکل دیکھ کر بولے۔

وہ گھر پہنچے ہی تھے کہ صباحت بیگم ان کی طرف لپکیں۔

"مہو کہاں ہے؟ آپ کو اسے ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ آپ نے اچانک کر دیا۔ اور اب اسے اکیلا وہاں چھوڑ آئے ہیں اس نے تو کل سے کچھ کھایا بھی نہیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بولی تھیں۔

"میں لانا چاہ رہا تھا مگر وہ نہیں مانی۔" وہ آگے بڑھے اور ایک خاموش نظر ارتضیٰ پہ ڈالی جو نکاح ہوتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا تھا اور اب بظاہر انتہائی انہماک سے ٹاک شو دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کے دو بج چکے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جوں ہی وہ آنکھیں بند کرتا مہو کا رویا رویا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا وہ بے چین ہو اٹھا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو اس خیال کے آتے ہی وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر بھاگا اور آدھے گھنٹے کا راستہ پندرہ منٹ میں طے کر کے وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ مہو اس کی بے چینی اور بے قراری سے بے خبر کرسی پر دونوں پاؤں اوپر رکھے سو رہی تھی۔ اس کو سوتا دیکھ کر ارتضیٰ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"مہو" اس نے نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔ مہو نے سرد لمس محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ اس کے آنکھیں کھولنے پر بھی ارتضیٰ نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ چند سیکنڈ لگے تھے اسے صورت حال سمجھنے میں۔ اس پہ جھکا بے ترتیب بالوں والا ارتضیٰ ہی تھا۔ اس نے جلدی سے ارتضیٰ کا ہاتھ ہٹایا۔

"آپ یہاں؟" وہ اب کھڑی ہو چکی تھی۔ اور ارتضیٰ یک ٹک اس کی سرخ روئی روئی آنکھوں کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ اور وہ جیسے کسی خواب سے جاگا۔

"وہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مہو! آؤ گھر چلتے ہیں۔" مہو نے ایک نظر سوئے ہوئے دادا جان کو دیکھا اور ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ پیچھے ہوتے ہوئے بولی تھی۔ بڑھی شیو' آنکھوں کے گرد حلقے یہ وہ ارتضیٰ تو نہیں تھا۔ اسے ایک بار پھر اس پر ترس آیا تھا اور وہ ارتضیٰ کے ساتھ کمرے سے باہر آئی۔ وہ دونوں اسپتال کے لان میں موجود بینچ پر بیٹھے تھے' بہت سے لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

"میں نے بہت غلطیاں کی ہیں مہو! لیکن جب میں نے تمہارے ساتھ برا کرنے کا سوچا تو میں پکڑ میں آگیا' جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ تمہیں اللہ سے محبت ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی کچھ غلط نہیں ہونے دے گا۔ میں نے اپنی ہر غلطی کی معافی مانگی ہے مہو! لیکن مجھے سکون نہیں ملا' معافی نہیں ملی' کیونکہ جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی' اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مہو کے سامنے دوزانو بیٹھ کے مہو کے سرخ و سفید نازک ہاتھوں کو تھاما۔ پھر اس نے روتے ہوئے مہو کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

"پلیز مہو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گرے تھے اور مہو کے دل پہ جیسے کسی نے پیر رکھا تھا۔ مہو نے جلدی سے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھاما۔

"تم جو کہو گی میں کروں گا۔ تم دن کو رات کہو گی تو رات' اور رات کو دن کہو گی تو دن کہوں گا' اور تم جس کام سے منع کرو گی' وہ نہیں کروں گا۔"

"اور آئندہ تم کسی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔" ارتضیٰ کے چپ ہوتے ہی مہو تیزی سے بولی تھی۔ ارتضیٰ نے چونک کر سر اٹھایا اور مہو کی محبت کے استحقاق سے بھری آنکھوں کو دیکھا اور نم آنکھوں سے مسکرایا مہو کو لگا تھا جیسے ہر چیز روشن ہو گئی۔

"یہ تو بہت مشکل کام ہے مہو۔" وہ مصنوعی بے چارگی سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں آئندہ تم سے بھی بات نہیں کروں گی۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہوئی۔ ارتضیٰ نے مسکرا کر ایک نظر خفا خفا سی مہو کو دیکھا تھا۔ اور مہو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اب دیکھو مہو! میری ایک عدد بیوی ہے' جو کہ ایک خوب صورت لڑکی ہے اور اگر میں اس کو نہ دیکھوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری جان نکل جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" مہو نے دہل کر کہا تھا۔

"اف! اللہ کی قسم' بالکل بیوی لگی ہو ایسا کہتے ہوئے۔" ارتضیٰ نے مہو کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا اور مہو نے جانا تھا کہ عشق صرف اذیت اور آنسوؤں کی کہانی نہیں' یہ سکون بھی تو ہے اور سکون کے اس ایک لمحے کے لیے عشق کی تمام کٹھنائیاں بہت بے معنی سی لگتی ہیں۔

☼

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بندا ہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم "بنگارا یا ملایو" کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے، وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو "وانگ لی" کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن باؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے۔ دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

بارہویں قسط

جہاں ملتے ہیں تین چاند
اس نے خواب میں دیکھا
گہری سیاہ رات ہے
آسمان پہ پورا چاند چمک رہا ہے
اور وہ ٹھنڈی ریت پہ ننگے پیر چل رہی ہے
ننھی ننھی چیزیں پیروں میں چبھ رہی ہیں
مگر وہ چبھن سے بے پرواہ قدم اٹھا رہی ہے
چغنے کی ٹوپی نے اس کا سر ڈھانپ رکھا ہے
مگر ہوا کے باعث وہ پھڑ پھڑا رہا ہے
دفعتاً ایک مقام پہ وہ ٹھہرتی ہے
سامنے آسمان پہ مکھن کی ٹکیا جیسا چاند چمک رہا ہے
وہ نظریں دائیں طرف موڑتی ہے
وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی خوب روشن ہے
جیسے شیشے کی بنی ہو
اس چوٹی کے چمکتے شیشے میں ایک دوسرا چاند نظر آ رہا ہے
وہ ایک دم گھومتی ہے
ہوا سے چغنے کی ٹوپی پیچھے کو ڈھلک جاتی ہے
سنہری بال پیچھے کو اڑنے لگتے ہیں
اور اس کی سیاہ آنکھیں سامنے جم جاتی ہیں
وہاں سیاہ زمین ہے.... بالکل سیاہ کانچ جیسی....
اور ایک چاند اس زمین پہ چمک رہا ہے
"جہاں ملتے ہیں تین چاند۔"
وہ چونک کے بڑبڑائی ہے
پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلتے ہیں
"یہاں.... ہاں' یہاں ملتے ہیں تین چاند!"

☆☆☆

تالیہ کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی۔

چند لمحے وہ چت پڑی رہی۔ پھر ایک طرف ہاتھ مارا تا کہ ٹیبل لیمپ جلائے یا ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کرے یا موبائل اٹھا کے وقت دیکھے...... مگر...... پلنگ کے ساتھ تپائی پہ ایسا کچھ نہیں رکھا تھا۔ نہ موبائل' نہ ریموٹ۔

ذہن کو بیدار ہونے میں چند لمحے لگے اور پھر اسے یاد آیا کہ وہ کوالالمپور میں نہیں تھی۔

وہ قدیم ملاکہ میں تھی۔

وہ سست روی سے اٹھی اور دیا سلائی سلگا کے چند موم بتیاں روشن کیں۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

یہ آدھی رات کا وقت تھا اور سارا محل خاموش تھا۔ تالیہ نے کھڑکی کے پردے ہٹا کے جھانکا تو آسمان پہ باریک کمان سا چاند جگمگا رہا تھا۔

"جہاں تین چاند ملتے ہیں۔" چاند کو تکتے ہوئے بے خودی سے دہرایا۔ "کیسی عجیب سی جگہ تھی وہ......"

پھر چونک کے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ انگلی میں سرخ یاقوت اور ہیروں والی آنسو شکل انگوٹھی ہنوز موجود تھی۔ کیسا عجیب سا آنسو تھا وہ۔

دل کی شکل جیسا۔

خون کے رنگ جیسا۔

ایک دم جیسے کوئی یاد آیا۔

اس نے میز سے گھڑی اٹھائی اور وقت دیکھا۔ یہ کانچ کی بنی قدیم گھڑی تھی جس کے دو خانے تھے۔ اوپر والے میں ریت بھری تھی اور سوراخ سے ذرہ ذرہ کر کے ریت نچلے خانے میں گر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ۔ اس نے ریت کی مقدار سے اندازہ لگایا کہ ابھی رات کے بارہ یا ایک بجا تھا۔ وہ مسکرائی اور گھڑی رکھ دی۔

اسے کسی سے ملنے جانا تھا۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اوپر کمان جیسا چاند جگمگا رہا تھا۔ چند پہرے دار جمائیاں لیتے، پھاٹک اور چار دیواری کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ مگر باورچی خانے کی چمنی کے ساتھ مخروطی چھت پہ بیٹھی تالیہ ان کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

وہ سیاہ پاجامے قمیص میں ملبوس، بالوں کو سیاہ کپڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ دور سے وہ کوئی نوجوان لڑکا نظر آتی تھی جو اکڑوں بیٹھا، اداسی سے گھٹنوں پہ سر رکھے ہوئے تھا۔ ہاں ہاتھ میں دمکتی سرخ آنسو والی انگوٹھی اس کی نسوانیت کا پتا دیتی تھی۔ اوپر چڑھتے فاتح کی پہلی نظر اس انگوٹھی پہ پڑی تھی۔ دوسری اس کے تاریکی میں ڈوبے چہرے پہ۔ رسی پرے ہٹا کے وہ اس کے قریب آ کے بیٹھا۔

"تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

تالیہ نے سر اٹھا کے اسے سادگی سے دیکھا۔

"مجھے راجہ کے کمرے کی تلاشی لینے کا موقع ابھی تک نہیں مل سکا۔ چابی کہاں ہے، میں نہیں جانتی، لیکن جیسے ہی وہ ہمیں ملی، ہم واپس....."

"میں وزیرِ خزانہ کی تعیناتی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔" وہ کھنکھار کے بولا تو وہ چپ ہوئی۔ "اوہ!"

"سن باؤ وانگ لی.... یا.... ابوالخیر.... تم نے کس کو چنا؟"

"کس کو چُننا چاہیے تھا؟"

"ظاہر ہے وانگ لی کو۔ اس میں وہ دونوں خوبیاں ہیں جو ہمیں کسی کو جاب دیتے وقت امیدوار میں دیکھنی چاہئیں۔ اس جاب کو کرنے کی قابلیت اور امانت داری۔" اس کا ذکر کرتے ہوئے فاتح کی آواز میں نرمی گھل گئی۔ "جبکہ ابوالخیر ایک بدنیت اور نا اہل آدمی ہے۔"

وہ چند لمحے اس کا چہرہ تکتی رہی۔ "میں نے ابو الخیر کا نام تجویز کیا ہے اور سلطان نے تائید کرتے ہوئے فیصلے پہ مہر لگا دی ہے۔"

حویلی کی چھت پہ سناٹا چھا گیا۔ فاتح چند لمحے تو کچھ کہہ نہیں سکا۔ پھر اس کے ابرو بھینچ گئے۔

"تم نے ابوالخیر کی طرف داری کیوں کی؟"

"کیونکہ مجھے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے مضبوط حلیفوں کی ضرورت ہے اور مجھے مراد راجہ کو بھی خود سے خفا نہیں کرنا۔"

"تو تم نے یہ اپنے لیے کیا؟ ملاکہ کے لوگوں کے لیے نہیں؟"

تالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور سادگی سے اسے دیکھا۔

"آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ تو انکو؟"

"میں ملاکہ کے لوگوں کو وانگ لی جیسے ایماندار اور قابل آدمی کا تحفہ دیتا۔"

"وہ غیر ملکی ہے۔ خواہ اس کی ہمارے سلاطین اور روسا سے گہری دوستی ہی کیوں نہ ہو، وہ ہمیشہ یہاں ایک اجنبی آدمی ہی رہے گا۔ بالفرض میں اس کو منتخب کر بھی دیتی تو صبح ہونے سے پہلے ابوالخیر یا راجہ مراد اسے مروا دیتے۔ مقابلہ ختم ہو جاتا اور ہمیں ابوالخیر کو ہی

www.urdusoftbooks.com

وزیر بنوانا پڑتا۔ (فاتح سر جھٹک کے سامنے دیکھنے لگا) یہ آپ کی ڈیموکریسی نہیں ہے تو ان کو۔ جہاں اتنی آسانی سے قتل نہیں ہو سکتے۔ یہ بادشاہت ہے۔ یہاں کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہاں عدالتیں حکمرانوں کے تابع ہوتی ہیں۔

میں ایک چینی کو ملاکہ کا وزیرِ خزانہ بنوا بھی دیتی تو لوگ اسے تسلیم نہ کرتے اور اگر وہ مر جاتا تو اس کے لیے کوئی نہ روتا۔ میں نے اس کی جان اور اپنے ملک کا امن بچایا ہے۔ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ اگر سیاست یہ نہیں ہوتی تو میں نہیں جانتی کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔"

"وانگ لی اس ملک کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔" وہ تلخی سے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بنگارا ملایو میں کیا لکھا ہے؟ کیا وانگ لی کو تاشہ نے وزیر بنایا تھا؟"

فاتح نے گہری سانس لی۔ "اس میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں درج نہیں تھیں۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ شاید وہ عظیم کارنامے جو وانگ لی نے سرانجام دیے تھے، وہ وزیر بن کے کیے ہوں اور مورخ ان کو لکھنا بھول گیا ہو۔"

"مورخ!" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "جانتے ہیں شاہی مورخ کون ہے؟"

"جانتا ہوں۔"

اس کو اس وقت مورخ کے ذکر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خفا نگاہیں سامنے دیکھ رہی تھیں جہاں اندھیرے میں ڈوبا قدیم ملاکہ پھیلا تھا۔ دو چار گھروں میں مشعلیں جلتی نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سیاہ چادر کے سارے سنہری تارے ٹوٹ گئے ہوں اور صرف ایک آدھ تارہ اٹکا ہوا، جگمگا رہا ہو۔

"ابوالخیر اور راجہ کی بلیک میلنگ سے ہار ماننے کے بجائے یہ عہدہ وانگ لی کو دے کر اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا جا سکتا تھا۔"

"آپ کی وانگ لی سے کتنی بات چیت ہوئی ہے؟"

"بات چیت؟" فاتح کی آواز آہستہ ہوئی۔ نظریں دور پھیلے ملاکہ پہ جمی تھیں۔ "میں باورچی خانے میں تھا جب اس کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس کے نام نے مجھے چونکایا تھا۔ میں طشت لے کر اندر گیا اور اس کے سامنے شوربہ رکھا۔ اس نے مجھے صرف ایک نظر دیکھا۔ میرے اوپر دوسری نظر اس نے رات کھانے پہ ڈالی جب تم بھی وہاں موجود تھیں اور امور سلطنت پہ گفتگو کی جا رہی تھی۔

تمہارے جانے کے بعد ابوالخیر نے اسے زہر ملا شوربہ میرے ہاتھوں پلوانا چاہا مگر میں نے اسے خبردار کر دیا۔ پھر جب وہ اپنی سواری پہ چڑھ رہا تھا تو میں باورچی خانے کی چوکھٹ پہ کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ میری اس سے اتنی ہی ملاقات ہوئی ہے بس۔"

تالیہ ایک دم ہنس پڑی۔ فاتح نے قدرے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھے ہنسے جا رہی تھی۔

"ایسی کیا مزاحیہ بات ہے اس میں۔"

تالیہ نے بدقت مسکراہٹ روک کر منہ سے ہاتھ ہٹائے۔

"آپ فین مومنٹ میں ہیں۔"

"کیا؟" اس نے ناگواری سے ابرو اٹھائی۔

"ایک زمانے میں 'تالیہ مراد' کسی کے گھر کام کرتی تھی۔" ہتھیلی گال تلے جمائے وہ مزے سے بتانے لگی۔ "ایک روز کچن میں، میں نے ساتھی ملازماؤں سے پوچھا کہ اتنا اہتمام کس کے لیے کیا جا رہا ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ملک کا اگلا وزیرِ اعظم مدعو ہے۔

(فاتح ہلکا سا مسکرایا۔ اب وہ سامنے دیکھ رہا تھا) اور پھر میں نے اس سیاستدان کو جوس پیش کیا۔ میں بھی اعلا ایوانوں کے متعلق کی جانے والی گفتگو، دروازے سے باہر کھڑی سنتی رہی تھی اور میں نے بھی کچن کی کھڑکی سے ان دونوں میاں بیوی کو اپنی سواری میں سوار ہوتے دیکھا تھا مگر مجھے اس سیاستدان نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔

بلکہ جب میں نے ان ہی کے گھر' ان ہی کی ڈائننگ ٹیبل پہ ان کو گھائل غزال کے جعلی ہونے کی سازش سے مطلع کرنا چاہا تو مجھے لگا وہ میرا یقین نہیں کریں گے۔

اچھی بات ہے کہ آپ نے سچ بولنے کی ہمت کی اور سن باؤ کو مطلع کر دیا۔ میں نہیں کر سکی تھی۔ مگر شاید اس لیے کہ میں ان کے سامنے ہمیشہ فین مومنٹ میں ہوتی تھی۔ تالیہ دی فین گرل۔''

آخر میں وہ دوبارہ ہنسی مگر اب کی بار وہ ہنسی تلخ تھی۔ استہزائیہ۔ اپنا مذاق اڑاتی ہوئی۔

''میں اس کا فین نہیں ہوں۔ میں....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ تالیہ چند لمحے فقرہ مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ وقت کے اس قیدی سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

عموماً ملاقات کے ختم ہونے کا احساس ڈائری اٹھائے اس کا سیکرٹری دلایا کرتا تھا اور پھر اگلی میٹنگ کے بارے میں مطلع کرتا تھا۔ تالیہ نے یوں ہی ادھر ادھر دیکھا۔ آج اس کا کوئی سیکرٹری' کوئی باڈی مین اس کے وقت کا حساب رکھے ہوئے ارد گرد منڈلا نہیں رہا تھا۔ وان فاتح ان کی زندگیوں سے نکل چکا تھا اور چند دن پولیس نے اسے تلاش کرنے کے بعد یہ کیس فائلز کے ڈھیر میں بھلا بھی دیا ہوگا۔ اس کے سیکرٹری نے اگلی جاب بھی شروع کر دی ہوگی۔ سب آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ صرف وہی پیچھے رہ گئے تھے، قید میں۔

وان فاتح اب رسی سے نیچے اتر رہا تھا اور بالوں کو رومال میں لپیٹے بیٹھی ہوئے تالیہ یا سیت سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

جنگل میں بھٹکنے کے ان سارے دنوں کے بعد آج وہ عرصے بعد دوبارہ سے فین مومنٹ میں گھری تھی۔ مگر کیا وہ اب تک فاتح بن رامزل کی فین تھی یا الوژن ٹوٹ چکا تھا؟

مگر پھر.... الوژن کے پار.... کیا نظر آیا تھا اسے؟

☆☆☆

اس صبح بنداہارا کے محل سے سورج کی کرنیں ٹکرا رہی تھیں۔ دربار کی کھڑکیوں سے چھن کے آتی روشنی دربار کو منور کیے ہوئے تھی۔ اونچے تخت پہ شہزادی تاشہ ریشمی لباس کو پھول کی طرح پھیلائے بیٹھی تھی۔ سر پہ ہیروں کا تاج سجا تھا اور ہاتھ میں چاندی کا آئینہ تھامے، وہ آنکھوں کا سنگھار دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً دروازے کھلے اور منادی کرنے والے نے صدا لگائی۔ ''قیدی' آدم' حاضر ہو۔''

ایڈم اندر داخل ہوا تو پیچھے دروازے بند کر دیے گئے۔ وہ دربار کی چوکھٹ پہ تنہا کھڑا تھا۔ کوئی کنیز' کوئی غلام موجود نہ تھا اور تخت پہ بیٹھی شہزادی آئینہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

ایڈم نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ عالیشان وسیع و عریض دربار.... چھت پہ بنے نقش و نگار.... کھڑکیوں پہ گرے مخملیں پردے.... ہر شے رعب طاری کر دینے والی تھی۔ مگر ایڈم نے دل چھوٹا نہ کیا۔ آج عرصے بعد اسے صاف لباس دیا گیا تھا' جس میں کلف بھی لگا تھا۔ پاجامہ اور چھوٹا کرتا۔ ہم رنگ جوتے۔ وہ اعتماد سے قدم اٹھاتا تخت کے سامنے آیا اور سر جھکا کے سلام کیا۔

''شہزادی!'' سر اٹھا کے تالیہ کے چہرے کو براہ راست دیکھا۔

''میں جانتا ہوں آپ شرمندہ ہیں' مجھے اتنے دن جیل میں رکھنے اور تیسرے درجے کا کھانا دینے کے لیے۔ مگر آپ بے فکر رہیں' میں نے آپ کو معاف کیا کیونکہ آپ نے مجھے دنیا کی بہترین کتابوں سے روشناس بھی تو کرایا ہے۔'' بڑی سخاوت سے انگریزی میں بولا۔

تالیہ نے ناک سکیڑی، آئینہ پرے رکھا اور تندی سے اسے گھورا۔

''گرفتاری کے وقت یہ تھیلا تمہارے پاس سے ملا تھا۔'' سرخ انگوٹھی والی انگلی سے شہزادی نے اشارہ

کیا تو ایڈم نے دیکھا۔

درباریوں کی خالی کرسیوں میں پہلی کرسی کے سامنے میز تھی جس پہ ایک تھیلا رکھا تھا۔ ساتھ موم بتی' کاغذ' قلم' سیاہی وغیرہ ترتیب سے رکھے تھے۔ ایڈم نے تھیلا اٹھا کے دیکھا۔

''جی یہ میرا ہی ہے۔'' اس نے اندر سے کاغذ نکال کے دیکھے۔ پھر قدرے حیران ہوا۔ ''ایک منٹ۔ پہلے صفحے پر ''بنگارایا ملایو'' اور نیچے مصنف کا نام بھی لکھا تھا۔ ابوبکر سم تھنگ .... وہ صفحہ کہاں گیا؟''

''وہ صفحہ میں نے پھاڑ کے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

شہزادی نے ایک شان بے نیازی سے سنہری لٹ پیچھے کی۔ ''اگر میں وہ رہنے دیتی تو قید خانے کا داروغہ جان لیتا کہ یہ دستہ تمہارا نہیں' کسی ابوبکر کا ہے۔ تم پہ چوری ثابت ہو جاتی اور مجبوراً قانون کے مطابق اسے تمہارا ہاتھ کاٹنا پڑتا۔''

ایڈم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''ہیں؟''

''نہیں خیر ہے' اگر تمہیں اپنا ہاتھ پیارا نہیں تو کھل کے بتا دو۔ میں ابھی کٹوائے دیتی ہوں۔''

''ارے واہ..... کیسے کٹوائے دیتی ہیں؟'' وہ چمک کے بولا۔ ''پہلے بتائیے' مجھے چوری کرنا سکھائی کس نے تھی؟''

''جس نے سکھائی تھی' اس نے اپنے سکھانے کا ثبوت تو چھوڑا نہیں ہو گا۔ ہے نا۔'' ہتھیلی پہ تھوڑی جمائے' پلکیں جھپکا کے اسے دیکھا۔

ایڈم لمحے بھر کو چپ ہوا۔ پھر نظریں اس کاغذ پہ جھکائیں۔

''خیر...... فی الحال اس کتاب پہ کسی دوسرے کا نام نہیں لکھا یعنی یہ تھیلا میرا ہی ہے۔'' گھور کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ اونچے تخت پہ بیٹھی تھی اور ایڈم نیچے کھڑا تھا۔

''یہ ہوئی نا بات۔ اب تم محفوظ ہو۔ ویسے وہ کون تھا جس کی یہ کتاب تھی۔'' وہ مسکرا کے دوستانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''ہونہہ' تھا کوئی کنگال رائٹر بلکہ رائٹرز تو پھر بہتر ہوتے ہیں' وہ تو بے چارہ کوئی مؤرخ تھا۔'' ایڈم نے خوب ناک چڑھا کے سر جھٹکا۔ تالیہ نے مزید دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''اور مؤرخین کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

''مؤرخین؟ ہا!'' اس نے بدمزگی سے سر جھٹکا۔ ''میرے نزدیک مؤرخین انتہائی دو نمبر لوگ ہوتے ہیں۔''

''اچھا؟ دو نمبر؟'' تالیہ نے دو بار پلکیں جھپکائیں۔

''اور نہیں تو کیا۔ آپ کے خیال میں کیا یہ سچ لکھتے ہیں؟ یہ بادشاہوں کی عظمت کے قصے جو ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں' اس میں زیادہ تر مبالغہ آرائی ہوتی ہے جو مؤرخین اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ تقریباً سارے بادشاہ طاقت کی ہوس میں مبتلا ظالم لوگ ہوتے تھے۔ سوائے دو چار کے' انسانی تاریخ کرپٹ حکمرانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر تاریخ کی کتابیں پڑھو تو بادشاہ رحم دلی اور عظمت کا پیکر لگتے ہیں۔ خوشامدی' درباری مؤرخین کے کارنامے۔ ہونہہ۔''

''ہوں۔ کتنے نیک خیالات ہیں تمہارے اور بنگارایا ملایو کے مؤرخ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟'' وہ مسکرا مسکرا کے دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

''بنگارایا ملایو میں نے پڑھی تو نہیں ہے' مگر اس کا رائٹر......اس کا کنگال رائٹر دیکھا تھا اس دن میں نے سرائے میں۔'' پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ ''ابھی اس نے کتاب کا پہلا صفحہ بھی نہیں لکھا یعنی یہ کتاب ابھی اس نے لکھنی ہے۔ ہوں یعنی اب وہ آپ کے پاس آئے گا اور آپ کی خوشامد کرے گا۔ جواب میں آپ اس کو مالا مال کر دیں گی کیونکہ میں نے سنا ہے بنگارایا ملایو میں شہزادی تاشہ کی وہ وہ خوبیاں بیان کی گئی ہیں جن کا آپ میں ہونا ناممکن ہے اور ایسا

صرف ایک صورت میں ہوسکتا ہے کہ آپ ایک لالچی، مفاد پرست اور جھوٹے آدمی کو شاہی مؤرخ کا عہدہ دے دیں۔"

اپنی طرف سے مسکرا کے وہ تاک تاک کے نشانے لگا رہا تھا مگر تالیہ دلچسپی سے سنے جا رہی تھی۔

"سچ سچ...... کتنا جھوٹا اور سچ آدمی ہوگا ہمارا اگلا شاہی مؤرخ۔"

"ہونہہ۔ شہزادی کی خوشنودی کے لیے ایمان بیچ دینے والا مؤرخ اور وہ کنگال رائٹر ابوبکر...... وہ...... ایک منٹ...... جو بنگارایا ملایو ہمیں پڑھائی جاتی تھی اس کے مصنف کا نام ابوبکر نہیں تھا۔ اس کا نام آدم بن محمد تھا مگر خیر... ہوگا وہ بھی جھوٹا اور....."

ایڈم کو بولتے بولتے ایک دم چپ لگی۔ جیسے کسی نے سر پہ ہتھوڑے مارا ہو۔

ایک دم وہ آگے بڑھا اور جس میز پہ اس کا تھیلا پڑا تھا وہاں رکھی تختی اپنی طرف موڑی تاکہ اس پہ کندہ نام سامنے آسکے۔ وہ کرسی شاہی مؤرخ کی تھی، اور بھلا کون سا نام لکھا تھا اس پہ؟

"آدم بن محمد۔ شاہی مؤرخ۔"

ایڈم کے لب بے یقینی سے کھل گئے۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے۔

شہزادی اپنا گاؤن جھٹکتی اٹھی اور ایک شان سے چبوترے کے زینے اترنے لگی۔ ایڈم سانس روکے اس تختی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ شاہی مؤرخ کی کرسی اور اس کا سامان تھا۔

تالیہ اس کے قریب رکی اور ایک تہ شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

"آدم بن محمد! آج سے تم ملاکہ کے سلطان مرسل شاہ کے شاہی مؤرخ تعینات کیے جاتے ہو۔"

کاغذ جھٹکا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ شاہی حکم نامہ تھا اور نیچے مرسل شاہ کی مہر نصب تھی۔

"تم بنگارایا ملایو لکھو گے۔ تاشہ پسونا کے دور کی کہانی جو صدیوں یاد رکھی جائے گی۔ تمہارے نام کے ساتھ۔ تم.... ایڈم بن محمد ملاکہ سلطنت کے "آدم بن محمد" ہو۔"

وہ بالکل ششدر کھڑا تھا۔ "کیا واقعی 'میں' وہ عظیم کتاب لکھوں گا؟ میں؟"

"بالکل۔" وہ مسکرائی۔ "اور تم اس داستان میں سب سچ لکھو گے۔ تمہاری شہزادی بھی تمہیں جھوٹ لکھنے کو نہیں کہے گی۔ تم میری تاج اور تخت کی اس جنگ کو دیکھ کر جو محسوس کرنا، وہی سچ سچ لکھ دینا۔"

"واقعی؟" اس نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔ "میں سب سچ لکھ سکتا ہوں؟"

"بالکل بھی نہیں، ڈفر۔" مسکراہٹ غائب ہوئی اور ماتھے پہ بل ڈال کے اسے گھرکا۔ "اتنے اعلا عہدے مفت میں نہیں ملا کرتے۔ اس لیے میرا احسان مانو اور جو میں کہوں، وہی لکھنا ہے تمہیں۔ تمہارے ایک ایک لفظ پہ میری نظر ہوگی، اچھا! زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ایک کنگال رائٹر کا تھیلا چوری کرنے کے جرم میں ہاتھ کٹوا دوں گی تمہارا۔ ہونہہ۔" ایک ادا سے سر جھٹکا اور آگے چل دی۔ اس کا ریشمی شاہی لباس اس کے پیچھے پیچھے فرش پہ جھاڑو دیتا جا رہا تھا۔

ایڈم نے کینہ توز نظروں سے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔

"اگر اس تاشہ کو ساحرہ کی جگہ جادوگرنی بنا کے پیش نہ کیا تو میرا نام بھی ایڈم بن...... آدم بن محمد نہیں...... ہاں۔" چہرے پہ ہاتھ پھیر کے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔

میز پہ رکھے شاہی حکم نامے کی سیاہی سوکھ چکی تھی اور مومی مہر جم چکی تھی۔ ساتھ سجے قلم دوات اب اپنے لکھاری کے منتظر نظر آتے تھے۔

☆☆☆

صبح کی سفیدی نے ابوالخیر کی حویلی کے صحن کو روشن کر رکھا تھا۔ صحن کے کونے میں پنجوں کے بل بیٹھا فاتح مشکیزے سے پانی ہاتھوں میں بھرتا چہرے پہ ڈال رہا تھا۔ نماز کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور آج کسی نے دوبارہ آواز تک نہیں دی تھی۔ وہ اٹھا تو

روشنی پھیل چکی تھی۔

آستین سے گیلا چہرہ رگڑتا وہ کچن کی طرف چل دیا۔ زندگی عجیب مختلف سی ہو چکی تھی۔

وہ صبح کی میلوں فاصلے کی جاگنگ۔ وہ شام کا جم۔ وہ کے ایل کی عمارتوں کے کوریڈورز میں اپنے جیسے افراد کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے سیکرٹری کی بریفنگ سننا۔ وہ میٹنگز اور کانفرنسز کی سربراہی کرنا۔

وہ لوگوں سے بھرے ہال اور اسٹیج پہ کھڑا تقریر کرتا وان فاتح۔ وہ کیمروں اور مائیکس کے سامنے فلیش لائیٹس کی چمک میں انٹرویو دیتا آدمی۔ وہ سب کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔

بجلی اور برقی آلات سے غیر مانوس ایک قدیم شہر میں وہ پھنس گیا تھا جہاں وہ صرف ایک قیدی غلام تھا۔ اور کچھ نہیں۔ یہ سب کہاں جا کے ختم ہو گا؟ وہ اس بارے میں کم سے کم سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔

خیالات کو ذہن سے جھٹکتا ہوا وہ باورچی خانے میں آیا تو سب مصروف نظر آتے تھے۔ ایک طرف دیگچے میں غلاموں کے لیے پھیکا بدمزہ دلیہ بن رہا تھا۔ باقی تمام چولہوں پہ ابوالخیر اور اس کے اقارب کے لیے شاہانہ ناشتے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے آیا اور چاولوں کا تھال اٹھایا تو نگران باورچی نے روک دیا۔

"تم رہنے دو۔" کڑاہی میں آٹے کے پیڑے تلتے ہوئے وہ عام سے انداز میں بولا۔ "تمہارے لیے نیا لباس رکھا ہے۔ وہ تم پہن لو۔ اور ابھی آرام کرو۔ کوئی کام ہوا تو بلوا لوں گا۔"

فاتح بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ پھر بے دلی سے تھال پرے رکھا اور اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ وہاں نئی پوشاک رکھی تھی۔ صاف ریشمی ٹوپی۔ نئے جوتے۔ عجیب وحشت ناک چیزیں تھیں وہ۔ جیسے آہنی بیڑیاں اتار کے طلائی بیڑیاں پہنائی جا رہی ہوں۔

کچھ دیر بعد وہ نیا لباس پہنے ماتھے پہ سبز پٹی باندھے اصطبل کے زینوں پہ بے کار سا بیٹھا تھا۔ اس کی طرح کے دو اور غلام بھی آج نئے لباس میں آگے پیچھے ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔ ان کا بھی یہ آرام کا دن تھا۔

کسی بڑی قربانی سے پہلے کا آرام!

اصطبل میں جگہ جگہ گھوڑے بندھے تھے۔ ہر گھوڑے کی اپنی کوٹھڑی تھی جس میں وہ آرام سے ـــــ کچھ کھاتا پیتا نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں وہ البینو غلام ایک گھوڑے کو باہر نکال کے لایا اور اس کی گردن کے چمک دار بال کھینچنے لگا۔ (بال گھڑ سواری کے دوران مشکل پیدا کر سکتے ہیں' اس لیے ان کو سنوار کے کھینچ کے اکٹھا کیا جاتا ہے تاکہ وہ سمٹے رہیں۔)

فاتح ایک دم آستینیں چڑھاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"خبردار...... رکو۔" لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آیا۔ "اس کے بالوں کو مت چھوؤ۔ ابھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گھوڑے کے کھانے کے وقت سے پہلے اس کے بالوں کو نہیں چھوتے۔"

البینو نے رخ نہیں موڑا نہ ہی کوئی تاثر دیا۔ بس سنجیدہ چہرے کے ساتھ جھٹکے سے بال چھوڑ دیے۔ فاتح نے ایک گہری نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

البینو نے اکھڑا اکھڑا سا چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ ارد گرد کام کرتے غلام بھی رک کے ان دونوں کو دیکھنے لگے تھے۔ وہاں ابوالخیر کا کوئی سپاہی موجود نہ تھا۔ سارے کام غلام ہی نبٹا رہے تھے۔

"اس گھوڑے کو واپس اندر لے جاؤ۔ ویسے بھی یہ ٹھوس بھورے رنگ کا ہے۔ ٹھوس رنگوں کے گھوڑوں کو سدھانا مشکل ہوتا ہے' یہ کام تم سے نہیں ہو گا۔ وہ سفید گھوڑا جس میں بھورے دھبے ہیں..... (بازو لمبا کر کے تحکم سے ایک طرف اشارہ کیا۔) اس کو لے کر آؤ اور اس کے بالوں سے شروع کرو۔ دھبوں والا گھوڑا اتنا اتھرا نہیں ہوتا۔"

البینو نے تلخی سے گھوڑے کی لگام کھینچی اور پورا اس کی طرف گھوما تو آنکھوں میں غصہ تھا۔

"تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟"

''تا کہ یہ گھوڑا تمہیں دولتی مار کے ہلاک نہ کر دے۔ خدا کی قسم' اگر اس نے ایسا کیا تو ابوالخیر کو تم سے زیادہ گھوڑے کے پیروں کی فکر ہوگی۔''

''اور کیا تمہیں ہماری فکر ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم تو اب جا رہے ہو۔ اگلے ہفتے نیلامی ہے جس میں تمہیں فروخت کر دیا جائے گا۔ کسی رئیس یا سلطان کے محل میں تم عیش کرو گے۔''

فاتح قدم بہ قدم چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''میرا نام فاتح بن رامزل ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی وعدے نہیں توڑے۔ کبھی اپنے لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ غور سے سن لو میری بات۔'' کہہ کے وہ اپنے قدموں پہ آہستہ آہستہ گھوما۔

اردگرد کام روک کے کھڑے تمام غلام یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

''پچھلے ایک ماہ میں ہر روز جب میں تم سے ملتا ہوں تو ایک ہی بات کہتا ہوں۔'' اس کی آنکھیں ایک غلام سے دوسرے تک کا سفر کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ''کہ اپنے لیے لڑنا سیکھو۔ کسی کو اجازت مت دو کہ وہ تمہیں جسمانی اذیت پہنچائے یا تمہیں اپنا غلام بنائے۔ اللہ نے ہم سب کو آزاد پیدا کیا ہے مگر کچھ انسان ہم سے یہ آزادی چھین لیتے ہیں۔ آزادی واپس لینے کے لیے لڑنا پڑتا ہے' جان مارنی پڑتی ہے۔ اور اگر تم لوگ....'' اس کی آواز دھیمی مگر صاف تھی۔ سب دم سادھے سن رہے تھے۔

''اگر تم لوگ اپنے لیے نہیں لڑ سکتے' تو بھی میں تمہارے لیے لڑوں گا۔ میں تمہارے لیے واپس آؤں گا۔ میں تمہیں اس قید سے نکالوں گا۔ میں اپنے لوگوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور مجھے وعدے نبھانے آتے ہیں۔''

وہ واپس البیتو کی طرف گھوما۔ البیتو کے کندھے ڈھیلے پڑ چکے تھے البتہ آنکھوں کا شاکی پن کم نہ ہوا تھا۔

''اس لیے جب فاتح بن رامزل تمہیں حکم دے کہ گھوڑے کے شر سے خود کو بچاؤ تو اس حکم کی تعمیل کرنا سیکھو۔ مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو مجھ پہ بھروسہ نہیں کرتے!''

پھر اس نے بھورے گھوڑے کی گردن تھپتھپائی۔ گھوڑے نے فوراً سر اس کی طرف جھکا دیا۔

''تم ادھر آؤ!'' ایک دوسرے غلام کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ سارے کام چھوڑ کے بھاگا چلا آیا۔

''اس کو کھانا کھلاؤ' اور پھر استرا لے کر اس کے بال اطراف سے کاٹ دو' مگر تب جب وہ پرسکون ہو۔ پھر اس کے بالوں کی مینڈھیاں بناؤ تا کہ وہ گردن کے ایک طرف پڑی رہیں۔ ہر تیسرے دن تم اس کی مینڈھیوں کو کھول کے کنگھا کر کے دوبارہ ان کو گوندھ دو گے تا کہ اس کا ایک بھی بال خراب نہ ہو۔''

غلام نے ادب سے سر کو خم دیا۔ فاتح نے گھوڑے کی گردن سے ہاتھ ہٹایا اور ایک آخری نظر البیتو پہ ڈالی جو قدرے نرم' قدرے خفا سا کھڑا تھا۔

''میں تمہارے لیے واپس آؤں گا' لیکن صرف تب جب تم مجھ پہ بھروسہ کرو گے۔ معجزے صرف ان لوگوں کو ملتے ہیں جو معجزوں کے ہونے پہ یقین رکھتے ہیں۔'' اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تمام غلام راستہ چھوڑ کے ادھر اُدھر ہو گئے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا، چلتا ہوا جا رہا تھا اور وہ مڑ مڑ کے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ان کے میلے' گدلے فاقہ زدہ چہروں پہ ڈھیروں امید تھی اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی۔

☆☆☆

''سلطنت محل'' کا دربار اس دوپہر ویران ویران سا لگتا تھا۔ درباریوں کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ تخت پہ سلطان مرسل شاہ بیٹھا، میز پہ رکھے کاغذ دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی نازک سی پیالی سے قہوے کے گھونٹ بھی بھر رہا تھا۔

اس کے کندھے کے قریب کھڑا راجہ مراد ایک کے بعد ایک کاغذ اس کے سامنے رکھتا اور اس کے

متن سے آگاہ کرتا۔

''ہم آپ کے چچا (سابق سلطان) کے مقرر کردہ تمام اعلا عہدیداروں کو ان کے عہدوں سے معزول کر کے اپنے وفادار آدمی ان جگہوں پہ بٹھا رہے ہیں۔ یہ کوتوال کی تعیناتی کا حکم نامہ ہے' آقا! آپ مہر لگا دیجیے۔'' کہتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے مرسل کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بھی دیکھ رہا تھا۔

''مفید بن غالب۔'' مرسل نے گھونٹ بھرتے ہوئے نئے کوتوال (پولیس چیف) کا نام پڑھا۔ ''کیا یہ آدمی سابق کوتوال سے زیادہ اچھا ہے؟ سابق کوتوال اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا' مراد۔'' اسے جیسے اچنبھا ہوا۔

''بالکل آقا' وہ مقبول تھا مگر وہ آپ کے چچا زاد بھائیوں کا حامی ہے۔'' مراد جلدی سے بولا۔

تیز چمکتی آنکھیں مرسل کے چہرے پہ جمی تھیں۔

''آپ کے چچا زاد بھائی (سابق سلطان کے بیٹے) سلطان بننا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو آپس میں لڑوا کے محل سے نکالا تھا۔ وہ مفرور ہیں مگر کبھی نہ کبھی واپس آنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ ایسے میں پولیس چیف ان کا حمایتی ہوا تو شہر کی پولیس ان کی مدد کرے گی۔ ہمیں ہر اعلا عہدے پہ اپنے وفادار لوگ چاہئیں آقا۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر......'' مرسل نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ''یہ آدمی...... ایک تاجر ہے۔ کیا یہ شہر کی پولیس سنبھال سکے گا؟''

''آقا! ملازم رکھنے کی سب سے بڑی شرط وفاداری ہوتی ہے۔ وہ آقا کو دشمنوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس سے بڑھ کر ہمیں کیا چاہیے؟''

''ہاں یہ بھی ہے۔'' مرسل آگے جھکا اور مہر اٹھا کے کاغذ پہ ثبت کی۔ راجہ مراد نے جلدی سے کاغذ کو تہ کر کے سمیٹا اور پھر دوسرا کاغذ سامنے کیا۔

''میں شہر کا قاضی بھی بدل رہا ہوں۔ عارف بن مہور اپنا قاضی ہوگا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے سوداگر ہے مگر قرآن و حدیث اور علم فقہ میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔''

''گزشتہ قاضی اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے مشہور تھا' مراد۔'' مرسل نے قدرے الجھن سے پہلو بدلا۔ ''اور یہ آدمی تو سوداگر ہے۔ یہ عدالتیں کیسے چلائے گا۔''

''آپ کا خدشہ درست ہے آقا! مگر کیا چیز زیادہ بہتر ہے؟ ایک مقبول قاضی جو کسی بھی وقت دشمنوں سے جا ملے اور آقا کو قید یا جلاوطن کروا دے یا ایک ایسا قاضی جو آقا کا وفادار ہو؟''

مرسل نے جواب نہیں دیا۔ بس بے زاری سے مہر اٹھا کے ثبت کی تو مراد نے گہری سانس خارج کی۔ پھر اگلا کاغذ سامنے رکھا۔

''یہ نئے سفیروں کی فہرست ہے جن کو ہم دوسرے ممالک میں آقا کے ترجمانوں کی حیثیت سے بھیجیں گے' یہ لوگ میرے وفادار اور پرانے جاننے والے ہیں۔ یہ آقا کی ایسی حفاظت کریں گے جیسی میں کرتا ہوں۔'' وہ اب نئے نئے صفحات سامنے رکھ رہا تھا اور مرسل شاہ ان پہ مہریں ثبت کر رہا تھا۔ درمیان میں جمائی روکنے کے لیے اس نے منہ پہ ہاتھ رکھا اور بولا۔

''بس یا اور؟''

''یہ محکمہ اوقاف کے نئے سربراہ کا حکم نامہ ہے۔ یہ شہر کا معروف تاجر ہے اور اس کا کاروبار تین براعظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ گزشتہ وزیر اوقاف بہت مقبول تھا کیونکہ وہ غریبوں تک زکوٰۃ اور صدقات کے پیسے ایمانداری سے پہنچاتا تھا مگر یہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کے یہ ہمارا وفادار ہے۔''

مرسل شاہ نے بغیر مزاحمت کے کاغذ پہ مہر ثبت کی اور پیچھے کو ٹیک لگالی۔ مراد نے تمام کاغذات موڑ کے ایک طشت میں رکھے اور ساتھ ہی نرم روی سے

کہنے لگا۔

"آقا...... طاقت حاصل کرنا کمال نہیں ہے۔ طاقت کو برقرار رکھنا اصل فن ہے۔ کوئی بھی شخص تنہا حکومت نہیں چلا سکتا۔ اس کو طاقتور لوگوں کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے تاکہ سب مل کے آقا کے تخت کی حفاظت کریں۔ جب تک ہم اہم عہدوں پہ اپنے لوگ نہیں بٹھائیں گے، ہم سلطنتِ ملاکہ کو اپنے طریقے سے نہیں چلا سکیں گے۔"

"ہوں۔" وہ بےزار سا ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر یوں ہی سرسری سا بولا۔ "تمہاری بیٹی...... تاشہ...... ہم نے ان کا ذکر پہلے نہیں سنا۔"

طشت میں کاغذوں کے دستے سجاتے مراد کے ہاتھ تھمے۔ پھر آہستہ سے آنکھوں کو گھما کے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اپنی جواہرات سے مزین انگوٹھیوں کو انگلیوں میں گھماتا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔

"تاشہ میری پہلی بیوی سے ہے۔" مراد تول تول کے کہنے لگا۔ "ملک کے حالات اچھے نہ تھے، اس لیے میں نے اس کو چین میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے بھیج دیا تھا۔ مگر جب میرے ملک کی باگ ڈور ایک ایسے سلطان کے ہاتھ میں آگئی (مرسل کی طرف اشارہ کیا) جو اپنی قوم کی حفاظت کرنا جانتا ہے تو میں نے اسے بلوا لیا (مرسل شاہ نے مسکرا کے فخر سے گردن ذرا اکڑائی۔) اب ملاکہ میں رہنا اس کے لیے محفوظ ہے اور تالیہ کے کھونے کے بعد میں بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ مجھے امید ہے وہ آقا کے دربار کے لیے نیک بخت ثابت ہوگی۔"

"ہاں، بالکل۔" مرسل شاہ مسکرا کے کھڑا ہوا اور ہاتھ کمر پہ باندھے چبوترے کے زینے اترتا گیا۔ وہ تازہ دم سا خوشگواریت میں گھرا نظر آتا تھا۔

طشت میں باقی حکم نامے رکھتے مراد نے غور سے اس کی پشت کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ پنہاں تھی۔

بنداہارا کے محل کے پائیں باغ کا آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا نظر آرہا تھا۔ دوپہر کے باوجود باغ میں ٹھنڈی چھایا سی پھیلی تھی۔ شہزادی تاشہ کنیزوں اور غلاموں کی معیت میں روش پہ قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پیروں تک آتا زرتار جامنی گاؤن پہنے، سر پہ تاج سجائے وہ معمول کے مطابق سولہ سنگھار سے آراستہ تھی۔

باغ کے وسط میں ایڈم کھڑا تھا۔ پاجامے پہ اوور کوٹ نما گاؤن پہنے، سر پہ ٹوپی اوڑھے وہ سنجیدہ نظر آتا تھا۔ جب تالیہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے بھی سر پورا جھکا کے اٹھایا۔

"شہزادی!"

"شاہی مؤرخ میرے ساتھ آئے۔" دو انگلیوں سے اشارہ کیا اور روش پہ آگے بڑھ گئی۔ کنیزیں اور خادم پیچھے رہ گئے اور مؤرخ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ (کنیزیں کافی فاصلہ رکھ کے پیچھے چلنے لگیں۔)

"تم نے اپنی کتاب لکھنی شروع کر دی، ایڈم!" سینے پہ بازو لپیٹے، وہ چلتے چلتے پوچھنے لگی۔ ایڈم نے ایک جلی بھنی نظر اس پہ ڈالی۔

"جی، میں نے سارا قصہ لکھ لیا ہے کہ کس طرح مرسل شاہ اور پرانے بنداہارا نے مرسل کے چچا کا تخت الٹا، اس کو مارا، اس کے بیٹوں کو محل بدر کیا اور خود تخت پہ قبضہ جما لیا۔ اس سارے کام میں سابق بنداہارا کی مدد کرنے والا مرسل کا پھوپھی زاد بھائی راجہ مراد تھا۔ تخت پہ قبضے کے بعد جب مرسل اپنے کزن کو محل میں لے آیا تو مراد نے سب سے پہلے سابق بنداہارا کا پتا صاف کیا اور اس کو مروا دیا۔ پھر خود بنداہارا بن بیٹھا۔ اب میں اس مقام پہ پہنچ چکا ہوں جہاں مجھے (کھنکھار کے بولا) مراد راجہ کی بیٹی کا تعارف لکھنا ہے۔"

"بہت خوب۔" تالیہ نے محظوظ انداز میں اردگرد لہلہاتے درختوں پہ نظر دوڑائی۔ "تو پھر لکھنا شروع کرو۔"

"تو پھر لکھو کہ شہزادی تاشہ بنتِ مراد ملاکہ کی سب سے حسین شاہزادی تھی۔ (سنہری بالوں کو

جھٹکا) اتنی حسین کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے' آنکھیں خیرہ ہو جاتیں' شہر کے سارے رئیس اس پہ جان دیتے اور......"

"اللہ کو جان دینی ہے میں نے بے تالیہ۔" اس نے دونوں کان چھوئے۔ "اتنا جھوٹ؟ یا اللہ...... ایسی کوئی حسین بھی نہیں ہیں آپ۔ اتنا زیور اور کامدار کپڑے کسی کو بھی پہنا دیں تو وہ خوبصورت ہی لگے گا۔"

"اچھا تم بھی پہن لو...... تو خوب صورت لگو گے؟"

"میں خواتین کی بات کر رہا تھا' اچھا اور یہ جن بالوں پہ آپ بہت فخر کرتی ہیں نا' مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ڈائی شدہ ہیں۔"

تالیہ نے (ہونہہ) سر جھٹکا' پھر آگے چل دی۔ گردن اٹھا کے مسکرا کے درختوں کو دیکھتی ہوئی ایک دفعہ پھر سے شروع ہو گئی۔

"لکھو کہ اس نے چین میں اعلا پائے کے اساتذہ سے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ ہر طرح کے علوم وفنون سے آراستہ تھی۔"

"کون سے اساتذہ؟ کون سے علوم وفنون؟ یہ ایک مہینہ ملاکہ میں رہ کے چند باتیں کیا سیکھ لیں آپ نے' آپ تو بھول ہی گئیں کہ ساری عمر آپ ملائیشیا کی گلیوں میں بٹوے چرائی اور جیبیں کاٹتی رہی ہیں۔"

مگر وہ اثر لیے بغیر بولتی جا رہی تھی۔

"لکھو کہ وہ بارہ زبانیں جانتی تھی۔" پھر ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے سوچا۔ "اوں ہوں، بارہ زیادہ ہو جائیں گی۔ آٹھ کر دو۔"

"آٹھ؟ آٹھ زبانیں؟" وہ جل بھن کے سیاہ ہوتا، گھوم کے اس کے سامنے آیا۔ "آپ مجھے ان آٹھ زبانوں کے نام بتا دیں جو شہزادی تاشہ کو آتی ہیں تو قسم خدا کی میں آپ کو مان جاؤں گا۔"

"تو سنو......" وہ انگلیوں پہ گنوانے لگی۔ "ملے' اردو' چینی' انگریزی۔" چار پہ گنتی ختم ہو گئی تو رکی۔

ایڈم نے اپنے پوروں پہ گنتے ہوئے فاتحانہ ابرو اٹھایا۔

"چار زبانیں رہتی ہیں ابھی۔"

مگر شہزادی کی اٹھی گردن میں ذرا بھی جھکاؤ نہ آیا۔ مسکرا کے بولی۔ "ٹیکسٹ میسیجز والی رومن ملے' ٹیکسٹ میسیجز والی رومن اردو... رومن چینی اور رومن انگریزی جو ملے حروف تہجی میں لکھی جاتی ہے۔ لو...... آٹھ زبانیں پوری ہوئیں۔ اب آگے لکھو......"

مسکرا کے آگے بڑھ گئی اور وہ دانت کچکچاتا پیچھے لپکا۔

"لکھو کہ اس کی رحم دلی کے قصے سارے ملاکہ میں مشہور تھے' وہ اتنی رحم دل تھی کہ......" اونچے گملوں میں رکھے پھولوں کے اوپر سے ہاتھ گزارتی وہ خوش گوار موڈ میں بول رہی تھی۔

"کہ نیک معصوم لوگوں کو گرفتار کروا دیتی تھی' کال کوٹھڑیوں میں بند رکھتی تھی اور...... اور......" وہ جلا بھنا سا کہہ رہا تھا مگر وہ رکی اور پھر سے اس کی طرف گھومی تو چہرے پہ برہمی تھی۔

"ابھی بلوا لیا نا میں نے اس کنگال رائٹر ابوبکر کو اور اس نے اپنا تھیلا پہچان لیا' تو دایاں ہاتھ کٹے گا تمہارا۔ دایاں!"

"یعنی آپ ظلم و جبر سے مجھ سے جھوٹ لکھوانا چاہتی ہیں؟ مطلب کہ...... آپ کی وہ ساری تعریفیں جو بنگارایا ملایو میں لکھی گئی تھیں' وہ آپ نے مؤرخ کو ڈرا دھمکا کے لکھوائی تھیں۔"

"اور نہیں تو کیا۔ ویسے بھی مؤرخ بڑے دو نمبر لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بادشاہوں کی عظمت کے قصے جو ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں' وہ کوئی سچ تھوڑا ہی ہوتے ہیں؟ خوشامدی' درباری' ٹپیکل لالچی مفاد پرست مؤرخ۔" وہ اس کے الفاظ معصومیت سے لوٹا رہی تھی۔

"میں نہیں بنوں گا ایسا مؤرخ' اچھا۔" اس کی رنگت گلابی پڑ گئی تھی۔ "اور اگر آپ ظلم و جبر سے مجھ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھوا بھی لیں تو اس میں برکت نہیں ہو گی۔ جھوٹ جس چیز میں بھی شامل ہو جائے' اس کی برکت لے جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، شریفہ کنیز بھاگتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ تالیہ رکی اور دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے دیکھنے لگی۔

"شہزادی!" اس نے جھک کے تعظیم پیش کی اور ایک تہ شدہ کاغذ اس کے سامنے کیا۔ تالیہ نے کاغذ کھولا اور پڑھا۔

ہر لفظ کے ساتھ پیشانی پہ بل پڑتے گئے۔ شریفہ کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ فوراً ہٹ گئی۔

"یہ کیا ہے، چے تالیہ؟" وہ اس کے چہرے کی سنگینی دیکھ کے سنجیدہ ہوا۔

"آج کے جاری ہونے والے حکم ناموں کی ایک نقل۔" وہ فکرمند نظر آ رہی تھی۔ "راجہ مراد نے شہر کا کوتوال (پولیس چیف)، قاضی، وزیرِ اوقاف اور سفیروں کو بدل دیا ہے۔ اس نے پرانے عہدیداروں کی جگہ اپنے دوست لگا دیے ہیں۔"

"تو آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ نئی حکومت آتی ہے تو چہرے تو بدل ہی جاتے ہیں۔"

وہ چند لمحے ایڈم کو دیکھتی رہی۔ "حکومت کیا ہوتی ہے، ایڈم؟"

"حکومت...... مطلب بادشاہ، وزیر...... یا ہمارے دور میں وزیرِ اعظم اور پارلیمنٹ کے ممبرز وغیرہ۔"

"تمہارے خیال میں یہ لوگ ملک چلاتے ہیں؟"

"ہاں، کیونکہ یہ حکمران ہوتے ہیں۔"

"غلط...... کسی بھی ملک کو صرف اس کا وزیرِ اعظم، بادشاہ یا پارلیمنٹ ممبرز نہیں چلاتے۔ ملک کو اس کے 'ادارے' چلاتے ہیں۔"

"ادارے؟" ایڈم نے سوالیہ ابرو اٹھایا۔

"ہاں۔ جیسے عدلیہ کا ادارہ، پولیس کا ادارہ، فوج کا ادارہ، زکوٰۃ، صدقات تقسیم کرنے کا ادارہ، خزانے کا ادارہ، سفارت کاری کا ادارہ، ملک اداروں سے مل کے بنتا ہے اور ملک تب مضبوط ہوتا ہے جب اس کے ادارے مضبوط ہوتے ہیں۔"

"ادارے مضبوط، مطلب؟" وہ دونوں پھر سے روش پہ چلنے لگے تھے مگر ان کی گفتگو کی نوعیت بدل چکی تھی۔

"یعنی جب ان اداروں کے سربراہ قابل اور ایماندار لوگ ہوں گے تو ہی ادارہ مضبوط ہوگا۔ شہر کا قاضی ایماندار ہوگا تو بادشاہ کو بھی کٹہرے میں لے آئے گا۔ کوتوال ایماندار ہوگا، تو شہزادے کو بھی گرفتار کر لے گا۔ لیکن جو بادشاہ اور بنداہارا صرف اپنی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، وہ مضبوط ادارے برداشت نہیں کر سکتے۔"

"یعنی وہ اداروں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تا کہ ادارے ان کے جرائم پکڑ نہ سکیں۔"

"بالکل اور اداروں کو کمزور کیسے کیا جاتا ہے بھلا؟"

"آپ بتایئے...... کیسے؟" وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"میرٹ ختم کر کے۔ اب بتاؤ مجھے میرٹ کیا ہوتا ہے؟"

"میرٹ یعنی...... یعنی...... مجھے معلوم ہے میرٹ کیا ہوتا ہے مگر......"

"میرٹ کا مطلب ہوتا ہے، نوکری اس کو دی جائے جس میں دو باتیں ہوں۔ وہ اس کام کا اہل ہو اور وہ ایمان دار ہو۔ یہ وان فاتح سے سنا تھا میں نے۔ مگر راجہ مراد جیسے لوگ اداروں کے سربراہ ایسے لوگوں کو بنا دیتے ہیں جو نہ ایمان دار ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کام کے اہل۔ یہ لوگ......" اس نے کاغذ لہرایا۔ "یہ ابن الوقت لوگ ہیں۔ ان کو عدلیہ یا پولیس کی الف بے بھی نہیں آتی مگر ان کو صرف راجہ کی دوستی کے باعث عہدہ ملا ہے۔"

"مگر چے تالیہ...... حکمرانوں کو یہ عہدے اپنے وفادار لوگوں کو دینے پڑتے ہیں تا کہ ان کا تخت محفوظ رہے۔ اب اگر راجہ نے میرٹ کو پس پشت ڈال کے خود سے مخلص لوگوں کو یہ عہدے دے دیے تو اس میں

ایسا غلط کیا ہے؟"

جواب میں تالیہ نے گہری سانس لی اور ہاتھ سے، دور ہاتھ باندھے کھڑے خادموں اور کنیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ راجہ کے ذاتی ملازم ہیں۔ ان کو ملازمت پہ رکھتے وقت کیا راجہ نے صرف وفاداری دیکھی ہوگی؟ یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ ان کو کام کرنا بھی آتا ہے یا نہیں؟ باورچی خانے میں کیا راجہ کسی ایسے غلام کو جگہ دے گا جس کو چائے تک نہ بنانی آتی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"کیا راجہ جیسے عہدے دار اپنے گھروں اور دفتروں میں اہلیت اور ایمانداری دیکھے بغیر کسی کو نوکری دیتے ہیں؟ کیا وہ اپنے ذاتی کاروبار کا اکاؤنٹنٹ کسی بے ایمان آدمی کو بنا دیتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو ملک کے اداروں کی باگ ڈور بغیر میرٹ کے کیوں کسی کے حوالے کر دیتے ہیں؟"

"کیونکہ......" ایڈم نے گہری سانس لی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ "وہ ملک کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے۔"

ایڈم دھک سے رہ گیا۔ وہ اب سر جھکائے کاغذ کو پھر سے پڑھ رہی تھی۔ اس کی صبیح پیشانی سلوٹ زدہ تھی۔ وہ فکر مند تھی۔ وہ ملاکہ کے لوگوں کے لیے فکر مند تھی۔

"راجہ آتے کے ساتھ ہی ہر ادارے کو کنٹرول کر رہا ہے یقیناً کچھ ایسا ہے جو وہ کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ادارے اس کے خلاف کھڑے نہ ہوں۔ ایسا کیا ہے جو راجہ چھپا کے کر رہا ہے۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

ایڈم بس چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

"تمہیں میں نے اپنے ساتھ اس لیے رکھا ہے ایڈم کیونکہ ہمیں مل کے چابی ڈھونڈنی ہے۔ تمہیں اپنی کتاب میں میری تعریفیں لکھنی پڑیں گی تاکہ راجہ کو یہ لگے کہ میں خوشامد سے خوش ہوتی ہوں اس لیے ایک خوشامدی کو ہر جگہ ساتھ لیے پھرتی ہوں۔ اس طرح کسی کو میرے اور تمہارے تعلق پہ شک نہیں ہوگا اور ہم ساتھ کام کر سکیں گے۔ ہمیں راجہ مراد کا راز بھی کھوجنا ہے، اور وہ چابی بھی۔ میں ابھی تک راجہ کے کمرے میں نہیں جا سکی۔ کسی دن ہمیں اس کمرے کی تلاشی بھی لینی ہوگی اور......" وہ ٹھہری اور آواز دھیمی کی۔ "مجھے لگتا ہے خزانہ واقعی ہے۔ کوئی خزانہ جو ہمارا منتظر ہے...اور اسے صرف میں اور تم نکالیں گے۔ اس لیے تم......تم لکھو یہ سارے جھوٹ میرے بارے میں۔ میں جانتی ہوں میں اتنی اچھی نہیں ہوں مگر ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لیے یہ کرنا ہوگا اور جو ہمیں کرنا آتا ہے، وہ......"

"وہ ہمیشہ ہماری جان بچاتا رہے گا۔" ایڈم نے سمجھ کے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ وہ اب دور کھڑی کنیز کی طرف گھوم چکی تھی۔

"شریفہ!" ایک آواز پہ کنیز دوڑی چلی آئی۔

"ابوالخیر کو پیغام بھیجو کہ اس کو وزیر خزانہ بنا دیا گیا ہے۔"

"مگر شہزادی، اس کو تو یہ خبر کب کی مل چکی ہو گی۔"

"وہ بھی آگے سے یہی کہے گا۔ پھر جواب میں کہنا کہ اگر خبر مل گئی تھی تو شہزادی کے شکریے کے لیے وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟" بگڑے ہوئے موڈ میں بولی اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے آگے بڑھ گئی۔

ایڈم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہیں گھاس پہ بیٹھا اور اپنا دستہ کھول لیا۔ قلم کی نوک سیاہی میں ڈبو کے کاغذ پہ جمائی اور پھر دوبارہ سے تالیہ کو دیکھا جو اب برآمدے کے زینے چڑھ رہی تھی۔ بال کندھوں پہ جھول رہے تھے اور رنگت دھوپ میں سنہری لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ تھی۔ گہری سوچ۔

اس کے سراپے کو نظروں میں رکھے، ایڈم کاغذ پہ الفاظ اتارنے لگا۔

''نام تھا جس کا تاشہ بنت مراد
تھی وہ ملاکہ کی سب سے حسین شاہزادی
نہ تھا اس کا حسن صرف ظاہری
بلکہ روشن تھا اس کا باطن بھی۔
نیت تھی اپنے ملک کے لیے نیک' اور دل تھا غریب پرور
سمجھتی تھی وہ سیاست کی دانائی کو خوب خوب
بلکہ اگر تم پوچھو مؤرخ سے تو شاید وہ کہے
کہ ملایا کے سارے جزیروں میں سب سے زیادہ
بس وہی ہر بات کو سمجھتی تھی۔''

وہ دل سے لکھ رہا تھا۔ اپنے اندر کے لکھاری کو دریافت کر رہا تھا۔ اور تالیہ کے اندر کی شہزادی کو صدیوں کے لیے ''ملایا کے پھول'' کے صفحات میں قید کر رہا تھا۔

اس شام عصر کے بعد سے ہی آسمان سیاہ بادلوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ قدیم ملاکہ پہ سایہ سا ہو گیا اور پھر موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ گلیاں اور چوبارے لمحوں میں جل تھل ہو گئے۔ لوگ گھوڑے اور جانور جلدی جلدی اندر باندھنے لگے۔ سڑکوں پر خوانچہ فروش اپنا سامان ڈھانپ کے گھروں میں گھس گئے۔ بارش نے سارا شہر سنسان کر دیا۔

اپنی کوٹھڑی میں نیچے بیٹھا فاتح کپڑے تہ کر رہا تھا۔ ایک چمڑے کا سفری تھیلا اسے مہیا کیا گیا تھا جس میں اس نے اپنے استعمال کی چیزیں بھرنی تھیں۔ کل نیلامی کے بعد اسے اس تھیلے کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ ابو الخیر کے تربیت یافتہ غلام اعلا آداب و اخلاق سے آراستہ ہوتے تھے' ان کا سامان' ان کا لباس ہر شے ان کے اعلا ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتی تھی، اسی لیے وہ مہنگے داموں فروخت کیے جاتے تھے' مگر صرف امراء اور سلاطین کو۔

''کیا تم واقعی ہمیں یاد رکھو گے؟''

آواز پہ وہ چونکا۔ کپڑوں کو تہ کرتے ہاتھ تھمے۔ چوکھٹ پہ کم سن غلام لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور امید دونوں تھے۔

فاتح نے گہری سانس لے کر کپڑا پرے رکھا اور انگلی سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے آگے آیا اور اس کے بستر کے کنارے بیٹھا۔ (بستر فرشی تھا۔ گویا وہ دونوں زمین پہ ہی آمنے سامنے بیٹھے تھے)

''تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا؟''

لڑکے نے اداس آنکھیں اٹھائیں۔ ''کیونکہ ہم جیسوں کو کوئی یاد نہیں رکھتا۔''

''مفید!'' اس نے نرمی سے لڑکے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ''اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ ہم انسانوں کو کبھی کسی دوسرے کا غلام نہیں بننا چاہیے۔ نہ محبت میں' نہ مجبوری میں۔ تمہیں اپنے حق کے لیے لڑنا ہو گا اور جب تم جیسے لوگ اپنے لیے لڑیں گے تو دیکھنا...... کئی صدیوں بعد ایک زمانہ ایسا آئے گا جب انسانوں کو غلام بنانے کا یہ رواج ختم ہو جائے گا۔''

لڑکے کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ ''واقعی؟ یہ صدیوں پرانا رواج ختم ہو جائے گا؟''

''ہاں' مفید بن مہورا۔ ایک زمانہ آئے گا جب ظلم کا یہ رواج ختم ہو جائے گا...... تب لوگ صرف چند گھنٹے دوسروں کے ہاں ملازمت کریں گے' مگر ان کو بھاری تنخواہ ملے گی۔ مراعات' گھر' کھانا ملے گا۔ ان کے حقوق ہوں گے۔ وہ جب چاہیں نوکری چھوڑ کے جا سکیں گے۔ وہ آزاد ہوں گے۔'' مفید جیسے جیسے سنتا جا رہا تھا' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

''یہ زمانہ کب آئے گا؟''

فاتح چند لمحے خاموش رہا۔ ''باقی دنیا کے لیے یہ کئی سو سال بعد آئے شاید' مگر ملاکہ کے لوگوں کے لیے مرسل شاہ کے ہی عہد میں ایک وقت آئے گا جب کوئی تم سب غلاموں کو ان ظالم لوگوں سے نجات دلا دے گا۔''

''تم مستقبل کے بارے میں اتنا کیسے جانتے

ہو؟"

اس سوال پہ وہ زخمی سا مسکرایا۔

"یوں سمجھو، میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسے زمانے کا جب انسان آزاد ہو گا۔ میں تمہارے لیے وہ زمانہ تو نہیں لا سکتا لیکن تم سب کو ایک ایسے انسان سے ملوانے کا ذریعہ ضرور بننا چاہوں گا جو ملاکہ کی تاریخ بدلے گا۔ اس کے بعد اس ملک میں کم از کم چند سالوں تک کوئی کسی کو جبر سے اپنا غلام نہیں بنا سکے گا۔ بس تم... تم بھروسہ کرو۔"

"تم پہ؟"

"نہیں، اپنے آپ پہ۔" اس کے کندھے کو نرمی سے تھپکا اور واپس کپڑے تہہ کرنے لگا۔ لڑکا نا سمجھی اور اداسی سے اسے دیکھے گیا۔

آزادی کا خواب...... بہت عجیب مگر بہت خوش گوار تھا۔ باہر برستی بارش کی طرح جس میں اگر مٹی کی سوندھی مہک تھی تو خوفناک آوازوں کا ڈر بھی شامل تھا۔

☆☆☆

بارش ہنوز موسلا دھار برس رہی تھی۔ راجہ مراد کا محل اندھیرے میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ تیز ہوا درزوں سے اندر داخل ہوتی اور راہداریوں میں روشن مشعلوں کے شعلے پھڑپھڑانے لگتے۔ ایک راہداری سے تالیہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ تاج سر پہ تھا اور گردن بے نیازی سے اکڑی تھی۔ کنیزیں دائیں بائیں دو قدم پیچھے تھیں۔

دفعتاً وہ رکی۔ کنیزیں بھی فوراً رک گئیں۔

ایک طرف تنگ سے زینے نیچے کو جا رہے تھے۔ وہاں پہرے دار کھڑے تھے۔ تالیہ نے ابرو اکٹھے کیے۔

"نیچے کیا ہے؟"

"یہ راجہ مراد کے خزانے کا کمرہ ہے۔ محل چلانے اور دیگر اخراجات کے لیے تمام دولت یہیں رکھی جاتی ہے۔ اور قیمتی زیورات وغیرہ بھی۔ اس جگہ بھاری نفری تعینات رہتی ہے۔"

"کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟"

"راجہ کے علاوہ کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ وہ ہر روز اس جگہ کا معائنہ کرتے ہیں۔"

"ہوں۔ حیرت ہے، میں نے یہ پہلے نہیں دیکھا۔" اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔

کنیز شریفہ نے قدرے اچنبھے سے قدم اس کے پیچھے بڑھائے۔ (ہر روز تو شہزادی یہاں سے گزرتی ہے بلکہ اپنی آمد کے دوسرے روز تو اس نے اس جگہ کا پوچھا بھی تھا، تو اب؟) خیر۔ اس نے بھی سر جھٹک دیا۔ (شہزادی کی ادائیں)۔

اپنے کمرے میں آ کے اس نے شریفہ کو حکم دیا۔

"مؤرخ کو بلا بھیجو۔" وہ جیسے بیزار اور تھکی تھکی تھی۔

مؤرخ کو اس کے کمرے میں بھیج کے شریفہ اور دوسری کنیزیں چلی گئیں۔ اب باہر صرف دربان کھڑے تھے۔

ایڈم اندر آیا تو اس شاہی پُرتعیش کمرے کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ منہ کھل گیا اور گردن چاروں طرف گھوم گئی۔

اونچی چھت، ریشمی کپڑے سے مزین بستر، نرم قالین.... کرسٹل اور چینی کے بنے آرائشی برتن۔ لٹکتے ہوئے جھلملاتے فانوس جن پہ دیے سجے تھے۔

تالیہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ٹھٹک گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ شہزادی سے مختلف..... سیاہ پاجامے اور کرتے میں ملبوس، بال سیاہ ٹوپی سے ڈھک رکھے تھے۔ ایڈم نے منہ بنایا۔

"اتنے عیش سے رہنے والوں کا قیامت کے دن الگ سے حساب ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں، ایڈم! فوج کی نوکری سے نکال دیے جانے والوں کا حق بنتا ہے کہ وہ حسد کریں۔"

ایڈم کو اتنے ترش جواب کی امید نہیں تھی۔ اس کے سر پہ لگی تلووں پہ بجھی۔

"اصلی فوجی ہونا نقلی شہزادی ہونے سے بہتر ہوتا ہے، بے تالیہ۔"

www.urdusoftbooks.com

"تم بھول رہے ہو کہ راجہ مراد شاہی خاندان سے ہیں' اور میں بائی بلڈ شہزادی ہوں۔" گردن فخر اور استہزاء سے اکڑائی۔

"جی نہیں۔ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ ایک زمانے میں کے ایل کی گلیوں میں لوگوں کی جیبیں کاٹتی پھرتی تھیں۔"

"اور تم بھول رہے ہو کہ ابھی بلوالیا نا میں نے اس کنگال رائٹر کو تو تمہارا دایاں ہاتھ کٹے گا۔ دایاں!"

اس پہ ایڈم نے زور سے ہونہہ کیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

"کہیے۔ کیوں بلوایا ہے؟ اپنی مزید جھوٹی تعریفیں لکھوانے کے لیے؟ یاد رکھیے گا' اللہ کو جان دینی ہے میں نے' اس لیے......"

"آج بارش ہو رہی ہے اور محل کے باہر تعینات پہرے دار پناہ کے لیے اندر گھس گئے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تو ایڈم خاموشی سے سننے لگا۔

"نیچے ایک کمرہ ہے جہاں راجہ اپنا خزانہ رکھتا ہے۔ اس کمرے کی تلاشی کا آج سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں کافی دنوں سے اس کی تاک میں تھی۔"

"اوہ، تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ بھی سنجیدہ ہوا۔

"تم اس رسی کو پکڑو گے۔ میں کھڑکی سے نیچے جاؤں گی اور اس کمرے کے روشن دان سے اندر اتر جاؤں گی۔ کمرہ خالی ہوتا ہے۔ اور محل کے سبزہ زار پہ اس وقت پہرے دار بھی نہیں ہیں اس لیے کوئی مجھے نہیں دیکھے گا۔"

"کیا راجہ نے وہ چابی یا ایسی کوئی چابی وہاں چھپائی ہوگی؟" اس کے اندر امید جاگی۔

"بالکل یہ ہو سکتا ہے اور......" وہ رکی۔ تذبذب سے ایڈم کے تاثرات دیکھے۔ "اور کیا معلوم اس کمرے میں راجہ کے خزانے پہ ہمارا نصیب لکھا ہو۔"

ایڈم کی آنکھیں اچنبھے سے پھیلیں۔ "کیا مطلب؟"

"ایڈم......" وہ دبے دبے جوش سے کہتی، قریب آئی۔ "وہ خزانہ جس کی مجھے تلاش تھی' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اور تم اس کو تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ یہ خواب آنے والے وقت کا ہے۔ یہ واقعہ ابھی 'ہونا' ہے۔"

"اف ہے چہ تالیہ، اللہ کی پناہ! آپ اس خزانے کا خیال دل سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔" ایڈم نے بے اختیار سر پہ ہاتھ رکھا۔ "اس خزانے کے لالچ نے ہمیں وقت کا قیدی بنا ڈالا ہے۔ اس لیے اس کو بھول جائیں اور صرف چابی تلاش کریں۔"

"اگر ایسا خزانہ ہوا تو کیا تم......"

"بھول جائیں اس خزانے کو۔ رسی لٹکائیں اور نیچے اتریں۔" وہ جھنجلا کے بولا تو وہ چپ ہوگئی اور زبردستی مسکرائی۔

"شیور، میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

چند منٹ بعد وہ اس کمرے کے روشن دان سے اندر اتر رہی تھی۔ بلی کی طرح دیوار پہ سیدھی اتری، اس نے فرش پہ بنا آواز کے جست لگائی۔ پھر سانس روک کے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک مشعل روشن تھی۔ قطار میں چند صندوق رکھے تھے اور ان کے اوپر چند رجسٹر شیلف میں پڑے تھے۔ ہر صندوق کے اوپر حساب کتاب کی تختی لکھی تھی۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ ان پر تالے لگے ہوئے تھے۔ تالیہ نے ایک ننھی سلاخ جیب سے نکالی اور باری باری ان کے تالے کھولنے لگی۔

کل چھ صندوق تھے۔ کسی میں چاندی کے سکے تھے' کوئی طلائی سکوں سے آدھا بھرا تھا۔ کسی میں چند زیور تھے۔ ہر صندوق کے اندر بھی حساب کتاب کے پرچے پڑے تھے۔ راجہ ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا' یعنی وہ ایک بھی شے نہیں چرا سکتی تھی۔ ویسے بھی ان صندوقوں نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ محل کے اخراجات کے لیے تھے۔ اور ان میں مال کچھ اتنا

زیادہ نہ تھا کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔ آخری صندوق تو ویسے بھی خالی تھا۔

وہ واپس رسی کی طرف آئی پھر رکی۔

آخری صندوق خالی تھا؟

وہ الٹے قدموں واپس آئی اور اس صندوق کو دوبارہ دیکھا۔

وہ باقی سب سے چھوٹا تھا۔ لکڑی کا صندوق جس کے اوپر نشان تھے۔ جیسے ضربیں لگی ہوں۔ تالیہ نے اس پہ ہاتھ پھیرا۔ لکڑی گیلی تھی۔ اس نے جھک کے دیا سلائی جلائی اور صندوق کے کونوں کو دیکھا۔ پھر ناخن سے اسے کھرچا۔ اندر ریت پھنسی تھی۔ اس نے ڈھکن کھولا۔ وہ خالی تھا۔ البتہ اس کے کونے میں ایک جگہ ایک سکہ پھنسا ہوا تھا۔ سونے کا سکہ جو پھنس جانے کے باعث نظر نہیں آیا تھا۔

تالیہ نے اسے زور سے کھینچا تو وہ نکل آیا۔ صندوق کے اندر بھی جگہ جگہ ریت کے ذرے تھے۔

وہ واپس اوپر آئی تو سانس چڑھا ہوا تھا۔ ایڈم تب تک گھوم پھر کے اس کا کمرہ دیکھنے کے بعد شیلف پہ رکھی کتابوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ نے ان میں سے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔''

''ایڈم!'' وہ پھولے سانس کے ساتھ قریب آئی۔ اور ٹوپی کھینچ اتاری۔ سنہرے بال کندھوں پہ گر گئے۔ ''اندر کچھ خاص نہیں ہے سوائے ایک خالی صندوق کے۔''

''خالی صندوق؟''

''اس میں ایک سکہ پھنسا ہوا تھا۔'' اس نے مٹھی کھول کے دکھایا۔ سونے کا چھوٹا مگر موٹا سا سکہ۔

ایڈم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ''پھر؟''

''باقی سارے صندوق بھاری تھے۔ سوکھے تھے۔ ان میں حساب کتاب کے کاغذ تھے۔ وہ وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ان کو کوئی وہاں سے ہلاتا نہیں ہے۔ مگر یہ چھوٹا صندوق ہلکا تھا۔ یہ بار بار اٹھایا اور واپس لے جایا جاتا ہے۔'' وہ جوش سے بتا رہی تھی۔

''یہ ابھی نم تھا' یعنی شام کو ہی کوئی اسے بارش میں واپس لایا ہے مگر اتنے خفیہ طریقے سے کہ معلوم ہی نہیں ہوا مجھے۔''

''شام کو بارش کے دوران تو چاول اور دوسرا غلہ محل میں آیا ہے صرف۔ میں باہر ہی بیٹھا تھا۔''

''اس صندوق کو اس سامان میں چھپا کے لایا گیا ہے۔''

''مگر وہ خالی کیوں ہے؟''

''اس پہ رسیاں باندھنے کے نشان ہیں۔ اور اس میں ریت پھنسی ہے۔ جیسے اس کو ساحل کی ریت پر گھسیٹ کے کہیں لے جایا گیا ہو۔ وہ بار بار سفر کرتا ہے۔ اور وہ یہاں خالی واپس آتا ہے۔''

''مگر خالی کیوں؟''

تالیہ چپ ہو گئی پھر سکے کو دیکھا۔ ''شاید جب وہ یہاں سے جاتا ہے تو خالی نہیں ہوتا۔ اس میں سکے بھرے ہوتے ہیں۔ اور اس کو کسی ریتلی جگہ پہ لے جا کر خالی کیا جاتا ہے اور پھر واپس لایا جاتا ہے۔ یہ کام جلدی جلدی کیا جاتا ہے' تب ہی ایک پھنسا ہوا سکہ ان کی نظروں سے اوجھل رہ گیا۔''

چند لمحے لگے ایڈم کو ساری کتھا سمجھنے میں۔

''یعنی راجہ اس صندوق کے ذریعے سونے کے سکے کہیں منتقل کر رہا ہے۔''

تالیہ کی آنکھیں چمکیں۔ ''ہاں۔ راجہ مراد کا اصل خزانہ کہیں اور ہے۔ یہ کمرہ تو محض گھر کے اخراجات چلانے کے لیے ہے۔ راجہ اپنی دولت کو کہیں اور جمع کرتا جا رہا ہے۔''

''مگر وہ چابی...... ہمیں تو اس سے مطلب ہے نا۔''

''راجہ کی محفوظ جگہ اگر کہیں اور ہے تو وہ چابی بھی کہیں اور ہو گی۔ اگر ہم اس صندوق کی جگہ کا پتا لگا لیں تو چابی بھی مل جائے گی۔''

''مگر کیسے؟''

''میں کچھ سوچتی ہوں۔'' وہ اب کھڑکی کے ساتھ گری رسی لپیٹنے لگی۔ دماغ الجھ سا گیا تھا۔ مورخ

نے ایک تنقیدی نظر اس کمرے پہ ڈالی اور منہ میں بڑبڑایا۔
"الگ سے حساب ہوگا' یاد رکھیے گا۔" جلے دل سے بولا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جواباً منہ میں بڑبڑائی۔ "بھگوڑا فوجی۔"
"ہونہہ۔ نقلی شہزادی۔" اس نے سن لیا تھا' اس لیے کچھ بغیر باہر نہیں نکلا۔

☆☆☆

'ملاکہ سلطنت محل' کے دربار کی کھڑکیوں سے اس صبح روشنی چھن چھن کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ تخت بچھا تھا۔ دربان مستعد کھڑے تھے۔ درباری وزراء اور امراء قطار میں لگی کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں خالی تخت سے دربار کے دروازے پہ بار بار اٹھتی تھیں۔ سلطان مرسل کا انتظار کیا جا رہا تھا جو آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صبح خیزی کا عادی نہ تھا اور اس کے انتظار میں وزرا اور جرنیلوں کو پہروں بیٹھنا پڑتا تھا۔
دربار سے چند کوس دور محل کے دوسرے حصے میں آؤ تو اپنی خواب گاہ میں مرسل شاہ بستر پہ نیم دراز تھا۔ آنکھیں موندے وہ اونگھتا ہوا دکھائی دیتا تھا جب دربان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ملکہ کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔
مرسل نے قدرے بے زاری' قدرے مجبوری سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھا۔
ملکہ یان سوفو کامدار لباس میں ملبوس' تاج سر پہ سجائے' کروفر سے اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے آ رکی۔ اٹھ کے بیٹھے جمائی روکتے مرسل شاہ نے محض نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔
"کیا بات ہے ملکہ؟ اتنی صبح صبح؟"
"چین سے قاصد آیا ہے اور بری خبر لایا ہے۔" وہ سخت خفگی کے عالم میں بتانے لگی۔ "میرے والد' شاہِ چین' جب سے آپ سے ملاقات کر کے گئے ہیں' بیمار پڑے ہیں۔ ان کے جسم پہ پھوڑے نکل آئے ہیں۔ جو کہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔"
مرسل نے تعجب سے ابرو بھینچے۔ "یہ کیسے ہوا؟"
یان سوفو نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"شاہی طبیب کا خیال ہے کہ ان کو آپ کی نظر لگی ہے۔"
"میری نظر؟" مرسل کا منہ کھل گیا۔
"جی آقا! آپ کی نظر۔ میرے والد کی جان بھی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس کا جلد از جلد توڑ کرنا ہو گا۔"
مرسل فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ پریشان نظر آتا تھا۔
"مم...... میں کیا کروں پھر؟"
"طبیب نے ٹوٹکا لکھ بھیجا ہے۔ آپ کو اس کے مطابق غسل کرنا ہوگا اور غسل کا پانی بادشاہ سلامت کو بھیجا جائے گا' جو اُن کے پھوڑوں کے لیے اکسیر کا کام دے گا۔ جو بھی ہو آقا' آپ کو میرے والد کے لیے ہر کوشش کرنا ہو گی۔"
تن فن کرتی ہوئی جیسے آئی تھی ویسے ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مرسل ہکا بکا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ منہ ابھی تک کھلا تھا۔
دربار میں مرسل شاہ کا انتظار ہوتا رہا' مگر وہ نہیں آیا۔
باہر دالان کے پار ایک تھکے ماندے گھوڑے کے ساتھ دھول میں اٹا سوار کھڑا تھا۔ باہر آتی یان سوفو اسے دیکھ کے رکی' اپنی کنیزوں کو تھم جانے کا اشارہ کیا' اور لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے تیزی سے سوار کی طرف آئی۔
"ملکہ!" اس نے جھک کے تعظیم پیش کی۔
"تم واپس آ گئے۔" وہ بے چینی سے دبی دبی آواز میں بولی۔ دالان کے فوارے کے ساتھ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور کنیزوں کا گروہ دور خاموش سے کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔
"جی ملکہ۔"
"شہزادی تاشہ کے بارے میں معلوم ہوا کچھ۔" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
"ان کے شہر کے کوتوال سے مل کے آ رہا ہوں۔

اس نے تاشہ شہزادی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ جب مقررہ وقت پہ اس کے پاس گیا تو اس نے یہ مراسلہ تھمایا۔ یہ سربہ مہر ہے اور مجھے اس کو کھولنے کی اجازت نہیں۔ کوتوال نے خاص رازداری سے کہا تھا کہ اسے آپ ہی کھولیں گی۔“

اس نے ریشمی رومال میں لپٹا ایک دستہ اسے تھمایا جسے ملکہ نے فوراً اپنے لباس میں چھپا لیا۔

اپنی خواب گاہ میں آ کے اس نے دروازے بند کیے' جلدی سے بستر کے کنارے بیٹھی اور ریشمی کپڑے کی مہر پھاڑی۔ پھر اندر سے تہ شدہ کاغذ نکالا۔ اس پہ الگ مہر تھی۔ (موم پگھلا کے دونوں سرے بند کر رکھے تھے۔) اس نے احتیاط سے اسے کاٹا اور دھڑکتے دل سے کاغذ کھول کے سامنے کیا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ بالکل شل رہ گئی۔

کاغذ خالی تھا۔

بالکل کورا سفید۔

☆☆☆

بندا ہارا کے محل کا ملاقاتی کمرہ آج صبح خوب روشن تھا۔ کل کی بارش کے بعد سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور سنہرا چمکتا ہوا دن طلوع ہوا تھا۔ اونچی کھڑکی کے ساتھ ابوالخیر کھڑا باہر جھانک رہا تھا۔ اس کے لمبے بال چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔ دربان نے شہزادی کی آمد کا اعلان کیا تو وہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے پلٹا۔

پٹ کھلے اور تالیہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ سر پہ پہنے تاج سے لٹکتا کپڑا کندھوں پہ پھیلا تھا۔ نیچے گھیردار پاؤں کو چھوتا کامدار ریشمی لباس تھا۔ تاشہ کی گردن سیدھی اور چہرہ سنجیدہ تھا۔

”شہزادی۔“ اس نے جھک کے سلام کیا۔

شہزادی کے چہرے پہ ذرہ برابر بھی مسکراہٹ نہیں آئی۔

”لگتا ہے ابوالخیر صاحب کو خبریں دیر سے ملتی ہیں۔“

”میں معذرت چاہتا ہوں شہزادی! طبیعت ناساز تھی، اس لیے پہلے حاضر نہیں ہو سکا۔“ پھر دوبارہ سے جھکا اور سر واپس سیدھا کیا۔ گہری نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ ”میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے آقا سے میری سفارش کی۔“

”میں نے وہ فیصلہ کیا جو آقا اور ملاکہ سلطنت دونوں کے حق میں بہتر تھا۔“ وہ اب کے ہلکا سا مسکرائی۔

”کچھ تحائف حرم میں بھجوائے ہیں میں نے' امید ہے آپ کو اچھے لگیں گے۔“

”ہاں میں نے ابھی دیکھے نہیں۔“ بے نیازی سے کندھے پہ آئے بال پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ”اب تو سارے تحائف ہی ایک سے لگتے ہیں' ابو الخیر۔ وہی زیور' وہی ریشم' وہی چینی کے برتن۔“

ابوالخیر نے اپنی شیر جیسی آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کے اسے دیکھا۔ ”جی' یہ بات تو درست ہے آپ کی۔ (اسے جیسے تذبذب ہوا) اگر شہزادی کے ذہن میں میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو مجھے آگاہ ضرور کیجیے گا۔“

”خدمت تو میں نے سنا ہے آپ بہت اچھی کرتے ہیں۔ میرے بابا کی کرتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے اپنے لیے کچھ درکار نہیں۔ میرے پاس....“ دونوں بازو پھیلا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ”اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ فخر سے گردن اکڑا کے مسکرائی۔

”الحمدللہ شہزادی!“ اس نے ادب سے سر کو خم دیا البتہ ابھی تک سوچتی نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔

”مگر ملاکہ کے لوگوں کے پاس سب کچھ نہیں ہے۔ تو کیوں نا میں اپنی رعایا کے لیے کچھ ایسا بنا جاؤں جو میرے اس دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کے کام آتا رہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلی آئی اور باہر جھانکا۔ محل کے باغات یہاں سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

”اتنی کم عمری میں دنیا سے جانے کی باتیں' شہزادی؟“

www.urdusoftbooks.com

تالیہ مڑی' یوں کہ اب چہرہ ابوالخیر کی طرف اور پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ "اس دنیا سے جانے کی واحد صورت صرف موت نہیں ہے' ابوالخیر۔ سفر کے طریقے اور بھی ہیں مگر وہ آپ کی سمجھ سے ہٹ کے ہیں۔" روشنی اس کی پشت سے آرہی تھیں' ایسے میں شہزادی کا چہرہ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہے یا اس پہ افسوس کر رہی ہے۔

"آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں اپنی گمشدہ بہن تالیہ بنت مراد کے نام کی ایک مسجد بنوانا چاہتی ہوں' ایک عظیم الشان مسجد جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کار خیر میں بھرپور حصہ لیں گے۔"

ابوالخیر بالآخر کھل کے مسکرایا اور سر کو پورا جھکا کے سیدھا کیا۔ "میرے لیے اعزاز کی بات ہو گی' شہزادی! آپ بے فکر ہو جایئے۔ میں آج ہی مسجد کا نقشہ تیار کرواتا ہوں اور اس نقشے کی منظوری کے بعد خزانے سے مطلوبہ رقم نکال کے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرواتا ہوں۔"

"مگر میں مسجد میں اعلا پائے کی تزئین و آرائش بھی چاہتی ہوں جو سرکاری امداد سے پوری نہ ہو سکے گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

"وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہر کام بطریق احسن مکمل ہو گا۔ آپ کی خواہش جلد آپ کے سامنے مجسم صورت کھڑی ہو گی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔

"کب تک؟"

"بس نیلامی ختم ہو جائے' پھر میں اس کام کو شروع کرتا ہوں۔"

"نیلامی؟" اس کا دل دھڑکا مگر بظاہر سادگی سے پوچھا۔ "غالباً غلاموں کی نیلامی کرتے ہیں نا آپ؟"

"جی۔ کل نیلامی ہے میرے ہاں۔ ہمارے پاس بہترین قسم کے غلام ہیں۔ اعلا تربیت اور آداب سے آراستہ۔ آپ بھی اگر تقریب کو رونق بخشیں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"نہیں' شکریہ۔ مجھے کیا کرنا ہے غلاموں کا۔ یہاں بہت غلام ہیں پہلے سے۔" اس نے بے نیازی دکھائی۔

"کیا شہزادی تاشہ نے کوئی مسجد بنوائی تھی، چے تالیہ؟" کچھ دیر بعد جب ایڈم اور وہ پائیں باغ کی روش پہ ٹہل رہے تھے تو ایڈم نے حیرت سے پوچھا۔ "اور اگر بنوائی بھی تھی تو وہ اب ملائیشیا میں کس جگہ واقع ہے۔ میں نے تو ایسی کسی مسجد کا نہیں سنا۔ ہاں ہو سکتا ہے پرتگالیوں نے ملاکہ پہ قبضے کے بعد اس مسجد کو شہید کر دیا ہو اور......" وہ مغموم ہونے لگا تو وہ ایک دم اس کی طرف گھومی۔

"کوئی مسجد نہیں بنے گی' ایڈم! نہ ہی ابوالخیر اور میں کوئی مسجد بنانا چاہتے ہیں۔"

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ "کیا مطلب؟ تو ابوالخیر پیسے کس چیز کے دے گا؟"

"مسجد صرف کاغذوں میں بنے گی' ہم اس کا نقشہ منظور کروا کے اس کے لیے سرکاری خزانے سے فنڈز حاصل کریں گے اور ان کو میں خود استعمال کروں گی۔ ابوالخیر جو بھی رقم مجھے آئندہ رشوت کے طور پہ دے گا اس پہ قانون اس کو پکڑ نہیں سکتا کیونکہ کاغذوں میں وہ رقم چندے کے طور پہ دی جا رہی ہو گی۔"

"یعنی کہ آپ...... آپ حکومتی خزانے سے جو پیسے لیں گی وہ 'کرپشن' کے زمرے میں آئے گی؟ اور جو چندے کے نام پہ ابوالخیر سے رقم لیں گی' وہ رشوت ہو گی۔ وہی میں کہوں' آپ اور مسجد؟ جی نہیں۔ اتنا نیک کام آپ سے نہیں ہو گا۔"

وہ دونوں ایک دفعہ پھر باغ کی روش پہ ٹہلنے لگے تھے۔ زمردی گھاس کے درمیان وہ دودھ جیسے سفید پتھروں سے بنی روش بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

''ہمیں وان فاتح کو خریدنا ہے کل۔''

''وان فاتح؟'' وہ بالکل ٹھہر گیا۔ ''کیا غلاموں کی نیلامی ہو رہی ہے؟''

''ہاں۔ ابوالخیر نے بتایا ہے۔ جو تحفے اس نے صبح بھیجے تھے' ان میں موجود جواہرات کو ہم مال کے طور پہ استعمال کر لیں گے۔ اور سنو' اس کے بھیجے صندوقوں میں سے ایک صندوق بالکل اس جیسا ہے جو بابا کے خزانے والے کمرے میں رکھا ہے۔''

''یعنی اشرفیوں سے بھرا وہ صندوق جس کو راجہ بار بار پیسے لانے اور لے جانے کے لیے استعمال کرتا ہے' وہ اس کو ابوالخیر کی طرف سے ملتا ہے؟'' وہ کسی نکتے پہ پہنچ رہے تھے۔

''ہاں اور اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس مال کو یہ لوگ کہاں سے حاصل کرتے ہیں اور یہ جا کہاں رہا ہے......''

''ہم نہیں' آپ۔'' وہ انگلی اٹھا کے تنبیہہ کرتا دو قدم پیچھے ہٹا۔ ''اس جہنم میں لے جانے والے سیاہ کام سے مجھے تو آپ دور ہی رکھیں۔ پہلے ہی آپ کی وجہ سے بہت گناہ کر چکا ہوں میں۔''

''جیسے ایک کنگال رائٹر کی چیزیں چُرا کے اس کا روپ دھارنا؟'' وہ چمک کے بولی تو ایڈم نے متغمانہ نظروں سے اسے گھورا۔

''میں اب آپ کی اس دھمکی سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ اگر میرا راز کھلا تو مجھے یہ عہدہ دینے والے کو بھی سزا ملے گی' ہے نا۔''

''تمہیں اس عہدے پہ سلطان مرسل نے رکھا ہے۔ اب ان کو کون سزا دے سکتا ہے بھلا؟'' آخر میں مسکرائی تو ایڈم نے مارے ضبط کے مٹھی بھینچ لی۔

''اس لیے اب جاؤ۔ اور اپنی کتاب پہ کام کرو۔'' تیکھے انداز میں کہہ کے وہ آگے بڑھ گئی اور ایڈم جلی بھنی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

نقلی سہی' مگر شہزادی تو تھی۔ آہ۔

ایڈم بن محمد کے پاس سے مڑی تو وہی مسکراہٹ چہرے پہ در آئی جو ہمیشہ اس کو ستانے کے بعد اسے چھپانی پڑتی تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ مگن سی اندر آئی تو راہداری میں راجہ مراد آتا دکھائی دیا۔ فوراً رکی' چہرہ سنجیدہ بنایا اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔

''راجہ!''

وہ کمر پہ ہاتھ باندھے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتا ہوا قریب آیا۔ لمبے بال کندھوں کو چھو رہے تھے اور گردن کا سریا اول روز کی طرح تھا۔

''تم اور ابوالخیر' تالیہ کے نام کی مسجد بنوا رہے ہو؟''

تالیہ نے نظریں اٹھائیں اور ہلکا سا مسکرائی۔ ''آپ کو میرا یہ کام پسند آیا ہوگا' مجھے امید ہے۔ میں آپ کے ہی نقشِ قدم پہ چلنا چاہ رہی ہوں' راجہ۔''

مراد کے لب مدھم سی مسکراہٹ میں ڈھلے۔ ''ہوں' مجھے خوشی ہے۔''

تالیہ نے پھر سے سر جھکایا اور اس کے پاس سے نکل کے آگے بڑھی' مگر مراد کی آواز نے اسے روک دیا۔

''اور اپنی ماں؟ اس کے لیے کبھی کچھ تعمیر کرنے کا نہیں سوچا تم نے؟''

تالیہ بالکل ساکت رہ گئی۔ تھوک نگلا اور بظاہر مسکراتی ہوئی پلٹی۔ ''ماں کے لیے؟''

مراد اس کی طرف گھوما' ایسے کہ اس کے چہرے پہ نرمی تھی۔ ''تمہاری ماں کو مرے ہوئے چھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ تم سات برس کی تھیں' جب وہ طاعون سے مری تھی۔ کیا اس کی قبر پہ جانے کا دل نہیں چاہا تمہارا تالیہ؟''

پہلی دفعہ مراد کے چہرے پہ احساس کی رمق دکھائی دی تھی۔ جیسے دکھ کا کوئی سایہ ہو۔ جیسے ماضی کا کوئی صدمہ ہو۔

''میں ماں کا ذکر کر کے آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی' بابا۔ یہ ذکر آپ کی کمزوری سامنے لے آئے گا اور آپ پتھر صورت زیادہ طاقتور لگتے ہیں۔ ایسے ہی رہا کریں۔'' پھر سر جھکا کے بولی۔ ''راجہ!'' اور پلٹ گئی۔

اسے اپنی ماں یاد نہیں تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس کے پاس سوچنے کو اور بہت کچھ تھا۔

☆☆☆

سوموار کی شام ابوالخیر کی حویلی کے سامنے کھلے میدان میں میلہ لگا تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیوں سے جابجا سجاوٹ کی گئی تھی۔ ایک جانب اونچا چبوترہ (اسٹیج) سا بنا تھا اور سامنے قطار در قطار کرسیاں رکھی تھیں جن پہ شہر کے معززین بیٹھے تھے۔ جگہ جگہ جھلملاتے قمقموں اور مشعلوں نے رات میں دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔

چبوترے کے عقب میں عارضی دیواریں بنی تھیں۔ جہاں سے ایک آدمی باری باری غلاموں کو باہر لاتا اور چبوترے پہ دھکیل دیتا۔ غلام کسی فیشن شو کے ماڈل کی طرح لمبے چبوترے پہ آگے چلتا جاتا اور سرے پہ جا کے رک جاتا۔ اس کے ہاتھوں سے پیروں تک لمبی بیڑیاں بندھی ہوتیں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے حاضرین کو دیکھتا۔

کرسیوں پہ بیٹھے امراء اور رئیس اپنے اپنے کارڈ بلند کرتے اور اس کی بولی لگاتے جاتے۔ جہاں بولی رکتی، وہاں فروخت کا اعلان کر دیا جاتا۔ اعلان کرنے والا ابوالخیر کا قریبی غلام محمود مرلی تھا۔ وہ ہر اعلان سے پہلے اول قطار میں ٹھاٹ سے بیٹھے ابوالخیر کو ضرور دیکھتا تھا۔ جواب میں ابوالخیر مسکرا کے سر کو جنبش دیتا تو وہ اعلان کر دیتا۔

نیلامی کی تقریب ابھی جاری تھی۔ آغاز میں معمولی غلام اور لونڈیاں پیش کی جا رہی تھیں۔ ایسے میں چبوترے کے پیچھے جاؤ تو وہاں لمبی قطاروں میں پنجرے رکھے تھے جن میں غلام قید تھے۔

آخری پنجروں میں سے ایک میں فاتح کھڑا تھا۔ اس نے پنجرے کی سلاخوں سے کمر ٹکا رکھی تھی اور سینے پہ بازو لپیٹے کچھ سوچ رہا تھا، جب پیچھے کوئی کھنکھارا۔ وہ چونک کے پلٹا۔

اس کے پنجرے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ چغوں میں ملبوس، سر پہ ٹوپیاں گرائے۔ نیم تاریکی کے باوجود وہ ان کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔

ایڈم اور تالیہ!!

فاتح نے گہری سانس لی اور احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ قریبی پنجروں کے پاس بھی لوگ منڈلا رہے تھے، وہاں رش سا لگا تھا۔ پہرے دار روک ٹوک نہیں کر رہے تھے۔ بولی لگانے سے قبل لوگ غلاموں کو جانچ لیں، اچھا تھا۔

''ہم آپ کو خریدنے آئے ہیں، تو انکو۔'' سیاہ ہڈ میں اس کا چہرہ پرامید سا دمک رہا تھا۔ سنہری لٹیں ٹوپی سے نکل رہی تھیں جن کو وہ بار بار اندر اڑستی تھی۔

''مجھے نہیں، میری آزادی کو خریدنے!'' وہ سلاخوں کو پکڑے، اس کی آنکھوں میں دیکھ کے جتا کے بولا۔

وہ زخمی سا مسکرائی۔ ''ظاہر ہے، آپ کو کون خرید سکتا ہے۔''

''اتنی رقم ہے تمہارے پاس؟'' اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''جی سر۔'' ایڈم جھٹ بولا۔ ''سب سے اونچی بولی ہم لگائیں گے۔''

''اور اتنی رقم آئی کہاں سے؟'' سنجیدگی سے تالیہ کو دیکھا۔

''میرے بابا مجھے کافی سارا جیب خرچ دیتے ہیں۔ میں نے بہت کچھ جمع کر لیا تھا۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''ہوں....اور ابوالخیر تمہیں پہچانے گا تو نہیں؟'' اسے تشویش ہوئی۔

''کیسے پہچانے گا؟'' اس نے پھر شانے اچکائے۔ فاتح نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ پوری طرح سے چغے میں چھپی ہوئی تھی۔

''ویسے بھی بولی ایڈم لگائے گا۔ میں خاموش رہوں گی۔'' وہ اب اس کو طریقہ کار بتا رہی تھی مگر فاتح کی نظریں اس کے پیروں تک جو جھکیں تو اٹھی نہیں۔ تالیہ رک گئی۔ سر جھکا کے پیر دیکھے۔ ان میں پیلے رنگ کے جوتے تھے جن پہ موتی لگے تھے۔

"یہ جوتے تم نے کہاں سے لیے؟" فاتح نے نظریں اٹھائیں تو ان میں کچھ عجیب سا تھا۔

"یہ؟" اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔ "شہزادیوں کے پاس ان چیزوں کی کمی نہیں ہوتی' تو انکو۔"

"یہ ہاتھ سے بنے ہیں' تالیہ! اور یہ ابوالخیر کا ملازم محمود مرنی بناتا ہے۔ صرف خاص تحفوں کے لیے۔ یہ اس نے میرے سامنے ایک صندوق میں رکھے تھے جس میں بہت سے دوسرے تحفے بھی تھے تو کیا وہ تحفے ابوالخیر نے تمہیں بھیجے تھے۔" اس کا انداز ایک دم پھنکارتا ہوا ہو گیا۔

ایڈم نے بے اختیار تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ پل بھر کو وہ پھیکی پڑی۔ مگر ابھی بھی جیسے وہ اچنبھے میں تھی۔

"شاید۔ مگر تحفے تو آتے رہتے ہیں اور....."

"سن باؤ کی جگہ ابوالخیر کو وزیر بنانے کے بدلے میں اس نے رشوت دی، ہے نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا، برہمی سے پوچھ رہا تھا۔

"مگر آپ خفا کیوں ہو رہے ہیں؟"

"کیونکہ ابوالخیر صرف تحفے نہیں بھیجتا' سونے چاندی کے زیورات بھی بھیجتا ہے اور ابھی تم نے مجھ سے کہا کہ نیلامی کے لیے رقم تمہارے جیب خرچ سے آئی ہے' مگر مجھے لگ رہا ہے، وہ بھی رشوت کے طور پہ ابوالخیر کی دی گئی ہوگی۔"

وہ لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔ "اگر ایسا ہے بھی تو ہم اسے اسی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ جو ہمیں معلوم ہے۔ وہ ہماری جان بچائے گا۔"

"اور تم نے کہا تھا تم اب جھوٹ نہیں بولو گی۔"

وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتا، سلاخیں چھوڑ کے پیچھے ہٹا۔ "تم نے اتنی آسانی سے مجھ سے جھوٹ بول دیا۔"

وہ بار بار لب کھولتی پھر بند کر دیتی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ "میرے پاس تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا اور....."

"تو تم نے جھوٹ بول دیا؟ اس طرح نہیں ہوتا تالیہ! کسی بھی رشتے اور تعلق میں' خواہ وہ صرف ورکنگ ریلیشن شپ ہی ہو' صرف سچ بولا جاتا ہے۔ تم مجھے سچ بھی بتا سکتی تھیں۔"

"آپ کو مجھ پہ غصہ ہے کس بات کا' ہاں؟" اس کی آواز ہلکی سی بھرا گئی۔

"میں ابھی بات نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے برہمی سے کہہ کے رخ موڑ لیا۔ وہ دکھ اور غصے سے کچھ کہنے لگی تھی مگر ایڈم نے آہستہ سے پکارا۔

"چلیں! ہماری باری آنے والی ہے۔"

وہ رخ موڑے کھڑا تھا۔ ایک دم وہ اتنا ناراض' اتنا اجنبی لگنے لگا تھا۔ جیسے اپنے گھر کی لائبریری میں لگتا تھا۔ جیسے کے ایل میں اس سے بیزار سا لگا کرتا تھا۔

وہ ملامتی نظروں سے اسے دیکھتی پلٹ گئی۔

کچھ دیر بعد فاتح بیڑیوں میں بندھا چبوترے پہ چلتا آ رہا تھا۔ اس نے سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا' پیشانی پہ سبز پٹی بندھی تھی اور چہرہ سپاٹ' بے تاثر تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا آخری سرے تک آیا اور رک گیا۔ وہ سامنے حاضرین کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بس میکانکی انداز میں دور سیاہ افق پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

محمود مرنی چبوترے کے دوسرے سرے پہ کھڑا' اعلان کرتے ہوئے بولا۔ "فاتح بن رامزل...... بولی شروع ہوتی ہے پانچ سو دینار سے۔ کیا کوئی پانچ سو طلائی سکے دے گا اس تنومند غلام کے لیے؟"

کرسیوں پہ آخری قطار میں بیٹھے ایڈم کے قریب وہ جھکی۔ "وان فاتح نے اپنا نام درست بتایا ہے ان کو؟"

"وہ جھوٹ نہیں بولتے' چے تالیہ۔"

"ہونہہ۔" وہ سر جھٹک کے سیدھی ہوئی۔ ایڈم نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی بلند کی۔ "چھ سو دینار۔" چھڑی پہ بڑا سا گتا لگا تھا جس پہ ایک ہندسہ لکھا تھا۔

"چھ سو دینار۔" محمود مرنی نے زور سے

کہا۔ ''کیا کوئی اس سے اوپر دے گا۔''
''سات سو دینار۔''
''نو سو دینار۔''
''ایک ہزار۔'' تین چار آوازیں بلند ہوئیں۔
''پندرہ سو دینار۔'' ایڈم نے اپنا کارڈ مزید اونچا کیا۔
''بولی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا کوئی مزید رقم دے گا؟'' محمود جوش سے اعلان کر رہا تھا۔
''دو ہزار دینار....'' دوسرے کونے سے آواز آئی تو تالیہ نے چونک کے اس طرف دیکھا۔
آخری قطار میں بیٹھا وہ سن باؤ وانگ لی تھا۔ آرام سے بیٹھا' کچھ منہ میں چباتے ہوئے' وہ کارڈ بلند کیے ہوئے تھا۔
تالیہ کے ابرو تن گئے۔ ''قیمت بڑھاؤ' ایڈم۔'' وہ بے چینی سے بولی۔
''بائیس سو دینار۔''
''پچیس سو دینار۔'' وانگ لی نے دوبارہ کارڈ بلند کیا۔ اب کی دفعہ اگلی قطار میں بیٹھے ابوالخیر نے بھی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ناپسندیدگی آ گئی تھی مگر وانگ لی ساتھ میں کوئی پھل بھی کھائے جا رہا تھا۔ فاتح نے افق سے نظریں ہٹا کے وانگ لی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ چینی مہم جو جواب میں صرف مسکرایا اور سر کو خم دیا۔
''تین ہزار دینار۔'' ایڈم نے اونچا سا کہا اور اس کی طرف جھکا۔ ''کیا اتنے پیسے ہیں ہمارے پاس؟''
''رقم کی فکر مت کرو۔ ہم انتظام کر لیں گے۔''
''چار ہزار دینار۔'' وانگ لی نے اطمینان سے رقم بڑھائی۔ تالیہ نے پہلو بدلا۔
''پانچ ہزار دینار۔'' ایڈم کو پسینے آ رہے تھے مگر وہ صدا لگائے جا رہا تھا۔
''پانچ ہزار دینار۔ زبردست۔ کیا کوئی ہے جو......'' محمود مرنی جوش سے اعلان کر رہا تھا کہ ٹھہر گیا۔ ابوالخیر نے اشارہ کیا تھا وہ فوراً چبوترے سے اترا اور مالک کے پاس آیا۔ اس کے کان میں جھک کے اس کی ہدایات سنیں اور پھر اوپر آ کے حاضرین کی طرف رخ کر کے کھنکھارا۔
''چونکہ یہ معاملہ اب سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے' اس لیے اس غلام فاتح بن رامزل کی بولی ہم واپس لے رہے ہیں۔ یہ غلام اب نیلامی کے لیے دستیاب نہیں ہے۔''
تالیہ اور ایڈم نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ حاضرین میں سے حیرت اور اچنبھے سے بھری آوازیں بلند ہوئیں۔
''بجائے مقابلہ بازی اور نفرت پھیلانے کے ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ اس غلام کو ایک مقررہ قیمت پہ بیچ دیا جائے۔ جو بھی شخص اس کو خریدنا چاہتا ہے' وہ دس ہزار دینار ادا کر دے اور اسے لے جائے۔''
''میں ادا کروں گا۔'' ایڈم تیزی سے اٹھا۔ چینی کی ہٹ سے اس کے چہرے پہ سایہ سا پڑا تھا۔ لوگ مڑ مڑ کے اسے دیکھنے لگے۔
''میں بھی ادا کر دوں گا۔'' وانگ لی بیٹھے بیٹھے بولا۔ پھولے گال مسلسل کچھ کھانے کے باعث ہل رہے تھے۔
ابوالخیر نے مسکرا کے چبوترے پہ کھڑے محمود کو اشارہ کیا۔ جواباً محمود کسی رٹے رٹائے طوطے کی طرح بولا۔
''اگر دونوں فریقین مطلوبہ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں' تو ہم یہ فیصلہ غلام پہ چھوڑتے ہیں کہ وہ کس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔'' وہ فاتح کی طرف گھوما۔ ''فاتح بن رامزل......تم فریق نمبر چھ کے ساتھ جانا چاہتے ہو یا فریق نمبر بیس کے۔''
وہ بولی لگانے والے فریقوں کے کارڈز پہ لکھے ہندسے پڑھ کے کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے فوراً ایڈم کے کارڈ کا نمبر پڑھا۔ بیس نمبر۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
بیڑیوں میں بندھے فاتح نے مجمع میں کھڑے

دونوں آدمیوں کے نمبر دیکھے۔
ایڈم بیس نمبر اٹھائے امید اور بے چارگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
پھر اس کی نظریں سن باؤ کی طرف اٹھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے ـــــ پھل کھاتے ہوئے' دوسرے سے چھ نمبر کارڈ بلند کیے ہوئے تھا۔ فاتح نے لب کھولے۔
''میں چھ نمبر کے ساتھ جاؤں گا۔ سن باؤ وانگ لی کے ساتھ۔''
ابوالخیر کے چہرے پہ ناپسندیدگی پھیل گئی مگر اس نے ضبط کر کے تالی بجائی۔ تمام حاضرین تالیاں بجانے لگے۔ صرف ایڈم تھا جو ہکا بکا کھڑا تھا اور تالیہ.....وہ بے یقین' شل سی بیٹھی تھی۔
''فاتح بن رامزل دس ہزار دینار میں وانگ لی کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اگلے غلام کو لایا جائے۔''
منادی ہو رہی تھی' شور بڑھ گیا تھا۔ چینی کی ٹوپی کے ہالے میں اس کا چہرہ پھیکا پڑ رہا تھا۔
ایڈم نڈھال سا واپس بیٹھا۔ ''یہ کیا ہو گیا؟''
تالیہ دھیرے سے اٹھی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایڈم پیچھے لپکا۔
''چے تالیہ.....'' وہ تاریک خاموش گلیوں سے گزرتے جا رہے تھے جب اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا۔ ہڈ تالیہ کے سر سے گر چکا تھا۔ سنہری بال چہرے پہ بکھرے تھے اور وہ سامنے دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔
''فاتح صاحب نے ایسا کیوں کیا؟''
''کیونکہ انہوں نے ایک عرصہ وانگ لی کے مجسمے سے محبت کی ہے۔ وہ ان کو یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچھڑا دوست ہو۔ وہ اپنے دوست کے پاس واپس جانا چاہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ دوست, دوست ہوتا ہے اور فین فین۔''
''مگر.....''
''ہم دونوں ان کے فین ہیں بس' ایڈم۔ صرف فین۔ ادنیٰ کارکن۔ ہم کبھی ان کے دوست نہیں بن سکتے۔'' وہ تیز تیز چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ چہرہ گلابی پڑ رہا تھا۔ آواز رندھ رہی تھی۔
''اور آپ نے ایسا کیوں کیا؟''
وہ رک گئی۔ چونک کے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''مجھے.....میں...'' وہ کہتے کہتے رکی' پھر سر جھٹکا۔ ''جو میرے منہ سے نکلا' میں بولتی گئی۔ اب کیا ان کو تفصیل بتاتی کہ کہاں سے آئی رقم۔ مگر اس میں کوئی اتنا خفا ہونے والی بات تو نہیں تھی کہ وہ یوں کرتے میرے ساتھ۔''
''آپ نے ان سے جھوٹ بولا تھا' چے تالیہ۔''
''میں نے جان کے ایسا نہیں کیا' بس.....بس جو میرے ذہن میں آیا میں نے بول دیا۔''
''بس..... آپ کی سوچ میں ہی نہیں آیا صحیح جواب' اس لیے آپ نے وہ دیا۔''
''کیا مطلب؟''
''آپ جانتی ہیں انسانوں اور جانوروں میں کس عضو کا فرق ہوتا ہے؟''
''میرے پاس ان باتوں کا وقت نہیں ہے' ایڈم۔''
''اس کا۔'' اس نے انگلی سے ماتھے پہ دستک دی۔
''دماغ؟ یہ تو جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔''
اس نے سینے پہ بازو لپیٹے اور آنکھیں تیکھی کر کے اسے دیکھنے لگی۔
''دماغ نہیں۔ دماغ کا سامنے والا حصہ۔ فرنٹل لوب۔ انسان کی فرنٹل لوب ہوتی ہے۔ پیشانی کے اندر کا حصہ۔ جانور اس سے محروم ہوتے ہیں۔''
وہ لب بھینچے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔
''جب آپ کی آنکھ کچھ دیکھتی ہے' تو اس فرنٹل لوب کو پیغام بھیجتی ہے۔ (اس نے آنکھ سے پیشانی تک لکیر کھینچی' گویا راستہ متعین کیا۔) پھر فرنٹل لوب اس بات کو سوچتی ہے اور پیغام بھیجتی ہے پچھلے حصے کو۔ (انگلی ماتھے سے سر کے پیچھے لے گیا۔) پچھلا حصہ

ہاتھ کو حکم دیتا ہے کہ یہ کام کرو' یا ٹھہر جاؤ۔ (انگلی پچھلے حصے سے دوسرے ہاتھ تک لے گیا۔) یوں ہم وہ کام کرتے ہیں' یا صبر کر کے خود کو روک لیتے ہیں۔"

"تو؟"

"تو یہ کہ...... جانوروں میں یہ فرنٹل لوب نہیں ہوتی۔ ان کی آنکھ جیسے ہی کچھ دیکھتی ہے' ڈائریکٹ پچھلے حصے کو پیغام دیتی ہے' وہ ہاتھ کو حکم دیتا ہے اور جانور ہر شے چیر پھاڑ کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس بات کو "پیشانی" تک لاتا ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو پروسیس ہی نہیں کرتا۔ اس کو سوچتا ہی نہیں۔"

وہ بس پتلیاں سکیڑے اس کو دیکھے گئی۔

"انسان ہر بات فرنٹل لوب کے پاس لاتا ہے' اس پہ غور کرتا ہے' مگر جب کوئی کام عادت بن جائے' تو آنکھ اس کو دیکھتے ہی پیشانی کو پیغام پہنچانے کے بجائے ڈائریکٹ پچھلے حصے کو پیغام دے دیتی ہے جو ہاتھ کو کہتا ہے کہ کر ڈالو اور ہاتھ کر ڈالتا ہے۔ یوں سارے اعضا پیشانی کو بائی پاس کر جاتے ہیں۔ وہ شارٹ کٹ بنا لیتے ہیں۔ جیسے ہم کمرے میں داخل ہوتے ہی عادتاً سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے لائٹ جلاتے ہیں۔ ایسے ہی عادتیں بنتی ہیں مگر پھر......"

اس نے گہری سانس لی۔

"کچھ کاموں میں دماغ کے پچھلے حصے کو مزا آنے لگتا ہے۔ وہ پیشانی کو بائی پاس کرنے لگ جاتا ہے اور وہ کام ہماری ایڈکشن بن جاتے ہیں۔ لت، نشہ۔ کیوں ہیروئن ایڈکٹ یا شرابی یا انٹرنیٹ پہ غلط چیزیں دیکھنے والے ان عادتوں کو چھوڑ نہیں پاتے؟ کیونکہ ان کے اعضاء وہ کام کرتے وقت پیشانی کو Skip کر دیتے ہیں۔ وہ اس کو سوچتے نہیں۔ اس سے پوچھتے نہیں۔ اس بات کو پراسیس ہی نہیں کرتے۔ اس کو کمپلسیو رویہ کہا جاتا ہے۔ بنا سوچے سمجھے عادتاً کیا جانے والا عمل۔"

"تم کہنا چاہتے ہو کہ میں عادی جھوٹی ہوں؟"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"چے تالیہ۔" اس نے گہری سانس لی۔ "آپ کو کہانیاں گھڑنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ آپ بلا ضرورت جھوٹ بول دیتی ہیں۔ اب وان فاتح کو آپ سچ بھی بتا سکتی تھیں مگر آپ کو لگتا ہے کہ سچ کوئی سمجھے گا نہیں۔ سب کمپلسیو لائیرز کو یہی لگتا ہے۔ یہ بزدلی ہے۔ سچ بہادری ہے۔ خود اعتمادی ہے۔ ایڈکشن کا بہترین حل ول پاور کو استعمال کرنا ہے۔ ہر بار پیشانی (اس نے ماتھے پہ انگلی سے دستک دی) کے سامنے معاملہ رکھنا ہے اور اس معاملے پہ سوچنا ہے۔ نفع نقصان۔ پھر اس کو کرنا ہے۔ خود کو غلط کاموں سے روکنے کا یہی طریقہ ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ اپنی اس عادت کو بدلیں تو آپ کو اپنی فرنٹل لوب کو استعمال میں لانا ہو گا۔"

"یعنی میں جو بھی کر لوں' آخر میں تم دونوں کے نزدیک میں ایک جھوٹی اور بد دیانت چور ہی رہوں گی؟ تھینک یو' ایڈم۔" دکھ اور غصے سے بولتی وہ پلٹی اور تیز تیز ایک طرف بڑھ گئی۔ ایڈم گہری سانس لے کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ اندھیری گلی میں آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے سنہری بال ہڈ سے نکل نکل کے اُڑ رہے تھے۔

☆☆☆

چار عربی النسل گھوڑوں کا وہ مختصر سا قافلہ ملاکہ کی گلیوں میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پچھلے تین گھوڑوں پہ غلام سوار تھے اور پہلے کی لگام وان فاتح نے تھام رکھی تھی۔ اس پہ فربہ، پھولے گالوں والا وانگ لی سوار تھا۔ لمبے بال چوٹی کی صورت بندھے تھے اور رات کے اس پہر بھی چہرے کی چکنی جلد چمک رہی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے، لگام تھامے نئے غلام کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

فاتح کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ مشینی انداز میں سارے کام سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں وانگ لی کے لیے شناسائی کی کوئی رمق تک نہ تھی۔

گلی کے وسط میں پہنچ کے وانگ لی نے گھوڑا رکوا دیا تو فاتح نے نظر اٹھائی۔

سامنے ایک بڑا سا پھاٹک تھا۔ سرخ پھاٹک۔

اس کا سانس لمحے بھر کو تھم گیا۔

تین خزینوں کا مسکن۔ سن باؤ کا گھر۔

وہ نئے دور سے مختلف تھا۔ نئے دور میں اس گھر کا دروازہ عصرہ نے بنوایا تھا اور سامنے گلی تھی اور گلی کے دوسری طرف دکانوں کی قطار۔ مگر اس قدیم دور میں سن باؤ کے گھر کے سامنے کا علاقہ کئی کوس تک صرف سبزہ زار پہ مشتمل تھا۔ دور درختوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ اس گھر کے ساتھ قطار میں ایسے دوسرے کئی گھر بھی بنے ہوئے تھے اور وہ سب نئے دور سے بڑے نظر آتے تھے۔

سن باؤ گھوڑے سے اترا تو فاتح نے لگام چھوڑ دی۔ دو غلام گھوڑے لیے پلٹ گئے۔ فاتح اور ایک غلام اس کے ساتھ اندر آئے۔ دروازہ عبور کیا تو سامنے راہداری سی تھی۔ وہ بالکل گم صم سا ادھر ادھر دیکھتا ہوا راہداری سے گزر کے اندرونی برآمدے تک آیا جس کے آگے چوکور صحن بنا تھا۔

دوسرے غلام نے جلدی جلدی چند مشعلیں روشن کیں تو اندھیرے میں اجالا سا ہو گیا۔ سن باؤ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور وہ...... وہ برآمدے میں مبہوت سا کھڑا ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔

برآمدے میں آتش دان کے ساتھ خالی کرسی رکھی تھی۔ ایسے ہی عصرہ نے نئے دور میں رکھی تھی۔ صحن کے ایک کونے میں کنواں بنا تھا اور دوسرا کونا...... فاتح کی نظریں اس طرف گئیں۔ وہ خالی تھا۔

وہاں کوئی مجسمہ نہ تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا صحن کے وسط میں آر کا۔ کوئی طلسم سا تھا اس گھر میں۔ یہ اس کے گھر جیسا بالکل نہ تھا۔ رنگ روغن، فرنیچر، پودے، سب مختلف تھے مگر یہ اس کے گھر جیسا ہی تھا۔ ویسا ہی پُرفسوں اور پُراسرار۔

"فاتح بن رامزل نام ہے تمہارا؟"

وہ بے ساختہ پلٹا۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ سن باؤ آ کھڑا ہوا تھا۔ لبوں میں سگار دبائے، وہ دیا سلائی سے اس کو سلگا رہا تھا۔

"جی، مالک!" اس نے سر کو خم دیا مگر نظر نہ جھکائی۔ یہ اس کا جھک کے بھی نہ جھکنے والا انداز تھا جو ہر دفعہ کی طرح سن باؤ کو آج بھی بہت اچھوتا لگا تھا۔

"جانتے ہو تمہیں اتنی قیمت دے کر کیوں خرید لایا ہوں؟"

"نہیں جانتا، مالک۔"

سن باؤ نے گہرا کش بھرا اور سگار باہر نکال کے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے منہ سے دھواں چھوڑا۔

"کیونکہ تم نے میری جان بچائی تھی۔ اللہ فرماتا ہے، احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟"

"میں شکر گزار ہوں، مالک۔"

سن باؤ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ سگار کا کنارا سرخ دہکتا رہا۔

"تم نے مجھے مطلع کیا تھا کہ میرے شوربے میں زہر ہے۔ مجھے تمہاری اس وفاداری کی خصلت نے متاثر کیا اور میں تمہیں یہاں لے آیا۔ اب مجھے بتاؤ کہ ابوالخیر مجھے کیوں مارنا چاہتا تھا؟ اور یہ سب اس کی ایماء پہ ہوا تھا نا؟"

"مالک، میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" غلام سپاٹ کھڑا تھا۔

سن باؤ نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔ "تم نے مجھے زہر کے بارے میں مطلع کیا تھا اور......"

"میں اپنے سابقہ مالک کی کوئی برائی آپ سے بیان نہیں کروں گا مالک! یہ میری تربیت کے خلاف ہے۔"

سن باؤ نے گہری سانس لی اور افسوس سے اسے دیکھا۔ "میں نے تمہیں سونے کا ایک ڈھیر دے کر خریدا اور تم نے پہلی ہی رات میری حکم عدولی کر دی۔ انجام جانتے ہو اس کا؟"

وہ کنویں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس تاریک قدیم صحن میں۔ اس بات پہ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"وفاداری...... آپ نے کہا آپ کو میری وفاداری نے متاثر کیا مالک! جبکہ آپ کی جان بچانے کا عمل انسانی ہمدردی کے زمرے میں آتا ہے اور جو ابھی آپ نے سب کہا وہ حکم نہیں' امتحان تھا۔ آپ میرا امتحان لے رہے تھے اور میں اس امتحان میں پورا اترا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ جانچ رہے تھے کہ آیا میں اپنے سابقہ مالک کی برائی بیان کروں گا یا نہیں۔ تو جو وفاداری آپ کو میری پیشانی پہ ثبت نظر آئی تھی' جس کو پڑھ کے آپ نے مجھے خریدا' اس وفاداری کو ہلکا مت جانیے۔ اگر آج سابقہ مالک کی برائی نہیں کر سکتا تو کل کو آپ کی بھی نہیں کروں گا۔ آپ مجھے وفا کے ہر امتحان میں پورا پائیں گے۔"

سن باؤ برآمدے سے ایک قدم نیچے اترا تو چہرہ آدھے چاند کی چاندنی میں روشن نظر آیا۔ اس پہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"میری قیافہ شناسی (چہرے پڑھنا) کبھی غلط نہیں ہوتی۔ فاتح' مجھے خوشی ہے کہ میں نے درست انتخاب کیا ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح نمازِ فجر کے بعد سے کام شروع کرنا ہوگا تمہیں۔"

وہ مڑنے لگا تو فاتح بول اٹھا۔ "آپ ایک عظیم آدمی ہیں' مالک۔"

فربہ چینی سفارتکار ٹھہرا اور پلٹ کے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم مجھے کتنا جانتے ہو۔"

غلام سادگی سے مسکرایا۔ "آپ ایک جنگی قیدی کے طور پہ چینی شاہ کے دربار میں لائے گئے تھے۔ وہاں آپ کو غلام (تائی ژان) بنایا گیا تھا۔ آپ نے برسوں شاہِ چین کی خدمت کی۔ آپ شاہ کے وفادار غلام ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی یان سوفو کو شادی کے لیے رخصت کرتے وقت بھی شاہ نے آپ کو ان کے ساتھ بھیجا۔ آپ ملکوں ملکوں گھومے ہیں' اور چائے کے جنگلات سے آپ کو عشق ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے سات بحری سفر کیے ہیں جو تاریخ میں یاد رکھے جائیں گے۔"

"چھ...... میں نے چھ سفر کیے ہیں۔"

فاتح ٹھہر گیا۔ رات ایک دم سوگوار ہو گئی۔

"آپ ساتواں بھی کریں گے' مالک۔"

"اچھا؟ مجھے تو سمندر میں اترے زمانے بیت گئے۔ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"مجھے بھی پیشانی کی لکیروں میں چھپا مستقبل پڑھنا آتا ہے۔ مگر میں چاہوں گا کہ آپ وہ ساتواں سفر کبھی نہ کریں۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"ہمیں ان سوالوں کے جواب نہیں پوچھنے چاہئیں جو اگر ہمیں معلوم ہو جائیں تو برے لگیں۔"

سن باؤ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "زمانہ ہوئے ایک بھکشو نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے سمندری سفر نہیں کرنے چاہئیں۔ اس دنیا میں میرا آخری سفر بھی سمندر میں ہوگا جہاں سے میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ کیا واقعی ایسا ہوگا؟"

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ رکھے اور آنکھوں میں سارے جواب تحریر تھے۔

"مگر خیر...... تمہیں مستقبل کا کیا علم!" سن باؤ نے مسکرا کے سگار پھینکا' انگارے کو جوتے سے مسلا اور پھر ادھر اُدھر طائرانہ نظر ڈالی۔ "تم کوئی بھی کونا لے سکتے ہو۔ سوائے اس برآمدے اور میرے کمرے کے' سارا گھر اپنا ہی سمجھو۔"

وان فاتح نے گردن اٹھا کے بالائی منزل کے اس کمرے کی کھڑکی کو دیکھا جو صحن میں کھلتی تھی۔

"وہ اوپر والا کمرہ...... وہ میرا ہوگا۔"

"وہ؟" سن باؤ نے تعجب سے ابرو اچکائے۔

"وہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہے اور اسے صاف کرنے کی ضرورت......"

"وہ میرا ہے مالک! مجھے وہی کمرہ چاہیے۔" ادب سے اس کی بات کاٹی تو وانگ لی نے شانے

اچکائے۔

''جیسے تمہاری مرضی فاتح!'' اور پلٹ گیا۔ اب وہ ــــ زیر لب کوئی چینی دھن گنگناتا ہوا اندر کی طرف جارہا تھا۔

تاریک صحن میں وہ کنویں کے ساتھ کھڑا اس قدیم خاموشی کو محسوس کرتا رہا۔

صحن کا دوسرا کونا خالی تھا۔

صاف ہموار۔

وہاں کوئی مجسمہ نہ تھا۔

☆☆☆

ملاکہ شہر فجر کی نماز کے ساتھ ہی جاگ اٹھتا تھا اور بازار کھل جاتے تھے۔ محل میں بھی کام شروع ہوجاتے۔ شاہی مکین تیار ہو کے اپنی خواب گاہوں سے نکل آتے اور اپنے اپنے دربار سجا لیتے۔ یہاں زندگی سورج کی روشنی کی محتاج تھی۔ سورج جیسے جیسے سوا نیزے پہ پہنچتا' مصروفیت عروج پہ جا پہنچتی۔

''سلطنت محل'' میں سلطان کا دربار سجا تھا اور مرسل شاہ تخت پہ براجمان نیم دلی سے مراد راجہ کو سن رہا تھا جو نئے حکم نامے اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ درباری وزراء مرعوبیت اور حسد سے مراد راجہ کو دیکھ رہے تھے جو سلطان کے بائیں ہاتھ پہ کھڑا، طاقت کا منبع لگ رہا تھا۔ یہ معمول کی کارروائی تھی اور ہر روز کی طرح جاری وساری تھی۔

باہر محل کے بائیں باغ میں ملکہ یان سوفو اپنی کنیزوں کی معیت میں تیز تیز چلتی جارہی تھی۔ بڑا سا تاج پہنے وہ سولہ سنگھار سے آراستہ تھی البتہ مزاج برہم لگتا تھا۔

سامنے سے تین افراد آتے دکھائی دیے تو ملکہ رک گئی۔ وہ تینوں قریب آئے اور جھک کے اسے تعظیم پیش کی۔ پھر ادھیڑ عمر آدمی جو کہ محل کا طبیب تھا' سر اٹھا کے کہنے لگا۔

''ملکہ...... میں سلطنت محل کا پرانا طبیب ہوں۔''

''جانتی ہوں۔'' وہ بے زاری سے بولی۔ ''کیا میرا چینی طبیب ملا ہے آپ سے؟''

''جی ملکہ! وہ حاضر ہوا تھا اور اس نے وہ ٹوٹکا بتایا ہے جس سے چینی شاہ تندرست ہو سکتے ہیں۔'' وہ رکا اور ٹھہر کے بولا۔ ''اس کے خیال میں......''

یان سوفو کی خوب صورت پیشانی پہ بل پڑے۔ ''یہ آزمودہ ٹوٹکا ہے۔ آپ سلطان کے غسل کا پانی اکٹھا کریں اور اسے میرے طبیب کو دیں تاکہ وہ چین لے جائے اور میرے بابا کا علاج کر سکے۔ یہ کام ابھی تک ہوا کیوں نہیں؟''

بوڑھے طبیب نے گہری سانس لی۔ ''معذرت ملکہ! مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے اس ٹوٹکے کی افادیت من گھڑت لگتی ہے۔ سلطان کا غسل کا پانی سلطان پہ جادو ٹونے کرنے کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ ہم کسی اور کی جان بچانے کے لیے سلطان کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے؟''

یان سوفو نے لب بھینچے۔ چہرہ گلابی پڑنے لگا۔ ''یہ میرے بابا کی صحت کا سوال ہے۔ آپ میری حکم عدولی کیسے کر سکتے ہیں۔''

''ملکہ! میرا کام سلطان کو درست مشورہ دینا ہے۔ ماضی میں بھی طبیب کا قول اس محل میں سلطان کے قانون سے بھی اوپر رہا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں مگر میں آپ کے چینی طبیب کے ٹوٹکے پہ سلطان سے عمل نہیں کروا سکتا۔ ملاکہ کے قانون کے مطابق طبیب کی بات حرف آخر ہوتی ہے' اور اسے قاضئ وقت بھی نہیں بدل سکتا۔'' ہاتھ باندھے، وہ ملکہ کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک ڈھکا چھپا استہزاء تھا۔

یان سوفو نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ ''آپ کو اپنا قول بدلنا ہوگا، طبیب!''

''سلطنت محل کے طبیب اپنے اقوال نہیں بدلا کرتے کیونکہ وہ مریض کی بہتری کو مقدم رکھتے ہیں۔ چاہے طبیب کا سر ہی کیوں نہ کٹوا دیا جائے۔'' وہ ہٹ دھرم تھا۔

یان سوفو کو ایک دم اپنا آپ بہت بے بس لگا۔

اس نے طبیب کے ساتھ کھڑے معالجوں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ سب ملے تھے۔ ملے نقوش والے اجنبی لوگ۔ اور وہ چینی تھی۔ وہ ان میں غیر تھی۔ اس کے حلق میں آنسو گرنے لگے۔ پرایا ملک۔ پرایا محل۔ یہ سب اس کے لیے اجنبی تھا۔ آخر کیوں شاہ چین نے شادی کر کے اس کو یہاں بھیج دیا؟ وہ اب کیسے رہے گی یہاں؟

آہ...... ہم شہزادیوں کی سیاسی، ناخوش گوار شادیاں۔ اسے خود پہ ترس آیا۔

''آپ نے درست فرمایا' طبیب صاحب۔''

آواز پہ وہ سب چونکے۔ یان سوفو نے گردن موڑی۔ تالیہ مسکراتی ہوئی، کامدار لباس پہلوؤں سے اٹھائے' چلی آ رہی تھی۔ اپنی کنیزوں کو دور کھڑا کیے' وہ تنہا قریب آئی تھی اور ان دونوں کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ طبیب نے چونک کے اسے دیکھا اور یان سوفو...... اس کے کان سرخ ہونے لگے۔ وہ کم از کم بنداہارا کی بیٹی کے سامنے اپنی بے بسی کا تماشا نہیں چاہتی تھی۔

''شہزادی!'' طبیب نے تعظیم پیش کی۔ یان سوفو نے صرف اسے گھورا۔

''آپ نے درست فرمایا طبیب صاحب۔'' مسکراتے ہوئے تالیہ نے بات جاری رکھی۔ سنہرے بالوں پہ سجا تاج اور اس کی آنکھیں، دونوں چمک رہے تھے۔ ''آپ کا سر بھی کٹ جائے تو آپ کو اپنا قول نہیں بدلنا چاہیے۔''

یان سوفو نے دانتوں پہ دانت جما لیے۔ مٹھیاں سختی سی بھینچ لیں۔ یہ بے بسی...... یہ لاچاری۔

''لیکن اگر تنخواہ کٹ جائے تو؟'' سنہری لٹ کو انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے شہزادی تاشہ نے سوال پوچھا تو طبیب چونکا۔

''میں سمجھا نہیں' شہزادی۔''

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور چہرے پہ ایک دم برہمی آ گئی۔

''چینی شاہ کی بیٹی...... ملاکہ کی ملکہ...... یہاں کھڑی ہو کے صرف ایک بیٹی کی حیثیت سے آپ سے سوال کر رہی ہے کہ آپ ان کے والد کی جان بچائیں اور آپ ان کو جواب میں قانون کی شقیں پڑھا رہے ہیں؟''

وہ غرا کے بولی تو طبیب نے ادب سے نظریں جھکائیں۔ یان سوفو کی مٹھیاں ڈھیلی پڑیں۔ وہ گم صم سی تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

''صرف اس لیے کہ ملکہ کی شکل آپ سے مختلف ہے، آپ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کے ملکہ کو اذیت دینا چاہ رہے ہیں؟'' وہ طبیب کے جھکے چہرے پہ نظریں جمائے پھنکار رہی تھی۔

''اگر بات قانون کی ہے، تو مشیر خاص کا عہدہ طبیب کے عہدے سے بڑا ہے۔ میں سلطان کی مشیر خاص ہوں۔ ابھی ابوالخیر کو حکم جاری کر سکتی ہوں کہ آپ کی تنخواہ آدھی کاٹ دی جائے۔ اور یقین کریں' میں دلیل کے طور پہ ایسے اعداد و شمار دکھا سکتی ہوں جو یہ ثابت کریں گے کہ آپ حق سے بڑھ کے تنخواہ لے رہے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں آپ کو ایک موقع ضرور دوں گی۔''

پھر ملکہ کی طرف اشارہ کر کے تحکم سے بولی۔

''ملکہ سے معافی مانگیے اور اپنا سر ان کے حکم کے آگے جھکا دیجیے۔ نہ صرف آپ کی تنخواہ اور مراعات بڑھیں گی' بلکہ عزت بھی دگنی ہو جائے گی۔''

یان سوفو کے چہرے کی سرخی زائل ہو چکی تھی۔ وہ بس تالیہ مراد کا چہرہ تک رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے۔ سانس روکے۔ بنداہارا کی بیٹی ابھی بھی طبیب سے مخاطب تھی۔ جس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا' دوسرا جا رہا تھا۔

''کیونکہ اگر آپ نے انکار کیا تو میں قاضی وقت کے پاس فتویٰ لینے جاؤں گی کہ آپ منکرِ حدیث ہیں۔ نظر لگنے کا علاج حدیث پاک ﷺ میں نظر لگانے والے کے غسل کے پانی سے کیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ جائیے، طب نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتابیں کھولیے، اور پڑھیے۔ چینی ٹوٹکا ہماری

حدیث سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ملکہ نے آپ سے چند بوندیں پانی کی ہی تو مانگی ہیں۔ یہ سوچ کے انکار مت کیجیے کہ ملکہ تنہا ہیں۔ اگر آپ نے، یا اس محل میں کسی ملے عہدیدار نے.....'' ارد گرد نظر دوڑا کے اونچی آواز میں بولی۔ ''دوبارہ کسی چینی عورت کو تنہا جان کے اس پہ ظلم کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا' ملاکہ میں رہنے والی ہر چینی عورت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو گی' مجھ سمیت۔'' سینے پہ انگلی سے دستک دی۔

''کیونکہ میری ماں بھی چینی تھی اور میں نے بھی چین میں پرورش پائی ہے۔''

''مجھے معاف کر دیجیے، ملکہ۔'' طبیب فوراً جھکا اور ملکہ کے جوتوں پہ ہاتھ رکھ دیے۔ ''میری جان لے لیجیے مگر آئندہ حکم عدولی نہیں ہو گی۔''

یان سوفو نے قدموں میں جھکے طبیب کو نہیں دیکھا۔ وہ بس گردن موڑے یک ٹک تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر لبوں کو جنبش دی۔

''جاؤ' حمام کا انتظام کرو اور پانی بھجواؤ۔'' گم صم نظریں اب بھی تالیہ پہ جمی تھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ پُراعتماد' پُرسکون' نارمل سی۔

وہ سب دور چلے گئے اور کنیزیں پیچھے ہٹ گئیں تو سن سی کھڑی یان سوفو نے اسے پکارا۔

''اس سب کا کیا مقصد تھا؟''

تالیہ پوری کی پوری اس کی طرف گھومی۔ تاج سے نیچے اس کے سنہری بال ہلکی ہوا سے کندھوں پہ جھول رہے تھے اور چہرے پہ سادہ سی مسکراہٹ تھی۔

''میں آپ کو یہ بتا رہی تھی ملکہ کہ میری ماں واقعی چین کی تھی اور میں نے چین میں ہی پرورش پائی ہے کیونکہ جب چینی کوتوال کے مراسلے خالی نکلیں تو شک لازمی ہوتا ہے۔''

یان سوفو دھک رہ گئی۔ لب کھل گئے۔ تالیہ نے لباس سے ایک سرخ ریشم میں لپٹا تہ شدہ کاغذ نکالا۔

''یہ وہ مراسلہ ہے' جو چینی کوتوال نے آپ کے نام بھیجا تھا۔ آپ کا آدمی واپسی پہ جس سرائے میں ٹھہرا تھا وہاں میرے آدمی نے مراسلہ بدل ڈالا۔ میں اصلی مراسلہ لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کو دو باتیں بتانے۔''

وہ مراسلہ یان سوفو کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔ اور یان سوفو بالکل بت بنی کھڑی تھی۔

''کوئی بھی رشتہ' کوئی بھی تعلق، جھوٹ سے شروع نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں ہمیشہ سو فیصد سچائی ہونی چاہیے۔ اس لیے یہ خط میں خود آپ کو پیش کرتی ہوں۔ اس کو کھول کے پڑھ لیں یا چاہیں تو اس کو کھولے بنا میری دوسری بات سن لیں۔''

''بولو۔'' وہ پلک تک نہیں جھپک رہی تھی۔ سوا نیزے پہ آئے سورج تلے وہ دونوں باغ میں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔

''میں..... آپ کی..... دشمن..... نہیں ہوں۔ میں مرسل شاہ کو آپ سے دور نہیں کرنا چاہتی۔ میں مرسل شاہ کو صرف راجہ مراد سے دور کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کو ایک مضبوط اور طاقتور سلطان بنانا چاہتی ہوں۔ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے اور وہ ہے راجہ مراد۔''

''اور تم راجہ مراد کی بیٹی ہو۔''

''تو پھر وہ مجھے سن باؤ کے گھر کھانے پہ کیوں نہیں لے کر گیا؟ پھر وہ مجھ سے ڈرتا کیوں ہے؟ اس نے کیوں اتنے سال مجھے خود سے دور رکھا۔ اور اس کی مرضی کے خلاف میں واپس کیوں آئی ہوں۔''

یان سوفو بھنویں اکٹھی کیے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''میں نے ابوالخیر کو خزانچی اس لیے بنایا تاکہ سن باؤ کو ہم سرکاری عقابوں کی نظروں سے محفوظ الگ تھلگ رکھ سکیں گے۔ سن باؤ اس سے بڑے کاموں کا اہل ہے۔ ہم اس سے دوسرے کام لے سکتے ہیں۔''

''ہم؟'' یان سوفو کا ذہن اس ایک لفظ پہ اٹک گیا۔

''جی ملکہ! اگر آپ اس خط کو پڑھے بغیر جلا ڈالیں تو میں اور آپ 'ہم' ہو سکتے ہیں۔ دو چینی عورتیں..... اور مقابل ہو گا سارا ملاکہ۔'' وہ کاغذ ملکہ کی طرف

بڑھایا، مسکرا کے بولی تو یان سوفو نے ایک نظر خط پہ ڈالی۔
"کیا تم نے پڑھا ہے کہ کوتوال نے تمہارے بارے میں کیا لکھا ہے؟"
"مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ملکہ۔ میں خود کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ مجھے، مجھ سے بہتر نہیں جان سکتا۔"
"اور دوسری بات کیا تھی؟"
تالیہ کی زخمی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ "میں جہاں سے آئی ہوں' تھوڑے عرصے بعد وہاں واپس چلی جاؤں گی۔ میں واپس جانے کے لیے آئی ہوں۔ ملاکہ سے ایک چیز لے جانے کے لیے۔ کیونکہ میری دنیا' میری زندگی اور میری محبتیں وہ سب وہاں ہے۔ یہاں میرا کچھ بھی نہیں ہے۔"
یان سوفو کو جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ابرو اٹھائے۔ "تم محل کے عیش و آرام چھوڑ کے اپنے گاؤں چلی جاؤ گی؟"
"میرے "گاؤں" میں محل نہیں ہیں، گھر ہیں۔ وہاں میں شہزادی نہیں ہوں' عام لڑکی ہوں۔ مگر میری محبتیں اور یادیں وہیں ہیں۔ وہاں کوئی ایسا تھا جس پہ میں نے دل ہارا تھا' اور مجھے اسی کے لیے واپس جانا ہے۔"
یان سوفو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے۔ "تو کیا وہاں تم کوئی محبوب چھوڑ کے آئی ہو؟" پہلی دفعہ اس کے لہجے میں نرمی گھلی۔
تالیہ نے اداسی سے مسکرا کے سر کو خم دیا۔ "جی ملکہ! ایک آدمی تھا۔ مجھے اتفاق سے ملا تھا۔ وہ جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔
(آنکھوں میں تنکو کامل کے نیم روشن ڈرائنگ روم کا منظر جاگا۔ وہ جھک کے اسے جوس پیش کر رہی تھی۔)
وہ جو میرا نام بھول جایا کرتا تھا۔ (وہ سرخ لباس میں آرٹ گیلری کے آفس میں عصرہ اور اشعر کے ساتھ کھڑی تھی اور وہ اسے تاشہ کہہ کے پکار رہا تھا۔)
وہ جو میرے جیسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ (وہ ڈائننگ ٹیبل کے مخالف سروں پہ بیٹھے بات کر رہے تھے اور گھائل غزال میز پہ رکھی تھی۔)
وہ جو مجھے بلاوجہ ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ (وہ لائبریری میں کھڑی تھی اور فاتح ورزش کے لباس میں تولیے سے گردن پونچھتا' اسے تلخی سے کچھ کہہ رہا تھا۔)
مجھے اس کا وہی روپ پسند تھا۔ اور مجھے وہی واپس چاہیے۔" اور پھر دونوں ہتھیلیوں میں مراسلہ ملکہ کی طرف بڑھایا۔
"آپ اپنے تجسس کی تکمیل چاہتی ہیں یا خوابوں کی؟ فیصلہ آپ کا ہے۔"
یان سوفو چند لمحے اس سرخ رومال کو دیکھتی رہی' پھر اسے اٹھالیا اور مڑ گئی۔ اب وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تالیہ وہیں کھڑی رہی' بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
برآمدے میں داخل ہوتے ہی یان سوفو دیوار پہ لگی مشعل کی طرف بڑھی اور سرخ رومال میں لپٹا کاغذ اس میں جھونک دیا۔ پھر ساتھ رکھی دیا سلائی سلگائی اور مشعل کا شعلہ بھڑکا دیا۔ آگ کی لپیٹوں نے ریشم کو فوراً اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کاغذ اور کپڑا دونوں جلنے لگے۔
یان سوفو برآمدے کے سرے پہ آرکی اور فاتحانہ نگاہوں سے دور کھڑی تالیہ کو دیکھا۔ بنداہارا کی بیٹی مسکرائی اور سر کو پورا جھکا کے اٹھایا۔
ملکہ کی گردن مزید تن گئی۔ وہ عرصے بعد خود کو بہت مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ وہ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ایک دوسری عورت کا ساتھ چاہیے تھا۔
"اس کاغذ میں کیا تھا؟ آخر کوتوال نے آپ کے بارے میں لکھا کیا تھا' چے تالیہ؟" اس دوپہر ایڈم نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔ وہ دونوں سادہ چغوں میں ملبوس، ملاکہ کے بازار میں بھیس بدلے، چل رہے تھے۔

www.urdusoftbooks.com

''کاغذ خالی تھا۔ ملکہ کی ایک کنیز نے شریفہ کو بتا دیا کہ ملکہ ملازم کو چھین بھیج رہی ہے میرے تعاقب میں تو ہم نے اس ملازم کو خرید لیا۔ وہ چھین گیا ہی نہیں۔ وہ کوتوال سے ملا ہی نہیں۔ دونوں کاغذ خالی تھے۔''

''تو آپ نے ملکہ کو بے وقوف بنایا؟''

''نہیں ایڈم! میں نے ملکہ سے سچ بولا۔ میں نے اس کو اپنی طاقت بھی دکھائی' اور اپنی کمزوری بھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ دوسرے کاغذ میں بھی کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہے بھی تو وہ میرے جیسی طاقتور حلیف سے بڑھ کے نہ ہوگا اور اسے یہ تسلی بھی ہوگئی کہ میں مرسل شاہ کو اس سے چھیننے نہیں آئی ہوں۔ اس لیے اس نے صحیح فیصلہ کیا۔''

وہ دونوں اب بازار کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ صاف چہرے' سادہ کپڑے اور چہروں پہ ٹوپی کا سایہ' وہ بھیس بدل کے عام لوگ نظر آتے تھے۔ بازار کی گہما گہمی اور رش عروج پہ تھا' پھر بھی خاموشی سے محسوس ہوتی تھی۔ نہ ٹریفک کا ہارن' نہ موسیقی کی آوازیں۔ کوئی مقدس خاموشی تھی جو اس دنیا میں جانے کتنی صدیوں سے تھی۔

ایک دکان کے سامنے قہوہ، چائے کے لیے کرسیاں میزیں رکھی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ایڈم نے چائے منگوالی اور پھر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا جو بے زار سی بیٹھی ایک طرف چہرہ موڑ کے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کل رات سے خاموش خاموش ہیں۔ اور پھر آپ نے آج یان سوفو کو حلیف بنالیا۔ کیا اس سب کا تعلق فاتح صاحب کی باتوں سے ہے؟''

تالیہ نے سرد سی نظریں اس کی طرف موڑیں۔ ''میں ان کے لیے ایک جھوٹی اور بددیانت لڑکی تھی اور رہوں گی۔ کل رات جو انہوں نے میرے ساتھ کیا' اس کے بعد میں اپنی زندگی کی ترجیحات خود سیٹ کر رہی ہوں' ایڈم۔ وہ اب اپنے فرار کا راستہ خود ڈھونڈیں گے۔ نہ میں ان پہ انحصار کروں گی' نہ وہ مجھ پہ۔ کل ہم الگ ہوگئے تھے۔''

''اور میں؟ میں کس گنتی میں ہوں بھئی؟'' اس نے منہ بسورا۔

''تم مؤرخ ہو' تاریخ لکھو۔ تاریخ بنانے کا کام مجھ پہ چھوڑ دو۔'' وہ خفگی سے بولی۔ بیرا چائے لے آیا تو اس نے شیشے کی نازک پیالی اٹھالی اور گرم گرم گھونٹ بھرنے لگی۔

''آپ ان سے ناراض ہیں' ٹھیک ہے۔ مگر مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ کیا ان باتوں کی وجہ سے جو میں نے کل آپ سے کہیں؟'' ساتھ ہی اپنی پیشانی پہ انگلی رکھی' جیسے باتوں کا موضوع یاد دلایا ہو۔

تالیہ نے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی۔ ''تم نے درست کہا تھا۔ جو لوگ اپنی فرنٹل لوب کو استعمال نہیں کرتے' وہ ایڈکٹ ہو جاتے ہیں۔ ڈرگز' غلط چیزوں اور جھوٹ کے۔ مگر کچھ لوگ سچ کے بھی ایڈکٹ ہوتے ہیں۔ وہ پیشانی سے سوچے بغیر، دوسرے کے جذبات کا احساس کیے بغیر' اگلے کو جج کر کے نصیحت شروع کر دیتے ہیں۔ ایڈکشن ہر چیز کی غلط ہوتی ہے، ایڈم۔ بھاشن دینے کی بھی۔ سچ بولنے کی بھی۔'' خالی پیالی میز پہ دھری اور خفگی سے چہرہ موڑ لیا۔ ایڈم گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی پیالی رکھی' اور اپنا دستہ کھول لیا۔ دوات نکالی اور قلم اس میں ڈبو ڈبو کے لکھنے لگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

کوئی خواب تو باندھو آنچل سے

مانا کہ سفر بے فیض سہی
اور پاؤں میرے ہیں آبلہ پا
تم ساتھ ہو میری دھڑکن کے
بس اتنا سا احساس تو ہو
کوئی خواب تو باندھو آنچل سے
جینے کی مجھے اک آس تو دو
نہ عمر اکارت جائے گی
اس دشتِ جنوں کی وادی میں
اک بار کہو، دھیرے سے کہو
مجھے تم سے محبت ہے جاناں
بس اتنا سا اقرارِ وفا
سو رنگ بھرے گا جیون میں
مٹ جائے گی ساری تنہائی
اور پھول کھلیں گے دھڑکن میں

عائشہ فیاض رانا

جن راتوں میں نیند اُڑ جاتی ہے، کیا قہر کی راتیں ہوتی ہیں
دروازوں سے ٹکرا جاتے ہیں، دیواروں سے باتیں ہوتی ہیں

آشوبِ جدائی آتے ہی انہونی باتیں ہوتی ہیں
آنکھوں میں اندھیرا چھاتا ہے جب اُجلی راتیں ہوتی ہیں

قسمت جاگے تو ہم سوئیں، قسمت سوئے تو ہم جاگیں
دونوں ہی کو نیند آئے جس میں کب ایسی راتیں ہوتی ہیں

جو کچھ بھی خوشی سے ہوتا ہے یہ دل کا بوجھ نہ بن جائے
پیمانِ وفا رہنے بھی دو، سب جھوٹی باتیں ہوتی ہیں

ہمت کس کی ہے جو پوچھ سکے، یہ آرزوئے سودائی ہے
کیوں صاحب آخر اکیلے میں یہ کس سے باتیں ہوتی ہیں

آرزو لکھنوی

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے (یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا یا غلام آزاد کرنا۔ اگر ان کاموں کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا)

سراپا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم،

ایک بدوی خاتون کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے متعلق بیان۔

"میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا، جس کی لطافت نمایاں تھی۔ چہرہ روشن، بناوٹ میں حسن، نہ موٹاپے کا عیب، نہ دبلے پن کا نقص، خوش رو حسین، آنکھیں کشادہ اور پلکیں سیاہ لمبی، آواز میں کھنک، گردن صراحی دار، داڑھی گھنی، بھنویں کمان دار جڑی ہوئی، خاموشی میں پُروقار، گفتگو میں صفائی و دلکشی، حسن کا پیکر، جمال میں یگانۂ روزگار، دور سے دیکھو تو حسین ترین، قریب سے دیکھو تو شیریں ترین، نہ فضول بات کرے، نہ ضرورت کے وقت خاموش رہے۔ گفتگو ایسی جیسے پروئے موتی۔ قد ایسا جس میں نہ قابل نفرت درازی نہ حقارت آمیز کوتاہی۔ باتوں سے خوشبو آئے، ترش روئی سے پاک اور قابل گرفت باتوں سے مبرا۔

صحیح طریقہ،

میں موبائل کا کھری جارج بیلنس غلط نمبر میں فیڈ کرا بیٹھا۔ کئی بار کال کی تاکہ اس سے کہہ کر اپنا بیلنس واپس منگواؤں مگر وہ موبائل کال اُٹھانے پر بھی تیار نہ ہوا۔ میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے میسج لکھا۔

"ٹی ٹی پی میں شمولیت پر مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ نے بیلنس قبول کرکے اپنی ممبر شپ کی توثیق کر دی ہے۔ ہمارے ذمہ داران کی آپ پر نظر ہے۔ ہم آپ کو ذمہ داریوں کی تربیت اور ٹارگٹ کی فراہمی کے لیے بہت جلد آپ سے رابطہ کریں گے۔"

دو سیکنڈ بعد ہی مجھے، میں نے جتنے پیسوں کا بیلنس کیا تھا، اس سے دو گنے پیسوں کا بیلنس وصول ہوا اور ساتھ ہی کال بھی کر رہا تھا۔

"بھائی! موبائل چارجنگ میں لگا ہوا تھا۔ آپ کی بیل نہیں سن سکا۔ آپ کے پیسے جرمانے کے ساتھ واپس بھیج رہا ہوں اور بھائی میں تو معذور آدمی ہوں ٹانگیں پولیو کی وجہ سے ٹیڑھی اور سوکھی ہوئی ہیں اور مجھے نظر بھی کم آتا ہے۔"

نادیہ یاسر۔ کراچی

خوش نہ ہو،

بیوی بہت دیر تک باتھ روم سے باہر نہیں نکلی تو شوہر کو فکر ہوئی۔ اس نے دھیرے سے دروازہ بجایا۔ اندر سے گرجتی ہوئی آواز آئی۔

"زیادہ خوش مت ہو۔ تمہاری سری دیوی ابھی زندہ ہے۔"

ندا، فضہ۔ فیصل آباد

روشنی،

"اگر کوئی تم کو صرف اپنی ضرورت کے وقت یاد کرتا ہے تو پریشان مت ہونا بلکہ فخر کرنا کہ اس

www.urdusoftbooks.com

کو اندھیروں میں روشنی کی ضرورت ہے اور وہ تم ہو۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

نصیحت،

امام غزالیؒ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ بیٹا! دنیا میں ایمان کے بعد اگر کوئی چیز ڈھونڈنا ہو تو اچھا دوست ڈھونڈنا کیونکہ اچھا دوست ایسے درخت کی مانند ہے کہ جب تم اس کے پاس جاؤ تو سایہ بھی دے گا اور پھل بھی۔"

سعدیہ وحید سعدی۔ اسلام آباد

اشفاق احمد کہتے ہیں،

- جب انسان اندر سے مر جاتا ہے تو حد سے زیادہ خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔
- کچھ لوگ اس لیے اکیلے ہیں کہ وہ "پل" کی جگہ "دیوار" بنا لیتے ہیں۔
- "نمط" صرف خوراک کا نہیں "مطالعہ" کا بھی ہوتا ہے۔
- اکثر لوگ اپنی گفتگو سے غیبت، بہتان، تہمت نکال دیں تو باقی صرف خاموشی رہ جاتی ہے جو کہ بہترین عبادت ہے۔
- ہم اللہ کو ایک تو مانتے ہیں پر اللہ کی ایک نہیں مانتے۔
- دوسروں کی توقعات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ دوسرا ہمیں چھوڑ نہ جائے۔
- ایک دلیل ایسی ہے جس سے آپ ہر ایک کو قائل کر سکتے ہیں اور وہ دلیل ہے آپ کا وجود۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تو آپ ایک بہت ہی طاقت ور دلیل بن جاؤ گے لیکن اگر آپ میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی تو پھر آپ چاہے کتنی ہی دلیل بازی کرو، کوئی نہیں مانے گا۔

نادیہ اشرف۔ راکے ونڈ

محنت اور کوشش،

زندگی کی کشتی محو سفر تھی۔ ہر شخص پتوار سنبھالے اپنے تئیں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کنارے تک پہنچا جائے۔

ہر شخص کی کشتی میں سوراخ بن چکے تھے مگر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔

دور ایک کشتی نہایت سبک رفتاری سے اپنا سفر طے کرتی نظر آ رہی تھی۔ ان کے ساتھ اور بھی کشتیاں تھیں۔ ان کی کشتیوں میں بھی سوراخ موجود تھے مگر وہ نہایت محنت و مشقت اور جہد مسلسل کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مسلسل اُن سوراخوں کے آگے ہاتھ جا کر بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی تھوڑا سا پانی دھوکے سے اندر آ بھی جاتا تھا مگر زیادہ تر یہ لوگ پانی کو شکست دینے میں کامیاب ہی رہے تھے۔

ان کشتی والوں کا سفر اگرچہ بڑی مشقت سے پُر تھا مگر بہرحال منزل انہی کو نصیب ہوئی۔ ساحل کا منہ انہوں نے ہی دیکھا۔

جبکہ وہ جو اپنی کشتیوں میں داخل ہونے والے پانی کو نکالنے کی مشقت سے جان چھڑاتے رہے۔ جی چراتے رہے۔ وہ ایسے بدنصیب رہے کہ ان کی کشتیاں ایک کے بعد ایک ڈوبتی رہیں۔ لہریں اُن کی سانسیں اکھیڑتی رہیں۔ انہیں ساحل نصیب نہ ہوا۔

اُم عثمان

اللہ کا احسان،

انسان جب گناہ کرتا ہے، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس پر چار احسان فرماتا ہے۔

1۔ اس کا رزق بند نہیں کرتا۔
2۔ اس کی طاقت سلب نہیں کرتا۔
3۔ اس کے گناہ کو ظاہر نہیں کرتا۔
4۔ اس کو فوراً سزا نہیں دیتا۔

(سبحان اللہ)

ثمینہ اکرم۔ لیاری

نمرہ اقراء کی ڈائری سے

سلیم احمد کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

بھیجتی ہیں جو پیام روشنی، تاروں کے نام
رات میں نے اک غزل لکھی ہے ان آنکھوں کے نام

کل کے اخباروں میں چھپ جائے گی یہ تازہ خبر
کشتیاں، ساحل کا منظر، ڈوبنے والوں کے نام

جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اس کی حیرتیں
میرا بچہ پوچھتا ہے رات کے تاروں کے نام

جانے اس گھر کے مکیں کس دیس پہنچے کیا ہوئے
رہ گئے دیوار پر لکھے ہوئے بچوں کے نام

رنگ و بو کے کتنے مردہ تجربے زندہ ہوئے
یاد آئے دیکھ کر تجھ کو کئی پھولوں کے نام

میں نے دریا میں بہائے جاگتے سوتے دیے
کچھ تری صبحوں کے نام اور کچھ تری شاموں کے نام

ملائکہ کوثر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نثری نظم میری بیٹی کو بے حد پسند ہے۔ اس کا خیال ہے یہ نظم کسی نے میری ماں کے متعلق لکھی ہے جب کہ میرا گمان یہ ہے کہ سب مائیں تقریباً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

عورتیں بہت عجیب ہوتی ہیں

رات بھر پورا سوتی نہیں
نیند کی سیاہی میں انگلی ڈبو کر
حساب لکھتی ہیں، ٹٹولتی رہتی ہیں
بچوں کی چادر، شوہر کا من
ہوا کی طرح گھومتی کبھی گھر کبھی باہر

ٹفن میں روز رکھتی ہیں نئی نظمیں
گملوں میں روز بوتی ہیں امیدیں
سب سے دور ہو کر بھی سب کے قریب ہوتی ہیں
کبھی کوئی خواب پورا نہیں دیکھتیں
بیچ میں ہی چھوڑ کر دیکھنے لگتی ہیں
چولہے پر چڑھا دودھ
ماں کو یاد کر کے رو دینا، ابا کی گڑیا رانی یا دادا جانی
کچھ ان کہی لفظوں کی کہانی، کھویا ہوا ورق ڈھونڈنا
خوشی کی امید پر پوری زندگی بتا دیتی ہیں
سچ میں عورتیں عجیب ہوتی ہیں

کنیز فاطمہ کی ڈائری سے

محسن نقوی کی یہ نظم میرے دل کے بہت قریب ہے۔ سب قاری بہنوں کی نذر۔

ہم سے مت پوچھ راستے گھر کے
ہم مسافر ہیں زندگی بھر کے

کون سورج کی آنکھ سے دن بھر
زخم گنتا ہے شب کی چادر کے

صلح کر لی یہ سوچ کر میں نے
میرے دشمن نہ تھے برابر کے

خود سے خیمے جلا دیے ہیں نے
حوصلے دیکھنا تھے لشکر کے

یہ ستارے یہ ٹوٹے موتی
عکس ہیں میرے دیدہ تر کے

گر جنوں مصلحت نہ اپنا لے
سارے رشتے ہیں پتھر کے

ناہید اسماعیل کی ڈائری سے

عدم کی شاعری میں تغزل اور تاثر آفرینی کے ساتھ ساتھ نازک جذبات اور احساسات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جمالیاتی پہلو نمایاں ہے۔ عبدالحمید عدم کی یہ غزل آپ کی نذر۔

کبھی اتنی زحمت تو فرمایئے گا
اُفق تک سیہ زلف لہرایئے گا

مرا حال اب کچھ توجہ طلب ہے
مرے حال پر غور فرمایئے گا

بڑا سخت ہے راستہ زندگی کا
ذرا آپ بھی دو قدم آیئے گا

یہی آنا جانا تو ہے زندگی میں
کبھی آیئے گا، کبھی جایئے گا

میں اتنا بھی عاری نہیں ہوں سمجھ سے
مجھے اس قدر بھی نہ سمجھایئے گا

نگاہ و خرد اور زعم بصارت
جنابِ عدم ہوش میں آیئے گا

فریحہ شبیر ــــــــــــ شاہ نکڈر

دوست ہوتے جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر جب اتنے پیارے ہیں
ان کی جانب بھی اک نظر ناصح
جو ترے مشوروں کے مارے ہیں

فائزہ بھٹی ــــــــــــ چونکی

کئی اور اہل طلب ملے مجھے راہ شوق میں ہم قدم
جنہیں کر رہا تھا تلاش میں وہی لوگ مجھ کو ملے نہیں

اقرا صادق ــــــــــــ بہاولپور

سمجھے تھے دوسروں سے بہت مختلف تجھے
کیا مان لیں کہ تو بھی ہمارا نہیں رہا

فردوس رانی ــــــــــــ ملتان

عشق مجبور و نامراد سہی
پھر کبھی ظالم کا بول بالا ہے
موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے

سائرہ ناز ــــــــــــ تربیلا ڈیم

خود سے ملنے کو عمر بھر ترسے
یوں تو ملنے کو ہم سب ہی سے ملے
زندگی کے سلوک کیا کہیے
جس کو مرنا ہو زندگی سے ملے

جے آئی اے ــــــــــــ ڈیرہ غازی خان

اُف نہ کی ہم نے جان جانے تک
صبر کی کوئی انتہا بھی ہے
جیسا اندھیرا ہو رہا ہے آج
کبھی دیکھا بھی ہے، سُنا بھی ہے

مدیحہ نورین مہک ــــــــــــ گجرات

بھٹک کے اس طرف آتا ہے، لوٹ جاتا ہے
رہِ عدم کے مسافر کی بھول ہے دُنیا

بتول ساجد ــــــــــــ گھوٹکی

غم و درد و رنج الم دیکھتے ہیں
محبت دکھاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں
کہاں تیرے جلوے، کہاں اپنی نظریں
غنیمت ہے، جو کوئی دم دیکھتے ہیں

مہوش ملک ــــــــــــ گاؤں ہڈالی

سب انداز حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں
اُن کی راتوں کا انتقام نہ پوچھ
جس نے ہنس ہنس کے دن گزارے ہیں

شازیہ گلزار ــــــــــــ بھکر

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے
مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

خزیمہ ریاض ــــــــــــ گاؤں سدوکی

الٰہی ترک محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں انہیں، وہ یاد آتے جاتے ہیں

سیدہ ثوبیہ سجاد ــــــــــــ کہروڑ پکا

سناٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے
ہستی امجد دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

رابعہ بصری ــــــــــــ کراچی

کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں

مسرت الطاف احمد.....کراچی

''دشتِ جنوں'' کی یہ قسط کچھ دل کو نہ بھائی، منفرا اور معاویہ کی گیدرنگ کو بہت مس کیا۔''حالم'' یہ تحریر تو بہت ہی مشکل ہو گئی ہے، بہت ہی یکسوئی سے پڑھنا پڑتا ہے اب تو بور بھی کرنے لگا ہے۔''اقرار کا موسم'' اسٹوری قابل تعریف تھی، حسن اور زوبیہ کے ساتھ اس ٹھنڈے موسم کو میں نے بھی گھر بیٹھ کر خوب انجوائے کیا۔''سرخ گلابوں کا موسم'' نایاب جیلانی کا نام دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔اسٹوری کافی دم دار تھی، ٹاپک کافی اسٹرانگ تھا۔''قسمت سے فرار'' زبردست تحریر تھی۔تھیم سپرہٹ تھا۔''پھلاں رانی'' ففٹی ففٹی رہا، تحریر پسند آئی لیکن کچھ ویک پوائنٹس تھے۔افسانوں میں ''لفظ جڑنے لگتے ہیں'' اے ون تحریر تھی۔''سوداگر'' نمبر ٹو رہا، بہت ہی دلچسپ اسٹوری تھی، مزا آ گیا۔''مٹھی میں جگنو'' فری کی سستی، بے دھیانی ایک طرف لیکن سمیر تو بس موقع کی تلاش میں تھا۔مرد کے تو خون میں ہی بے وفائی ہے۔''باذوق'' کچھ خاص نہیں تھا۔نبیلہ ابر راجہ سے ملاقات بہت اچھی رہی، ان کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔

ج: ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط اور دوسری کوئی تحریر بھی شائع نہ ہو سکی۔یہ محض اتفاق ہے۔آپ کا خط ہم نے منتخب کیا تھا، لیکن صفحات کی کمی کے باعث شاملِ اشاعت نہ ہو سکا۔خواتین پر تبصرہ حسبِ معمول، حسبِ روایت جان دار ہے، بہت اچھا لگا۔

ثناء ذوالفقار.....نورے والی، رحیم یار خان

نبیلہ ابر راجہ کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔دوسری رائٹرز کا بھی انٹرویو لیں، خاص طور پر ''ماہِ تمام'' کی رائٹر آمنہ ریاض کا انٹرویو ضرور لیں۔''دشت جنوں'' میں کہانی بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے، بس جلدی سے آیو شمتی کا راز کھل جائے۔قانتہ رابعہ تو اتنا اچھا لکھتی ہیں لیکن ''لفظ جڑنے لگتے ہیں'' میں بالکل مزا نہیں آیا۔''سوداگر'' میں سمیرا حمید نے ہمیشہ کی طرح خوب صورت جملے لکھے۔سمیرا حمید سے کوئی مکمل ناول لکھوائیں۔''مٹھی میں جگنو'' اور ''باذوق'' بھی اچھے افسانے تھے۔

نادیہ کی خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

کڑوی چیز ہے مگر دھوپ سے بچنے کے لیے
نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگا لیتے ہیں لوگ

فروری میں شائع ہونے والا حیا بخاری کا افسانہ ''نیم کا پیڑ'' بہترین افسانوں میں سے ایک تھا، جس طرح انہوں نے پیغام پہنچایا، مجھے بہت پسند آیا۔''قسمت سے فرار'' میمونہ صدف نے بہت اچھا لکھا۔''ست پھلاں رانی'' ساری کہانی شروع میں ہی سمجھ میں آ گئی تھی۔''سرخ گلابوں کا موسم'' انزلہ کچھ زیادہ ہی مغرور تھی لیکن زعیم نے بھی سارے کس بل نکال دیے۔''حالم'' میں کہانی جب سے پرانے دور میں گئی ہے اور بھی انٹرسٹنگ ہو گئی ہے۔

ج: پیاری ثنا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید، سمیرا حمید نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مئی کے شمارے کے لیے مکمل ناول لکھیں گی۔آیو شمتی کا راز کھلنے ہی والا ہے، بس چند

اقساط اور ہیں۔

ساجدہ طارق......کراچی

خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ زندگی کے بہت سے سال گزر گئے مگر یہ پیار کبھی ختم نہیں ہوا۔ خواتین کا اور میرا تیس سال کا ساتھ ہے، جوانی کی سیڑھی پر جب قدم رکھا تو

خواتین ڈائجسٹ کو اپنے ہم قدم پایا، اب یہ ناتا مرتے وقت ہی ختم ہوگا۔ ''گھنی سٹی'' سے آگے بڑھے، کرن کرن روشنی سے فیض یاب ہوئے۔ نبیلہ ابر راجہ کا انٹرویو ٹھیک تھا۔ ''دشت جنوں'' اور ''حالم'' پڑھ کر یوں لگتا ہے دونوں میں کچھ یکساں ہے، کچھ سسپنس، کچھ نیا پڑھنے کو ملتا ہے۔ دشت جنوں اچھا جارہا ہے۔ سمیرا حمید کے ''سوداگر'' نے متاثر کیا، مختصر مگر اثر انداز ہوتی تحریر سمیرا حمید کا قلم ہمیشہ جادو بکھیرتا ہے۔ ایمل رضا نے پہاڑوں کی سیر کرادی۔ محبت اور نفرت کے مشترکہ جذبوں پر مبنی اقرار کا موسم، دل کا موسم بھی بدل گیا۔ قرۃ العین سکندر سے متفق ہوں، عورت کو گھر داری کا فن آنا چاہیے۔ صرف اچھی شکل سے کچھ نہیں ہوتا۔ میمونہ صدف کا ''قسمت سے فرار'' بہت اچھی تحریر تھی، قانتہ رابعہ کی سب سے مختصر اور پیاری تحریر دل کو چھوگئی۔ نایاب جیلانی کی کہانی کچھ خاص نہیں لگی اور نفیسہ سعید بھی متاثر نہ کرسکیں۔ اب آتے ہیں ''حالم'' پر جو پورے رسالے کی جان ہے، نمرہ احمد کو اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر بہت مبارک۔ نمل کے بعد ایک اور پیاری تحریر۔ ہمیشہ کی طرح یہ ناول بھی سپرہٹ ہوگا۔ جگر مراد آبادی اور نیر رضا کی غزلیں پسند آئیں۔ موسم کے پکوان میں اب کے سب تراکیب اچھی تھیں

ج: پیاری ساجدہ! ہماری دعا ہے کہ ہمارا آپ کا ساتھ ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔

ناہید اسماعیل......کراچی

سب سے پہلے تو بہت معذرت کہ آپ کو شاید امامہ راشد کے خط پر ہمارا تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ خط کے جواب میں اگر ہمیں ڈانٹ بھی دیں گی تو ہم خوش ہوجائیں گے کہ آپ نے ہمیں اپنا سمجھ کر سمجھایا۔ نفسیاتی الجھنیں میں زینب بھلوال کا مسئلہ پڑھ کر یقین کیجیے، دماغ ماؤف ہوگیا۔ بے حد دکھ اور پریشانی ہوئی، بے ساختہ دل میں آیا

کہ انہیں اپنے گھر میں رکھ لیں، اگر ایسا ہوسکتا ہے تو پلیز آپ ہمیں بتائیے کہ کس طرح؟ ان شاء اللہ ہمارے ہاں ان کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ اپنی تعلیم بھی مکمل کرسکیں گی۔ سرورق پر بالوں میں موتی سجائے ماڈل اچھی لگی۔ ''کرن کرن روشنی'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اردگرد ایک الگ ہی پاکیزہ فضا محسوس ہوتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''حالم'' پڑھا بہت زبردست جناب، ہر قسط پچھلی سے بڑھ کر۔ افسانوں میں ''سوداگر'' سچی اور خالص محبت کی کہانی۔ ایک الگ خاص ماحول میں لکھی گئی بہت اچھی لگی، سمیرا حمید کے وہی دل کو چھوجانے والے جملے، جیسے ایک وہ تھی جو عام چیزوں کے چرائے جانے پر رو رہی تھی تو دوسرا اکلوتی قیمتی چیز کے گم ہونے پر خوش ہو رہا تھا۔ زندگی بھر جینے کے لیے، سانس کے ساتھ سانس لینے کے لیے ایک نظر اس نے سنبھال کر رکھی تھی۔ ایمل رضا نے بہترین لکھا، نرگس کے حسد نے زینب کو مصائب کا شکار تو ضرور کیا لیکن ضمیر کی خلش سے آزاد رکھا۔ یہی اصل کامیابی ہے اور پھر اس کے صبر نے زوبیہ کی زندگی بھی سنواردی۔ ادھر زوبیہ نے جو بدلے لیے اس پر مزا بھی آیا۔ میمونہ صدف نے بہت زبردست لکھا، دکھ کے ایک عجب سے حصار میں لپٹی ہوئی ان کی تحریر دل کو چھوگئی۔ نبیلہ ابر راجا کا انٹرویو بہت ہی اچھا لگا۔ شاہانہ بلوچ کا خط دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔

ج: پیاری ناہید! ایسا ہرگز نہیں کہ ہمیں آپ کی تنقید ناگوار گزری، اس لیے آپ کا خط شامل نہیں کیا۔ آپ کا خط صفحات کی کمی کے باعث شامل نہ ہوسکا۔ تنقید ہمیں اپنی غلطیاں سدھارنے کا موقع فراہم کرتی ہے تعریف ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہمارے لیے تعریف و تنقید یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قائین میں ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہماری بہت سی قارئین نے ہمیں زینب کے لیے خط لکھے۔ زینب کے لیے محفوظ رہائش کا انتظام ہوگیا ہے۔

نائلہ، عائشہ، طیبہ نور......ہڈالی (خوشاب)

سب سے پہلے تعارف......ہم ہیں (صرف میں

نہیں) ہڈالی کی پرنسز اور اپنے خواتین وشعاع کی بہت بڑی مداح۔ ہمارا ضلع خوشاب ہے، جہاں کا ڈھوڈا بہت مشہور ہے اور ہڈالی کی مشہور چیز چراغ بالی ہے۔ ہم تینوں ایجوکیشنل یونیورسٹی جوہر آباد کیمپس سے بی ایس سی کیمسٹری کررہے ہیں۔ میں نے (طیبہ) بہت چھوٹی عمر سے ہی رسالے پڑھنے شروع کردیے تھے۔ امی کے ڈائجسٹ ماموں سے چھپ چھپ کر پڑھتی تھی۔ سب سے زیادہ جنون ڈائجسٹ پڑھنے کا مجھے ہی ہے۔ یہ عائشہ تو بس نمرہ احمد جی کی فین ہے، وہ تو خیر ہم سب ہی ہیں۔ "نمل" اور پھر "حالم" نے تو ہمیں اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ نائلہ کی موسٹ فیورٹ تنزیلہ ریاض ہے، باقی رہ گئی میں تو مجھے تو اپنی سب رائٹرز بہت پسند ہیں۔ سائرہ رضا، سمیرا احمید، فرزانہ کھرل، ایمل رضا، نایاب جیلانی سب ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ صرف رائٹرز ہی نہیں اپنی قارئین بھی بہت عزیز ہیں۔ ثمینہ اکرم ہو یا پھر مسرت الطاف احمد، کوثر آنٹی سب کے ساتھ دل کا رشتہ محسوس ہوتا ہے۔ خواتین ہماری اور باقی سب لڑکیوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کررہا ہے، ہم لوگوں کو بہت حیرت ہوتی ہے کہ آج کل کے ماں باپ ٹی وی ڈراموں سے تو بچوں کو منع نہیں کرتے اور یہ ڈائجسٹ اچھی چیز سکھا رہے ہیں، وہ پڑھنے نہیں دیتے۔

ج: ہڈالی کی شہزادیو! ڈھوڈا اور چراغ بالی کا نام ہم نے پہلی بار سنا ہے۔ کیا یہ مٹھائی کی کوئی قسم ہے، آئندہ خط لکھیں تو ہمیں اس کے بارے میں ضرور بتائیں یہ کس چیز سے بنتی ہے۔ شہزادیاں گاؤں میں رہنے کے باوجود سائنس کی تعلیم حاصل کررہی ہیں، یہ جان کر دلی خوشی ہوئی ہے۔

بنت مریم...... دنیاپور

مجھے ایسا لگتا ہے "ہمارے نام" کے جوابات لکھتے ہوئے آپ گریپ فروٹ کھا کے بیٹھتی ہیں کیونکہ سارے جوابات کبھی کھٹے، کبھی میٹھے، کبھی کڑوے اور...... کبھی پھیکے ہوتے ہیں لیکن جوابات پڑھ کے اچار جیسا مزہ آجاتا ہے۔ اس دفعہ تو "دشت جنوں" نے مکمل اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ حسن المآب کے تو کیا کہنے زبردست بھئی، باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ پڑھ کے سکون مل جاتا ہے لیکن فرزانہ کھرل کی "تھم گیا شور جنوں" زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی کہانی ـــ ہفتے میں مکمل کی ہو ایسے لگ رہا تھا کوئی الجبرے کا سوال ہو، جو حل ہونے میں نہیں آرہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی تشریف لائیں، آپ کو اکیس کھانوں کی سلامی دیں گے۔

ج: مریم! خطوں کے جواب دینے کے لیے گریپ فروٹ تو نہیں لیکن پانی پی کر ضرور بیٹھتے ہیں کیونکہ ہر طرح کی لکھائی میں لکھے ہوئے ڈھیر سارے خط اور محدود صفحات...... سمجھ میں نہیں آتا کس کو شامل کریں، کس کو چھوڑ دیں۔ پھر کچھ خط اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ ان کو ایڈٹ کرتے ہوئے ہمارا اپنا دل بھی دکھتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو آپ کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں گے، اکیس کھانوں کی سلامی کا سن کر دل تو چاہ رہا ہے کہ ابھی دنیاپور پہنچ جائیں۔

نوشابہ زینب...... گاؤں باشنہ ضلع گجرات

بہت دنوں سے "نمل" "آب حیات" کی اینڈنگ اور "حالم" کی شروعات پر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ "نمل" کا اینڈ بہت اچھا ہوا اور "آب حیات" بھی لازوال تحریر تھی۔ "حالم" توقع کے عین مطابق بہت پسند آیا۔ اللہ نے ہمارے ملک کو اتنی اچھی رائٹر دی۔ نمرہ احمد کے ساتھ اب میری ایک اور رائٹر بھی پسندیدہ ہوگئی ہے اور وہ ہیں "چھپا کے چھٹی" پیار کا دوسرا شہر، کوئی عشق وقت غروب سا اور "کہاں کا ذکر سفر" والی فرزانہ کھرل۔ آپ کا انداز تحریر زبردست۔ "کرن کرن روشنی" سے لے کر نفسیاتی و ازدواجی الجھنوں تک سارا رسالہ ہی زبردست ہوتا ہے۔ خاص طور پر نفسیاتی الجھنیں، میں کہتی ہوں اگر خواتین نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ پڑھنے کی لگن اس نے پیدا کی اسی لیے بی اے کررہی ہوں، پرائیوٹ اور ایک اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ کبھی پنجاب آئیں چولہے پر پراٹھے بنا کر کھلاؤں اور سارے گاؤں کی سیر کراؤں۔

ج: پیاری نوشابہ! پڑھائی سے آپ کی لگن قابل تعریف ہے، آپ نے خواتین ڈائجسٹ سے سیکھا، آپ کی زندگی میں اس سے تبدیلی آئی۔ یوں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ آپ کے گاؤں کے جگنو اور آپ کے ہاتھ کے پراٹھے دونوں ہی ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں، دیکھیں کب موقع ملتا ہے آپ کے گاؤں کی سیر کا۔

لائبہ اعوان......لاہور

''سوداگر'' اچھی تحریر تھی۔ سمیرا حمید نے ثابت کر دیا کہ وہ لفظوں کی سوداگر ہیں، قانتہ رابعہ نے بھی اچھا لکھا۔ زبان کے کڑوے لوگوں کے دل سے کوئی کو ہر تلاش کر لینا اتنا آسان نہیں مگر وقت کچھ راز خود ہی فاش کر دیتا ہے۔

''اقرار کا موسم'' میں ایمل نے ہمیشہ کی طرح مثبت پیغام دیا۔ ''باذوق'' واعظہ زیدی کی اچھی کاوش تھی' مستقل سلسلے بھی سب زبردست ہیں۔

ج: لائبہ! آپ نے ہمارے دو سال پہلے لکھے ہوئے جملوں کو یاد رکھا اور افسانے لکھے' اس قدر افزائی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ریحانہ چوہدری......مدوکے (اندھیر)

جوں ہی پرچہ ہاتھ میں آتا ہے دل کرتا ہے کہ ایک دو دن میں ختم کر کے فوراً جواب لکھنے بیٹھ جاؤں مگر ایک تو جاب بہت ٹف ہوگئی ہے دوسرے گھریلو مصروفیات۔ آج ڈھلتی رات کے کچھ لمحوں کو اسیر کر کے، اپنی سوچوں کو تحریر کر رہی ہوں کہ میرا بھی میری ذات پر کچھ تو حق ہے آخر۔ باتیں تو اتنی ہیں جو صرف آپ سے کرنے کو دل چاہتا ہے۔

سرورق انتہائی دیدہ زیب، ماڈل بہت پیاری لگی۔ پچھلی رات کے سناٹے میں انشاء جی کو پڑھ کے دیکھا۔ ارے آنٹی دیکھیں آپ کا شعر بھی آیا ہے اور ڈائری کا ورق بھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ مجھے بھولی نہیں۔ میں تو وقت سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں کشید کر کے خوش ہونے والوں سے ہوں۔ اپنے کچن گارڈن میں نئے بیج بوتی ہوں تو روزانہ جا کے دیکھتی ہوں، کوئی اُگا یا نہیں۔ نمرہ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ایمل رضا کا ''اقرار کا موسم'' ہو یا نایاب جیلانی کے سرخ گلابوں کا دونوں موسم لاجواب۔ نبیلہ ابر راجا کا انٹرویو پسند آیا، سمیرا حمید کی سوداگری بہت بھائی۔ واعظہ زیدی کو ''باذوق'' لکھنے پر مبارک باد۔

ج: پیاری ریحانہ! انسان پر سب سے زیادہ حق اپنی ذات کا ہی ہوتا ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات کو دوسروں کے لیے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ انہیں زندگی میں عزت بھی ملتی ہے اور محبت بھی...... یہ ضرور ہے کہ کبھی دیر ہو جائے لیکن ملتی ضرور ہے۔ دل کی باتیں ان ہی سے کرنے کو جی چاہتا ہے جو دل کے قریب ہوتے ہیں۔ ہماری قارئین ہمارے دل سے قریب ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

شازیہ ستار......ڈی جی خان

آپ کو جلدی خط و تبصرہ بھیجنے کے چکر میں دو دن میں ہی رسالہ چٹ کر جاتے ہیں۔ پھر اس دفعہ چھوٹی بہن کا سی سیکشن یعنی بڑے آپریشن سے بے بی ہوا۔ ہسپتال میں اس کے ساتھ کچھ دن رہی، کہانی نہ دیکھ کر افسوس ہوا، مگر آپ کے جواب نے ہمیں مایوس ہونے سے بچا کر امید کی نئی کرن دکھا دی۔

سب سے پہلے تو ہمارا فیورٹ ترین ناول ''حالم'' واہ نمرہ جی واہ! ایسی منظر نگاری کرتی ہیں کہ اس منظر میں انسان خود کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ نبیلہ ابر راجا سے ملاقات اچھی تھی اور نایاب جیلانی کا مکمل ناول ''سرخ گلابوں پر شبنم'' بازی لے گیا، بھئی دل کو چھو گیا۔ ''لفظ جڑنے لگتے ہیں'' میں باپ کے سچے انمول رشتے کی خوب عکاسی کی گئی۔ ''اقرار کا موسم'' میں ایمل رضا نے وادیوں اور پہاڑوں کی خوب سیر کرائی ''باذوق'' میں بے چاری نسیم آرا مجھے اپنی طرح لگی۔ ویسے آپس کی بات ہے نسیم آرا کے شوہر کا نام ذوالفقار تھا، اتفاق کی بات میرے شوہر کے نام بھی ذوالفقار ہے۔ کچھ مزاج بھی ان کا ہے (ہے نا مزے کی بات)۔ ''دشت جنوں'' دلچسپ ہوتا جا رہا ہے [illegible] ''مٹھی میں جگنو'' بہت سبق دے گیا کہ میاں بیوی کا رشتہ کیسے نبھانا ہوتا ہے، بھائی عدنان بھائی کے مشورے زبردست ہوتے ہیں۔

www.urdusoftbooks.com

ج: پیاری شازیہ! خالہ بننے کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہماری قارئین کی خواتین ڈائجسٹ سے وابستگی کتنی گہری ہے اور یقین جانیں کہ ہم اس لگاؤ، اس وابستگی کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ واعظہ زیدی کی کہانی کی آپ سے مماثلت بہت دلچسپ ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

رمشاء شہزادی، مہناز رانی...... مانانوالہ، ضلع شیخوپورہ

السلام علیکم! عدنان کے مشورے پڑھے ہر دفعہ کی طرح حیران کن خط اور تفصیلی جوابات۔ بہت شکریہ۔ "کرن کرن روشنی" سے دل کو منور کیا، افسانے سب ہی اچھے تھے۔ "سوداگر" اس دفعہ سرفہرست رہا۔ "قسمت سے فرار" بالکل حقیقی کہانی لگی، "سرخ گلابوں پر شبنم" زعیم کا عورتوں کی طرح کام کرنا حیران کر گیا۔ آرمی کا تو اب نام سن کے ہی رونا آتا ہے، آرمی میں جانے کا بے حد شوق ہے۔ "اقرار کا موسم" ایمل رضا جی پلیز آپ سے التجا ہے، ایسی برف باری والی کہانی جون جولائی میں بھی لکھ دیا کریں۔ سچ میں یہ ناول پڑھتے ہوئے حسن اور ماہا کے ساتھ ہمارے بھی دانت بجنے لگ گئے، نمرہ جی کتنی دیر کتنی دیر تک ہمیں دوسری دنیا میں گھمانا ہے۔ "دشت جنوں" آمنہ جی کیوں ہمارے صبر کا امتحان لے رہی ہیں۔

ج: پیاری رمشاء! بہت سارے لوگ آرمی میں جانے کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ ہر خواب کو تعبیر ملے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں آرمی کو بہت سی مراعات حاصل ہیں۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ بہت سی سہولت بھی ملتی ہیں لیکن کوئی چیز حاصل نہ ہو تو اس پر رونے کے بجائے جو کچھ حاصل ہے اس پر اللہ کا شکر کریں۔ محنتی اور کام کرنے والے لوگ ہر جگہ خود کو منوا لیتے ہیں اور محنت کر کے جو حاصل ہوتا ہے اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

طاہرہ یاسمین...... ٹیکسلا کینٹ

"کرن کرن روشنی" مشعل راہ ہے۔ ایمل رضا کا "اقرار کا موسم" پڑھا زبردست، گھر بیٹھے ہی ہمالیہ کے موسم کو محسوس کر لیا۔ ایک بات خصوصی طور پر کہنا چاہتی ہوں کہ کچھ لوگ بچیوں پر پابندی لگاتے ہیں کہ رسالہ نہ پڑھیں۔ میں چودہ سال کی تھی تو میری امی کی ڈیتھ ہوگئی تھی، اس وقت سے خواتین اور شعاع میرے ساتھی رہے ہیں۔ میرے لیے تو خواتین ہمیشہ کڑی دھوپ میں سایہ دار شجر رہا اور میں نے ہمیشہ بہت کچھ سیکھا۔

ج: پیاری طاہرہ! آپ کا پیغام والدین تک پہنچا رہے ہیں، کچی عمر میں بچیوں کے کو جلد بہک جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے والدین بچیوں پر سختی کرتے ہیں لیکن سختی کے اکثر غلط نتائج بھی نکلتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں تحریر میں انتخاب کرتے ہوئے ہم نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایسی تحریریں شائع نہ ہوں جن کے غلط اثرات مرتب ہوں۔

ماریہ خاتون، حمنہ خاتون...... بہاولنگر

سب سے پہلے باتیں کرتے ہیں ہمارے موسٹ فیورٹ ناول "حسن المآب" کی جو کہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔ واہ سائرہ رضا! تمام کرداروں کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ اب باری آتی ہے "حالم" کی، حیرت انگیز۔ لیکن ہے بہت دلچسپ۔ اب باری ہے "دشت جنوں" کی، جس میں جنون ختم ہو چکا ہے۔ ہماری آپ سے ایک گزارش ہے مبلغ اسلام جناب جنید جمشید شہید کی اہلیہ محترمہ کا تفصیلی انٹرویو ہونا چاہیے۔

ج: دشت جنوں اب اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے، چند ہی اقساط باقی ہیں۔ جنید جمشید کی اہلیہ نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

انیقہ امیر علی سے ملاقات

شاہین رشید

اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں شہرت سے زیادہ اپنے کام سے پیار ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو ان کی فیلڈ کے لوگ تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن ہم اور آپ جنھیں شہرت متاثر کرتی ہے ایسے لوگوں سے ناواقف ہی رہتے ہیں۔ انیقہ امیر ایسی ہی ایک باصلاحیت انسان ہیں جن کے کریڈٹ پہ بہت سارے کام ہیں...... گزشتہ دنوں ہماری ان سے بات ہوئی تو ہمیں اندازہ ہوا کہ انہیں اپنے کام سے کتنا پیار ہے اور یہ اپنے کام پہ کتنا فوکس رہتی ہیں۔

"کیا حال ہے انیقہ صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں، اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

"جی...... میرا تعلق سرگودھا سے ہے اور میں 16 اپریل 1978ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئی...... لیکن میری پرورش، میری تربیت لاہور میں ہوئی...... سینٹ میری اسکول سے آٹھویں کلاس تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کسٹم پبلک اسکول گلبرگ لاہور سے سائنس میں کیا...... لاہور کالج سے بی اے آنرز کیا انگلش لٹریچر میں اور پھر میری شادی ہو گئی...... اور شادی کے بعد پرائیویٹ ایم اے انگریزی کیا۔ ساتھ میں ہومیو پیتھک کورس کیا جو کہ چار سال پہ محیط تھا۔ کلینک میں کر سکتی تھی، سرٹیفکیٹ بھی ہے میرے پاس گورنمنٹ کا، لیکن میرا رجحان نہیں تھا اس جانب۔

میرے والد صاحب ڈاکٹر تھے اور والدہ ہاؤس وائف اور ہاں اپنے بارے میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میں بیوٹیشن بھی ہوں اور اپنا بوتیک بھی کافی عرصہ چلایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں رائٹر ہوں اور اسکول کے زمانے سے لکھ رہی ہوں۔"

"بہن بھائی آپ کے اور مادری زبان کیا ہے؟"

"پنجابی فیملی سے تعلق ہے تو مادری زبان بھی پنجابی ہے لیکن گھر میں چونکہ بچوں کی تربیت کی خاطر اردو زبان میں بات کی جاتی تھی تو اس زبان پہ عبور حاصل ہوا، البتہ امی کے ساتھ پنجابی زبان میں بات کرتے تھے تو آہستہ آہستہ پنجابی زبان میں بھی کافی حد تک عبور حاصل ہو گیا...... ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔"

"لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے اور شادی کے بعد اس شوق کو جاری رکھا یا چھوڑ دیا؟"

"لکھنے کا عمل تو بچپن سے ہی جاری ہے، کیونکہ مجھے، بچپن سے ہی لکھنے کا شوق تھا اور ابتدا سے ہی میری تحریروں کو پسند کیا جاتا تھا تو حوصلہ بڑھتا گیا اور میں لکھتی رہی...... اور مجھے تقریباً پچیس، تیس سال ہو گئے ہیں لکھتے ہوئے...... اور شادی کے بعد بھی اس شوق کو جاری رکھا...... میری شادی کو تقریباً بیس

سال ہو گئے ہیں۔ 1997ء میں میری شادی ہوئی ......اور میری شادی ایک میوزیکل فیملی میں ہوئی۔

میرے شوہر "امیر علی ناشاد، ناشاد صاحب کے بیٹے ہیں، ناشاد صاحب،، جو برصغیر پاک و ہند کے بڑے میوزک ڈائریکٹر ہیں، ان کے کریڈٹ پہ بہترین گانے ہیں جو انڈیا' پاکستان میں بہت مشہور ہیں، مثلاً انڈیا میں جو گانے انہوں نے ڈائریکٹ کیے ان میں......

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔
تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی۔

اور پاکستان میں......

زندگی میں تو سب ہی پیار کیا کرتے ہیں۔
رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے۔

تو کافی بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں فلمیں بھی ہیں اور سونگ بھی ہیں اور سارے ہی "ہٹ سونگز" ہیں، جب میں بیاہ کر اس فیملی میں آئی تو میرے شوہر گلوکاری کرتے تھے......تو دیگر شاعروں کو تو وہ گاتے ہی تھے، میں نے بھی ان کے لیے گانے لکھنے شروع کر دیے۔ وہ مشہور ہوئے تو دیگر لوگوں نے بھی رابطہ کیا تو پھر ان کے لیے بھی میں نے گانے لکھے......

امریکہ اور انگلینڈ کے بینڈز کے لیے میں نے کافی گانے لکھے اور بہت کام کیا ان کے لیے اور ابھی

تک لکھ رہی ہوں۔ اور اب میں نے اسکرپٹ رائٹنگ بھی شروع کر دی ہے اور میرے کئی پروجیکٹس انڈر پروسیس ہیں، فلموں کے لیے لکھ رہی ہوں اور وہ بھی انڈر پروسس ہیں، بہت کام کیا مگر وہ پہچان نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی، شاید اس کے لیے ہم نے خود ہی کوشش نہیں کی۔ مگر اب میں چاہتی ہوں کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انیقہ امیر علی نام کی بھی کوئی رائٹر ہے۔"

"آپ کا اپنا اسٹوڈیو ہے...... تو اس کے بارے میں بھی بتایئے؟"

"جی...... ہمارا اپنا "آڈیو اسٹوڈیو" ہے اور وہاں رائٹنگ کے حوالے سے جتنے بھی کام ہوتے ہیں۔ وہ بھی میں کرتی ہوں۔ امیر علی ناشاد پاکستان فلم انڈسٹری کا بہت بڑا نام ہے۔ ان کا گایا ہوا سونگ "کراں میں نظارہ اوہدی تصویر دا" بہت مشہور ہوا، یہ پنجابی فلم چوڑیاں کا گانا ہے۔ اس کے علاوہ چار سو سے پانچ سو کے قریب انہوں نے گانے گائے فلموں کے لیے۔"

"ماشاء اللہ آپ آٹھ بہن بھائی ہیں تو کوئی اور بھی اس فیلڈ میں ہے؟"

"ہماری فیملی میں کسی کو رغبت نہیں رہی اس فیلڈ سے، نہ شاعری سے نہ کچھ لکھنے سے، میں ہی ہوں سب سے مختلف......اور میں چونکہ میں گھر میں سب سے چھوٹی بھی تھی اور لاڈلی بھی تھی تو میں جو کچھ بھی کرتی تھی، کوئی مجھے کچھ کہتا نہیں تھا......تو مجھے یاد ہے کہ جب میں چھ یا سات سال کی تھی تو میری کسی شرارت پہ میری امی نے پہلی بار مجھے ڈانٹا اور اتنا ڈانٹا کہ میں نے دل پہ لے لیا اور وہ وقت وہ تھا جب پہلی بار میں نے شاعری شروع کی اور ایک شعر لکھا اور امی کے ڈانٹنے پر لکھا کہ......

دکھ ہے جو دل میں وہ آج کام آ جائے گا
مریں گے جب ہم دشمن کو آرام آ جائے گا

اور مجھے یاد ہے کہ جب یہ شعر میں نے سنایا اپنی امی کو تو مزید ڈانٹ پڑی کہ میں دشمن ہوں تمہاری کیا؟"

"ایک عرصے سے لکھ رہی ہیں تو لکھنے کا رجحان کیسے ہوا اور کس چیز پہ آپ فوکس رہیں کہ یہ لکھنا ہے؟"

"مجھے جیسے جیسے شعور آتا رہا میرے دل و دماغ میں یہ بات کلیئر ہونے لگی کہ الفاظ سب سے اچھے دوست ہو سکتے ہیں انسان کے اور آپ ان کے ساتھ ایک اچھا رشتہ جوڑ سکتے ہیں۔ اس سوچ کو لے کر میں نے لکھنا شروع کر دیا...... اور جب کالج میں آئی تو کالج کے میگزین کے لیے مکالمے لکھے اور شعر و شاعری بھی شروع کر دی جو کہ میگزین میں شائع ہوتے تھے اور شاعری چونکہ خداداد ہوتی ہے تو مجھے لگا کہ خدا نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے اور جب میری شاعری شائع ہونے لگی تو حوصلہ پیدا ہوا اور جب کوئی اچھا شعر، نظم غزل "وارد" ہوتی تھی تو لکھ لیتی تھی۔"

"گانے لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"

"آپ کو بتاؤں کہ امیر علی سے میری لو+ ارینج میرج ہے اور کس طرح ان سے ملاقات ہوئی اور کس طرح سونگ لکھنے کا خیال آیا...... تو میرے ایک بھائی کو گلوکاری کا شوق تھا اور مجھے گٹار سیکھنے کا شوق تھا (میرے اس بھائی کا 2015ء میں انتقال ہو گیا) تو اپنے شوق کی ٹریننگ لینے کے لیے ہم نے امیر علی کے بڑے بھائی سے رابطہ کیا اور وہاں پہلی بار امیر علی سے ملاقات ہوئی اور پھر وقتاً فوقتاً ہماری ملاقات ہوتی رہی۔

پھر جب امیر علی صاحب کو پتا چلا کہ میں شاعری کرتی ہوں تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے لیے گانے لکھیں اور پھر ان کے ساتھ ہی سونگ پر کام کرنا شروع کر دیا...... اس زمانے میں "ایم اشرف" میوزک ڈائریکٹر کا بڑا نام تھا، ان کے ایک البم کے لیے میں نے ریپ لکھا۔ ان کے کچھ بینڈز تھے ان کے لیے بھی گانے لکھے۔"

"آپ نے اتنا کچھ لکھا، کتابی شکل دی آپ نے اپنی کاوش کو؟"

"اگر ابھی تک کتابی شکل میں کچھ نہیں آیا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میری پہلی ترجیح میری فیملی تھی اور میرے بچے تھے۔ اگر شہرت حاصل کرنے میں لگ جاتی تو پھر شاید اپنے بچوں کو زیادہ ٹائم نہ دے پاتی...... تو شاعری چلتی رہی۔ کام بھی چلتا رہا، مگر کتابی شکل دینے کے لیے ٹائم نہیں ملا۔ وہ سارا وقت بچوں کو دیا۔"

"کتنے بچے ہیں آپ کے اور کیا کیا پڑھ رہے ہیں؟"

"جی میرے الحمد للہ تین بچے ہیں، بڑی بیٹی اے لیول میں ہے اس کے پیپرز ہو چکے ہیں اور اسے ڈاکٹر بننے کا شوق ہے۔ چھوٹی بیٹی اے لیول کر رہی ہے، اس کو پینٹنگ کا شوق ہے اور بیٹا 'او لیول' کر رہا ہے اور میں آپ کو ایک بات یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ میرے ایک بڑے بھائی کا انتقال 2015ء میں ہوا اور بھائی کے انتقال کے دو ماہ بعد ان کی بیوی یعنی میری بھابھی کا بھی انتقال ہو گیا۔

اس وقت ان کی دو بیٹیاں تھیں، ایک چھ سال کی اور دوسری نو سال کی، ان کی دونوں بیٹیوں کی پرورش کی ذمہ داری میں نے اٹھائی اور وہ بیٹیاں میرے ساتھ رہتی ہیں اور اس لحاظ سے الحمد للہ میری چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ تو بھائی کی ایک بیٹی ساتویں میں ہے اور دوسری چوتھی میں ہے۔"

"آپ بتا رہی تھیں کہ آپ نے اسکرپٹ بھی لکھے ہیں، ان کے بارے میں بھی بتائیں؟"

"ایک فلم کی اسٹوری لکھی ہے "شاہ رخ کی ٹیکسی" کے نام سے، مزاحیہ فلم ہے اور انڈر پروسس ہے۔ لوگوں کو پسند آئے گی۔ ایک فلم میں نے امریکہ کے بینڈ کے لیے لکھی ہے جو کہ انگریزی میں ہے اور اس کا نام اسٹرنگ آف لائف ہے۔ دو اسکرپٹ بھی

لکھے ہیں جو پی ٹی وی سے آن ایئر ہوں گے۔ ان میں ایک کا نام ''شرط'' ہے جو کہ ڈرامہ سیریل ہے۔ اور ایک سٹ کام ہے جس کا نام ''دو باتیں'' ہیں۔ یہ ان شاء اللہ جلد ہی آن ایرآئیں گے۔''
''جنگلز وغیرہ بھی لکھے؟''

''جی ہاں...... تقریباً ساٹھ کے قریب جنگلز لکھے ہیں، حال ہی میں عیسلے کا جنگل کیا ہے جو کہ جلد ہی آن ایئر ہو جائے گا۔''
''گانے کوئی خاص قسم کے لکھے یا ہر مزاج کا گانا لکھا؟''

''ہر مزاج کے لوگوں کے لیے گانے لکھے۔ لوسونگ، سیڈسونگ صوفی ازم پہ گانے لکھے۔ ابھی حال ہی میں ''سجاد علی'' کے لیے ایک ''حمد'' لکھی ہے جو عنقریب ''یوٹیوب'' پہ آجائے گی میرا سارا کام ''یوٹیوب'' پہ ہے......
محرم کے حوالے سے ''نوحے'' بھی لکھے اور نوحوں پہ ایک البم بھی آچکا ہے جو کہ ''امیر علی'' کے لیے کیا۔ ایک البم انڈیا کے نوحہ خواں کے لیے کیا اور ایک نوحہ خواں ملتان کے ہیں، ان کا بھی البم کیا۔ اس طرح تین البم ''نوحوں'' کے آچکے ہیں۔ ایک سنگر ہیں امرت حسین ان کے لیے گانے لکھے ہیں۔ ابھی ان کے ویڈیوز نہیں بنے، تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ دیسی فیلوز کے نام سے ایک گروپ ہے، ان کے لیے میں نے دو البم کیے ہیں اور جو کہ کافی ہٹ سونگز ہیں۔ اس طرح ایک سنگر ہیں ''ماریہ'' ان کے لیے بھی گانے لکھے ہیں میں نے ......اور عنقریب میں انگلینڈ جا رہی ہوں کیونکہ مجھے وہاں سے اسکرپٹ کی آفر ہے۔ تو ان کے لیے اسکرپٹ لکھنا ہے۔
تین چار آئیڈیاز بھی ہیں جن پہ کام کر رہی ہوں۔ جبکہ سونگز اور جنگلز تو چلتے ہی رہتے ہیں۔''
''آپ کے آڈیو اسٹوڈیو میں کیا کیا کام ہوتا ہے؟''
''آڈیو اسٹوڈیو میں ہر کام ہی ہوتا ہے، یعنی گلوکاری سے منسلک سب کچھ ہی ہوتا ہے، جیسے سونگز

......جنگلز، بیک گراؤنڈ میوزک سب کچھ ہوتا ہے اور اب ہم آڈیو کے ساتھ ساتھ ویڈیوز بھی کرتے ہیں۔''
''اتنا کام کر کے شہرت نہ ملنے کی وجہ آپ کی ''پی آر'' کمزور تھی کیا، یا آپ سوشل ہونا پسند نہیں کرتیں ......ورنہ تو دو گانے گا کر لوگ نامور ہو جاتے ہیں۔ جیسے علی ظفر، عاطف اسلم اور دیگر؟''

''دراصل پی آر کمزور نہیں تھی اور آپ نے جن دو لوگوں کے حوالے دیے یا دیگر لوگ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہٹ ہو گئے، وہ ''انڈیا'' سے ہٹ ہوئے...... اب یہاں کے لیے آپ کمزوری کہہ لیں یا ٹرینڈ سیٹنگ کہہ لیں کہ جب ہمارے ہی لوگوں کو باہر کی چھاپ لگ جاتی ہے تو پھر ہمارے یہاں بھی اسے لاڈلا بنا دیا جاتا ہے...... میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ امیر علی اپنے پاکستان کی سرزمین سے ہی ہٹ ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں اپنے ملک میں بہت زیادہ گروپنگ ہے۔ بہت زیادہ فیورٹ ازم ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کتنا سچا، باصلاحیت اور ڈیزرونگ آرٹسٹ ہے......بس وہ ہی آگے آتا ہے جس میں یہ گن ہوتے ہیں کہ اپنے آپ کو کس طرح لوگوں میں مقبول کرنا ہے۔
اصلی آرٹسٹ ہی اس وقت پیروں کی زنجیر ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ جتنے بھی ہٹ لوگ ہیں وہ جینوئن

آرٹسٹ میں سوائے شفقت امانت علی اور راحت فتح علی کے۔"

"اپنے میاں صاحب کے علاوہ کس کی فین ہیں اور میوزک میں زیادہ کیا سنتی ہیں؟"

"جی...... اپنے شوہر امیر علی کی تو میں بہت بڑی فین ہوں۔ ان کے علاوہ سجاد علی مجھے بہت پسند ہیں۔ مہدی حسن بھی میرے پسندیدہ ہیں، کیونکہ مجھے ذاتی طور پر غزلیں پسند ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ لونگ ڈرائیو اور غزلیں ہوں جو میں سن رہی ہوں۔"

"آج کل کی نسل کو شاعری اور ادب سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"میرا تو یہی خیال ہے کہ تعلیم کی کمی، مطالعے کی کمی اور دنیاداری کی الجھنوں نے ہمیں اتنا الجھا دیا ہے کہ ہم ہر طرح کے ادب سے دور ہو گئے ہیں۔ جبکہ "ادب" ایک بہت ہی خوب صورت چیز ہے مگر ادب تک جانے کا ٹائم ہی نہیں ملتا، اتنے بے ادب ہو گئے ہیں ہم...... شاعری اور ادب سے لگاؤ بہت ضروری ہے۔ انسان کو شعور آتا ہے ان چیزوں سے۔"

"میڈیا اپنا رول ادا کر رہا ہے کیا؟"

"میڈیا کا دور ہے اور سب کچھ سامنے نظر آنا چاہیے۔ مگر میڈیا کا رویہ جینوئن آرٹسٹوں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اتنا ہرٹ ہو جاتا ہے اپنی بے عزتی سے کہ پھر وہ کسی سے رابطہ نہیں رکھتا۔"

"چلیں جی...... اب ذرا نجی سوال ہو جائیں۔ مزاج کی کیسی ہیں آپ؟...... نرم یا گرم؟"

"مزاج کی نرم ہوں...... عام حالات میں غصہ نہیں آتا۔ کبھی کبھار آتا ہے، تیز آتا ہے...... مگر پھر جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ اور میری شخصیت ایسی ہے کہ لوگ میرے پاس بیٹھ کر بور نہیں ہوتے بلکہ ہنستے مسکراتے رہتے ہیں...... ہنس مکھ ہوں تو مذاق کرنے کا مزہ آتا ہے۔"

"میاں بیوی میں لڑائی ہو تو کون مناتا ہے؟"

مسکراتے ہوئے۔ "اس لڑائی میں تو زیادہ تر بلکہ مناتے ہی امیر علی صاحب ہیں اور اب اتنے سالوں کے بعد میرا دل کر رہا ہے کہ لڑائی ہو تو میں ان کو مناؤں۔"

"کوکنگ سے لگاؤ ہے...... خود ہی پکاتی ہیں کیا؟"

"اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنوں گی، بلکہ آپ ہمارے جاننے والوں میں کسی سے بھی پوچھ لیں، کوکنگ میں بہت اچھی کرتی ہوں۔ سب تعریف کرتے ہیں...... میں کوکنگ بھی کرتی ہوں۔ بیکنگ بھی کرتی ہوں۔ "پیزا" میں گھر پہ ہی بنا لیتی ہوں بچوں کے لیے...... اور جو بات مجھے سب سے زیادہ بری لگتی ہے وہ یہ کہ بچے باہر سے کھانا کھائیں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں سب کچھ ہی پکا لیتی ہوں۔"

"گھومنے پھرنے کا شوق ہے اور سوشل ہیں آپ؟"

"سوشل نہیں ہوں اور ملنے گلنے والی جگہ سے تھوڑا گھبراتی ہوں۔ گھومنے پھرنے کا شوق ہے مگر صرف اپنی فیملی کے ساتھ، ویک اینڈ پہ بچوں کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے نکل جاتے ہیں۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"مجھے پینٹنگز کا شوق ہے تو فارغ اوقات میں پینٹنگ کرتی ہوں، یہی میرا مشغلہ ہے۔ بیوٹیشن اور بوتیک کو مستقل پیمانے پہ نہیں چلا سکی، کیونکہ پھر بچوں سے غفلت ہو جاتی اور امیر علی بھی زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ اس لیے ہومیو پیتھک کی پریکٹس بھی نہیں کر سکتی۔"

"آخر میں آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"ادب کے حوالے سے یہ کہنا چاہوں گی کہ ہمارے یہاں ادب کو پروموٹ نہیں کیا جاتا جبکہ یہ انسان کی ذہنی نشوونما کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم اپنی باڈی گروتھ کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں مگر ذہنی و دماغی گروتھ کے لیے کچھ نہیں کرتے، دنیا میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ عام لوگ دنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن شاعر اور ادیب کے اندر رہتی ہے دنیا۔"

اس خوب صورت بات کے ساتھ ہم نے انیقہ امیر علی صاحبہ سے اجازت چاہی۔

1 ''اصلی نام؟''

''عمیر بٹ۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''اومی......Omi۔''

3 ''تاریخ پیدائش/شہر؟''

''14 جنوری 1988ء / کراچی۔''

4 ''قد/ستارہ؟''

''5 فٹ 11 انچ / کیپری کورن۔''

5 ''بہن بھائی......آپ کا نمبر؟''

''ہم دو بھائی ہیں اور ایک بہن ہے۔ میرا نمبر آخری ہے۔''

6 ''تعلیم؟......کیا بننا چاہتے تھے؟''

''ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں بیچلرز ہوں۔ تین سال کا ڈپلومہ کورس کیا ایکٹنگ میں ناپا (NAPA) سے اور

باتیں اومی بٹ سے

شاہین رشید

مجھے بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا اور اداکار ہی بننا چاہتا تھا۔ چھٹی کلاس میں پہلا ڈرامہ لکھا ''جناح ٹو قائد''۔''

7 ''شادی؟''

''اپنے کام سے اور اداکاری سے شادی کر لی ہے اور وہ بھی اپنی پسند سے۔''

8 ''شوبز میں آمد؟ گھر والوں کا ردعمل؟''

''13 سال کی جدوجہد اور بہت زیادہ تھیٹر کرنے کے بعد کامیاب ہوا، گھر والے میرے ڈریم کے ساتھ ساتھ رہے۔''

9 ''پہلا ڈرامہ؟''

''بنٹی کی بٹر لی۔''

10 ''وہ ڈرامہ جس نے شہرت دی؟''

''باجی ارشاد'' اور ''التجا''۔

11 ''پہلی کمائی؟''

''ٹیوشن پڑھائی تھی اور جتنے بھی پیسے ملے تھے اس سے میں نے گٹار لے لیا تھا۔''

12 ''شوبز کی بڑی برائی؟''

''فیورٹ ازم بہت ہے۔''

13 ''صبح کب بیدار ہوتے ہیں؟''

''عموماً ساڑھے سات تک اٹھ جاتا ہوں۔''

14 ''اٹھتے ہی کیا کرتے ہیں؟''

''ضروری کام سے فارغ ہو کر ''جم'' کے لیے نکل جاتا ہوں۔''

15 ''دنیا میں چینج لانے کو کہیں تو کیا چینج لائیں گے؟''

''تمام اسلحہ پہ پابندی لگا دوں گا۔ جیسا کہ آسٹریلیا میں ہے۔''

16 ''اچھی یا بری نیوز سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟''
''اپنے دوست کو۔''
17 ''خود میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟''
''میں نماز شروع کرنا چاہتا ہوں۔''
18 ''فخر کا کوئی لمحہ؟''
''جب پہلی بار ''پاپا'' نے بڑے فخر سے کسی کے ساتھ میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''میرا بیٹا اداکار ہے۔''
19 ''بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک موجود ہے؟''
''میں بہت تیز بولتا ہوں۔''
20 ''طبیعت میں ضد ہے؟''
''بہت زیادہ۔''
21 ''زندگی کا ایک ہی دن باقی ہو تو خدا سے کیا مانگیں گے؟''
''کچھ دن کی مہلت۔''
22 ''کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟''
''بہت غصہ آتا ہے۔''
23 ''سات دنوں میں پسندیدہ دن؟''
''ہفتہ۔''
24 ''مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟''
''جنوری...... سالگرہ ہوتی ہے میری۔''
25 ''لڑکیوں میں کیا بات بری لگتی ہے؟/ اچھی؟''
''مجھے نفرت ہوتی ہے جب وہ بحث کرتی ہیں۔ اور مجھے لڑکیوں کی مسکراہٹ اچھی لگتی ہے۔''
26 ''کس لمحے نے زندگی ہی بدل دی؟''
''جب ''امی'' کا انتقال ہوا۔''
27 ''وقت سے پہلے کیا ملا؟''
''کچھ نہیں ملا...... جو ملا وقت پہ ملا اور بہت محنت کے بعد ملا۔''
28 ''غصہ کب آتا ہے؟''
''جب چیزیں یا کام میرے حساب سے پرفیکٹ نہ ہو رہا ہو۔''
29 ''کیا آپ کسی سے خوفزدہ رہتے ہیں؟''
''نہیں...... کبھی نہیں اور کسی سے نہیں۔''
30 ''آپ اکثر سوچتے ہیں؟''
''اکثر نہیں ہمیشہ سوچتا ہوں اور ہر کام سے پہلے بہت سوچتا ہوں۔''
31 ''بھوک میں کیا کھانے کو دل چاہتا ہے؟''
''ہر چیز کھانے کو دل چاہتا ہے، کچھ بھی مل جائے۔''
32 ''اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟''
''تو پھر ''اٹلی'' جاؤں گا۔''
33 ''اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک ہاتھ آجائے تو؟''
''تو اس میں اتنا اماؤنٹ ضرور لکھوں گا جس سے میں ایک ''اولڈ ایج ہاؤس'' آرام سے چلا سکوں۔''
34 ''سیاست میں کس کو فالو کریں گے؟''
''آصف علی زرداری کو۔''
35 ''ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟''
''پوزیسیو نہ ہوا کریں۔''
36 ''جھوٹ کب بولتے ہیں؟''
''بہت کم موقع ایسا آیا کہ جھوٹ بولنا پڑا ہو۔ مگر پھر بھی جب بھی کبھی جھوٹ بولا تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہی بولا ہوگا۔''
37 ''گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟''
''والدین کے ساتھ وقت گزارنے کا دل چاہتا ہے۔''
38 ''کسی کی تعریف میں دو جملے کیا بولتے ہیں؟''
''خدا نے آپ کو بہت خوب صورت بنایا ہے۔''
39 ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟''
''تعلیم اور ہنر۔''

40 ''کس فنکارہ کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟''
''نیلم منیر۔''
41 ''کسی ایسی فلم میں کام کرنا چاہتا ہوں جو؟''
''میڈیا کے اصلی حقائق اور مشکلات دکھائے۔''
42 ''اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتے ہیں؟''
''ستر فیصد...... ماشاءاللہ۔''
43 ''ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟''
''محبت کبھی ہوئی ہی نہیں۔''
44 ''کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟''
''جہاں کھانے پینے کے لیے جانا ہو۔''
45 ''کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟''
''ابو کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی۔''
46 ''گھر میں کس کے کمرے میں سکون ملتا ہے؟''
''اپنے کمرے میں......''
47 ''کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟''
''مشکل وقت میں آزما کر دیکھیں۔''
48 ''بی پی ہائی ہو جائے تو ردعمل؟''
''چپ ہو جاتا ہوں یا پھر گھر سے باہر جا کر ٹھنڈی ہوا میں تیز تیز سانس لیتا ہوں۔''
49 ''کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟''
''بہت زیادہ...... مگر اب اللہ کا کرم ہے۔''
50 ''آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟''
''ہاہا...... ہاہاہاہا...... ریسٹورنٹ کے بل۔''
51 ''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''
''بڑوں کی ہر نصیحت پہ عمل کرتا ہوں۔ بڑوں کی نصیحت بری نہیں لگتی۔''
52 ''کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟''
''اماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چٹنی...... مگر اب بھابھی کے ہاتھ کی...... کیونکہ اب ماں نہیں ہے میری۔''
53 ''کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے، اپنے بیڈ پہ۔ چٹائی پہ یا ڈائننگ ٹیبل پہ؟''
''چٹائی پر...... زمین پہ......''
54 ''فیس بک، انٹرنیٹ، انسٹاگرام سے آپ کی دلچسپی؟''
''بہت زیادہ ہے۔''
55 ''وقت کی پابندی کرتے ہیں؟''
''پوری کوشش کرتا ہوں۔''
56 ''کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟''
''نہاری چاول۔''
57 ''کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتے؟''
'' 4 جولائی، جب امی کا انتقال ہوا۔''
58 ''دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتے ہیں؟''
''کلچرل ویلیو۔''
59 ''اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا

خریدی؟"
"اپنی کار۔"
60 "کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟"
"بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ میں کھانا پینا بہت پسند کرتا ہوں۔"
61 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"ملٹی پل پرسنالٹی ڈس آرڈر والا کردار کرنا چاہتا ہوں۔"
62 "ایک کردار جو مقبول ہوا؟"
"جوزف" کا کردار جو میں نے "باجی ارشاد" میں کیا تھا۔"
63 "کوئی کردار جو آپ کر کے پچھتائے؟"
"ڈرامے کا نام نہیں لے سکتا۔"
64 "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"
"کوئی بڑا ایوارڈ لوں تا کہ میرے والدین مجھ پر فخر کر سکیں۔"
65 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"تھوڑی حسین اور تھوڑی ذہین۔"
66 "ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟"
"بہت زیادہ مشہور اور قابل ہونے کا خواب دیکھتا ہوں۔"
67 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"برنس روڈ اور پاکستان چوک۔"
68 "آئینہ دیکھ کر سوچتے ہیں؟"
"کچھ نہیں سوچتا......"
69 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی اور رت جگا...... اور شادی میں گفٹ نہیں بلکہ کیش دینا چاہیے۔"
70 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
"ناشتہ اپنے ہاتھ کا اور کھانا امی کے بعد بھابھی کے ہاتھ کا۔"
71 "بدلہ لیتے ہیں؟"
"نہیں، درگزر کرتا ہوں۔"
72 "کب فریش ہوتے ہیں؟"
"جم کے بعد یا پھر کسی اچھی پارٹی میں۔"
73 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"
"اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں۔ اس طرح ہر کام زندگی بھر یاد رہتا ہے۔"
74 "دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟"
"والدین......"
75 "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
"گانا سننے کی......"
76 "آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟"
"پیراگلائیڈنگ اور ماؤنٹ سر کرنا چاہتا ہوں۔"
77 "شروعات کس سے کی، فلم ماڈلنگ یا اداکاری؟"
"کمرشل ماڈلنگ سے شروعات کی۔"
78 "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟"
"سم سم بال۔"
79 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"جی ہے...... اونچائی سے ڈر لگتا ہے...... جب ہی پیراگلائیڈنگ کرتا ہے۔"
80 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"بالکل بھی نہیں۔"
81 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"جی کر لیتا ہوں مگر تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔"
82 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"تھوڑی دل کی، تھوڑی دماغ کی۔"
83 "غصے میں پہلا لفظ کیا بولتے ہیں؟"
"شاؤٹ کرتا ہوں اور اس جگہ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"
84 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا ٹائم لگتا ہے؟"
"ٹائم لگتا ہے...... فوراً نیند نہیں آتی۔"
85 "سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتے

ہیں؟"

"سارے گھر کے دروازے چیک کر کے سوتا ہوں۔ یہ کام روزانہ کرتا ہوں۔"

86 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"محنت کریں گے تو قسمت بھی ساتھ دے گی اور پیسہ خود بہ خود آجائے گا۔"

87 "تہوار جو آپ کو پسند ہیں؟"

"عیدالفطر (میٹھی عید)۔"

88 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب کام نہ ہو۔"

89 "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"مجھے تو بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔"

90 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"موبائل، والٹ اور وائی فائی ڈیوائس۔"

91 "پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"

"کاش ہر جگہ امن ہو۔"

92 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"

"اچھی عادت تو یہ کہ سب کو خوش رکھتا ہوں، ہنستا ہوں ہنساتا ہوں اور بری یہ کہ دوسروں پہ جلدی بھروسا کر لیتا ہوں۔"

93 "شوبز میں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے؟"

"میں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ فرم میں ہوتا۔"

94 "ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟"

"اپنے خواب پورے نہ ہونے کا۔"

95 "کیا چیزیں نشے کی حد تک پسند ہیں؟"

"مٹھائی۔"

96 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"انسان۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"پھر سے جدوجہد شروع کروں گا اور ہار نہیں مانوں گا۔"

☆

کہ پڑھو، سوچو اور لکھو

سیّد احمد

کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کو اپنی بنائی ہوئی سب چیزوں میں سے سب سے زیادہ عزیز اپنی زبان اور ادبیات ہوا کرتی ہے۔ عربوں کا اپنے سوا ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہنا اور انگریزوں کا اپنے عروج و اقتدار کے زمانے میں شیکسپیئر کے ڈراموں کو اپنی تمام مقبوضات پر ترجیح دینا ان کی محبت اور فخر کا آئینہ ہے۔

ادب وہ سلطنت ہے، جس پر انسانوں کو بہت ناز رہا ہے کیونکہ اس سلطنت کو نہ جنگ سے جیتا جا سکتا ہے نہ مفتوح بنا کر تخت سے گرایا جا سکتا ہے۔ جو قوم جتنی دانائی رکھے گی، وہ اتنا ہی اس سلطنت (ادب) پر راج کرے گی۔ ادب کا انسان کی زندگی میں اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا تاریخ کا کل انسانیت پر۔

اخبار خبریں سناتا ہے اور ادب اس خبر کے پیچھے کی کہانی دکھاتا ہے۔ تاریخی کتابوں نے ہند کے مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت کو ایک واقعہ، سانحہ اور المیہ بنا کر لکھا ہے۔ لیکن اس المیے کی اصل منظر کشی ''ادب'' نے کی ہے۔

ناول ''آنگن'' نے وہ کہانی سنائی ہے جو تاریخ کی کتابیں نہیں سنا سکتیں۔ وہ جذبات دکھائے ہیں، جن پر غدر برپا رہا اور جو پامال ہو کر سسکتے اور گھٹتے رہے۔

چلتا مسافر، دستک نہ دو، اداس نسلیں، راہیں، ان سب کہانیوں نے پردے کے پیچھے کی حقیقتیں دکھائی ہیں۔ اگر ادیب آگے بڑھ کر ان سب پر قلم نہ اٹھاتا، تو آنے والی نسلیں یہ جان ہی نہیں سکتی تھیں کہ جو گزر چکے ہیں ان پر کیا گزری تھی۔ سرحد پر لگے کیمپوں میں مائیں کس درد سے کلبلائی تھیں۔ کنووں میں کود کر کتنی لڑکیوں نے اپنی عزتیں بچا کر اپنی جانیں گنوائی تھیں۔

ہجرت سے پہلے کے امیر، ہجرت کے بعد فقیر ہوئے تو ان کے خاندانوں پر کیا گزری۔ باپردہ عورتیں، سر بازار بے پردہ ہوئیں تو ان کے دلوں میں کیسی کیسی آندھیاں چلی تھیں۔ اونچے خاندانوں کی عزتیں جب چوباروں میں جا بیٹھیں تو ظلم اور بے رحمی کی کیسی کیسی داستانیں وجود میں آئیں۔

اگر یہ ادب نہ ہوتا تو گھٹی ہوئی سسکیوں، اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کی منظر کشی کون کرتا۔ ہم کیسے جان پاتے کہ جو زمینیں بے گناہوں کے خون سے رنگین ہوئی تھیں ان پر دوبارہ کبھی فصلیں کیوں نہیں اُگی تھیں۔ جن حویلیوں اور بیٹھکوں میں انصاف کا گلا گھونٹا گیا، وہاں الوؤں کا بسیرا کیسے ہوا تھا۔

تاریخ اگر ایک ثبوت ہے تو ادیب (ادب) اس ثبوت کے گواہ ہیں۔

ادب میں فکشن (کہانی) کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہمارے یہاں فکشن میں ڈائجسٹ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے قصہ گو ہوا کرتے تھے، یعنی کہانیاں کہنے والے۔ اب قصے بیان ہوتے ہیں یعنی لکھے جاتے ہیں۔ پہلے ادب لوک داستانوں کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اب یہ داستانیں کتابوں کی شکل میں موجود ہیں۔

اس ترقی یافتہ دور سے کچھ وقت پہلے تک کتاب پڑھنا، خریدنا، یا لکھنا خواب ہوا کرتا تھا۔ تب جب قلم سے کتابیں لکھی جاتی تھیں اور کتاب کے کاغذ کو سونے چاندی کے ورق کی مانند سمجھا جاتا تھا۔ کاغذ دستیاب ہی نہیں تھا۔ اسی لیے بڑی سے بڑی کتاب، شاہکار کتابوں کی بھی صرف چند جلدیں موجود ہوتی تھیں۔ کیونکہ کتاب لکھنا مشکل بھی تھا اور مہنگا بھی۔ جس کے پاس چند کتابیں ہوتی تھیں اسے بہت امیر اور شاہ خرچ سمجھا جاتا تھا۔ یہ شاہ خرچی ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

پھر وہ وقت آیا کہ کتابیں چھپنے لگیں۔ کاغذ وافر اور سستا ہو گیا۔ پڑھنے والوں کو کتابیں خریدنے کی

سہولت مل گئی۔ لوگ اپنی من پسند کتابیں خرید کر جمع کرنے لگے۔ اس کے باوجود ہمارے ملک کی ستر فیصد آبادی یعنی عام آدمی خاص طور پر گھریلو خاتون یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی ایک کتاب کی مالک بن سکتی ہے۔ کتاب خرید سکتی ہے، لکھ سکتی ہے، یا اس پر تبصرہ کر سکتی ہے۔

علم والوں کی باتیں' دانائی کے قصے' اور سوجھ بوجھ کی کہانیاں' وہ بھی پڑھ' سمجھ اور بوجھ سکتی ہے۔ وقت کے ساتھ وہ بھی سفر کر سکتی ہے۔ گزرے ہوئے وقت کی ایک جھلک وہ بھی دیکھ سکتی ہے۔ گھر میں بیٹھ کر' دنیا کی وسعت میں جھانکتے ہوئے' یہ عورت جو کتاب سے دُور ہے' اور کچھ نئے خیالات سے بھی' وہ کسی ''کتاب'' کی مالک بن سکتی ہے۔ پڑھنے کے لیے' پھر سوچنے کے لیے اور بالآخر ''لکھ'' ڈالنے کے لیے۔

''پڑھو' سوچو اور لکھو'' ملکیت کا یہ حق ''خواتین ڈائجسٹ'' نے اس عورت کو دیا ہے۔ ملک کی ہر عورت کو۔

نئی کہانیاں' نیا انداز فکر' جداگانہ افکار' اور یہ تسلی کہ ''جو زمانے کو میسر نہیں رہا' وہ تمہیں ہمیشہ میسر رہے گا۔ جہاں پہلے اندھیرا قابض رہا ہے' وہاں اب چراغ روشن رہے گا۔''

یہ ڈائجسٹ صرف ڈائجسٹ نہیں ہے۔ تفریح یا وقت گزاری کا سامان نہیں ہے۔ اس میں وقت کے اتار چڑھاؤ کی کہانیاں ہیں۔ کچھ گزرے ہوئے کل کی' کچھ آنے والے وقت کی۔ وہ کہانیاں جو خیالی ہیں' وہ بھی سچے جذبات اور حقیقی الفاظ کے تانے بانے سے لکھی گئی ہیں۔ ایک عورت جو اپنی بے وقوفی سے اپنا گھر اجاڑ چکی ہے' وہ پڑھنے والی ہر آنکھ کو یہ سبق دے رہی ہے کہ جو میں نے کیا وہ تم نہ کرنا۔ ایک لڑکی جو جذبات میں بہہ کر گھر سے باہر قدم نکال چکی ہے' وہ دوسری لڑکیوں کو بتا رہی ہے کہ جیسے میں تباہ ہوئی' تم نہ ہونا۔

یہ ڈائجسٹ' صرف ڈائجسٹ ہی تو نہیں ہے۔

یہ معاشرے میں سدھار کا پختہ ''ارادہ'' ہے۔

ہمارے ملک میں پاپولر فکشن کو آج تک فکشن کا درجہ دیا ہی نہیں گیا۔ مجھے یہ خواہ مخواہ کی ضد لگتی ہے۔ کیونکہ لٹریچر میں جب کوئی بھی جہت (نیا انداز) آتی ہے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ جیسے بیرونی دنیا میں سسپنس فکشن آیا تو اسے قبول کر لیا گیا۔ پھر سائنس فکشن' فینٹسی' ہارر' اسپیس فکشن وغیرہ آئے تو انہیں ادب کا حصہ مان لیا گیا۔ لیکن پاکستان میں ادب سے منسلک لوگ پاپولر فکشن کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ شاید اس لیے کہ اسے لکھنے والوں کی بڑی تعداد ''خواتین رائٹرز'' کی ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہیں ''پاپولر فکشن'' سے چڑ ہے یا ''خواتین'' سے۔

خواتین ڈائجسٹ نے نہ صرف پاپولر فکشن کو قبول کیا بلکہ اسے پروان بھی چڑھایا۔ بیج سے گھنا جنگل اگا لیا ہے۔ اس میں نئی نئی جدتیں دی ہیں۔ معاشرتی' گھریلو اور رومانوی کہانیوں کا انداز بدل دیا ہے۔ جو پاپولر فکشن نے اتنا لمبا سفر طے کیا ہے تو کیسے کر لیا ہے؟ اس ڈائجسٹ کے ذریعے ہی تو کیا ہے۔ سادہ بیانی سے گہرے انداز تک' اس ادارے کی رائٹرز نے ان کہانیوں کی ٹریٹمنٹ (طرز تحریر) کو ہر رنگ دیا ہے۔ ہر صنف اور جدت کی کہانی کو ڈائجسٹ کا حصہ بنایا ہے۔ کون سی ایسی ادا چھوڑی ہے' جسے لکھا نہیں گیا اور جس پر داد نہیں ملی۔ ایسا وہ کون سا خیال ہے' جسے کہانی کی قیام گاہ نہیں بنایا۔

ایک سرسری نظر ڈالیں اس ڈائجسٹ پر' اور دیکھیں کہ جو ستر سالوں میں پورا ادب نہیں کر سکا' وہ یہ کر چکا ہے۔ سفر کے سارے پڑاؤ' شور کیے بغیر یہ عبور کر چکا ہے۔

کیونکہ ادب کی دنیا کے سناٹے' کہانیوں کی گونج سے ٹوٹتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی کہانیوں نے ادب کی دنیا کے سناٹوں کو پوری قوت سے توڑا ہے۔ اور کیا یہ کسی معرکے سے کم ہے کہ جہاں کتاب اور کہانی سرے سے دست یاب ہی نہیں تھی' وہاں اب قلم' سیاہی اور کہانی موجود ہے...... کہ ''پڑھو' سوچو اور لکھو''۔

☆

خبریں و ہیں

واصفہ سہیل

اثر

محب مرزا آج کل کے ڈراموں میں مردانہ کرداروں کے متعلق کہتے ہیں کہ "میں چار سال کے بعد کسی ڈرامے میں کام کر رہا ہوں۔ ڈراموں میں اکثر ہیرو جسمانی تشدد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیا مردوں کے لیے یہی کردار رہ گئے ہیں۔ (سوال تو اچھا ہے محب! مگر ایسے زیادہ تر ڈرامے مردوں نے ہی لکھے اور ڈائریکٹ بھی کیے ہیں تو ......؟) ایک فنکار کی حیثیت سے میری معاشرتی ذمہ داری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ڈرامے میں جسمانی تشدد بالکل نہیں ہے۔ (یہ بھی رائٹر کا کمال ہے نا!)

چار سال بعد ڈرامے میں کام کرنے سے متعلق محب مرزا کا کہنا ہے کہ میں نے چار سال میں تیس سے چالیس ڈرامے چھوڑے ہیں (تھوڑے کم کر لیں محب! کچھ زیادہ نہیں ہو گئے ......؟) اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں میرے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں نے فلم کی وجہ سے ڈراموں میں کام کرنا چھوڑا ہے (سچ تو یہی ہے نا ......؟) ڈراموں میں مردوں کو منفی کردار میں ضرور دکھائیں مگر یہ خیال رکھیں کہ یہ ڈرامے بچے بھی دیکھتے ہیں ان پر کیا اثر ہو گا ان سب کو دیکھ کر۔ کیونکہ وہ ان منفی کرداروں سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔" (سو تو ہے ......!)

شناخت

طوبیٰ صدیقی ماڈلنگ سے ٹی وی ڈراموں کی طرف آئیں اور بہت سے ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے، اب طوبیٰ کی اگلی منزل فلم ہے۔ طوبیٰ کا کہنا ہے کہ بلاشبہ میں نے اپنا فنی سفر ماڈلنگ سے شروع کیا اور پاکستان کے تمام فیشن شوز میں حصہ لیا۔ میرا اصل شوق اداکاری ہی تھا۔ جس کے لیے میں درست وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس میں تھوڑی دیر ضرور ہوئی لیکن جس طرح کا کام میں

کرنا چاہ رہی تھی ویسے ہی کرداروں کی مجھے ٹی وی سیریلز میں آفر ہوئی۔'' طوبیٰ صدیقی نے مزید کہا کہ......''میں کام کے معاملے میں بہت سوچ بچار سے کام لیتی ہوں یہی وجہ ہے کہ میرے ڈراموں کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں کم ہے۔ (کون دوسرے......؟) لیکن میں نے جو بھی کردار کیے ہیں اب تک ان کو اچھا رسپانس ملا ہے۔ میں فلموں میں کام تو کرنا چاہتی ہوں لیکن مجھے صرف وہی کام کرنا ہے جو معمول سے ہٹ کر ہو (مثلاً کتنا ہٹ کے ہو......بھئی کردار اور کیا ؟)

خوصلہ افزائی

پی ایس ایل کا نشہ پورے پاکستان کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے تو ہمارے فنکار اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ جاوید شیخ بھی پی ایس ایل تھری میں ملتان سلطان کی ......ٹی شرٹ پہنے انہیں سپورٹ کرنے کے لیے دبئی میں موجود تھے۔ اس بارے میں جاوید شیخ کا کہنا ہے کہ ''میں کیوں نہ سپورٹ کروں (وجہ؟) پچھلے سال میں کراچی کنگز کو سپورٹ کر رہا تھا۔ اس بار ملتان سلطان کے ساتھ ہوں، ہو سکتا ہے کہ اگلے پی ایس ایل میں کوئٹہ گلیڈی ایٹر میری پسند ہو یہ سب میرے ملک کی ٹیمیں ہیں، میں کسی ایک ٹیم کو نہیں بلکہ پاکستان کو سپورٹ کرتا ہوں۔ (اور وہ ہار جاتی ہے۔) کوئی بھی ٹیم جیتے۔ جیت پاکستان کی ہوگی۔ میں یہاں ان (کھلاڑیوں) کے درمیان بہت خوش ہوں۔''

توجہ

اسکواش کے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی جان شیر خان کا کہنا ہے کہ ''پاکستان اسکواش فیڈریشن کو چاہیے کہ سینئر کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ نوجوان اور جونیئر کھلاڑیوں کی تربیت کا پورا خیال رکھے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم اس کھیل میں مزید پیچھے چلے جائیں گے۔ (ابھی بھی پی ایس ایف کو اس کا احساس نہیں ہے کہ ہم کہاں سے کہاں آ گئے ہیں۔) جان شیر نے

مزید کہا کہ ''پاکستان اسکواش فیڈریشن کو چاہیے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر بھارت کے خلاف آواز اٹھائے۔ جو پاکستان کو پچاس سے ستر ہزار ڈالر کی انعامی رقم سے زیادہ کے ایونٹس منعقد کرانے کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ (یہاں پرواہ کس کو ہے......؟) بھارتی دباؤ کے باعث ہی پاکستان خواتین کے لیے بھی پچاس ہزار ڈالرز سے زائد رقم کے انعامی ایونٹس آرگنائز کرنے سے قاصر ہے۔ پاکستان کو انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں یہ معاملہ اٹھانا ہوگا۔'' (پر اٹھائے کون......؟)

وقت نے کیے کیا ستم

ندیم اور شبنم پاکستان فلم انڈسٹری کے دو بڑے نام ہیں جن کے کریڈٹ پر بے شمار فلمیں ہیں جس میں ''آئینہ، پہچان، تلاش، ہم دونوں'' جیسی سپر ہٹ فلمیں بھی شامل ہیں۔

ندیم اور شبنم کی جوڑی فلم بینوں میں بہت مقبول تھی یہ خوب صورت فنکار کل کیا تھے اور آج وقت کے ہاتھوں کتنا بدل گئے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی اس تصویر کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو ہمیں معروف فوٹو گرافر محمود حسن کے ذریعے ملیں۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

وائٹ چکن بادامی

ضروری اشیاء:۔

مرغی کا گوشت	ڈیڑھ کلو
دہی	ڈیڑھ پاؤ
سفید مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک کپ
بادام پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
لہسن پیسٹ	ڈیڑھ کھانے کا چمچ
ادرک پیسٹ	ڈیڑھ کھانے کا چمچ

ترکیب:۔

دیگچی میں تیل گرم کر کے اس میں گوشت اور لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر دو تین منٹ بھونیں۔ اس کے بعد اس میں دہی، سفید مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔

جب گوشت گل جائے تو بادام کا پیسٹ ڈال کر بھون لیں۔ ڈش میں نکال کر بادام کی گری اور پودینہ سے گارنش کر کے پیش کریں۔

چکن کندن کلیاں

ضروری اشیاء:۔

چکن بریسٹ	تین چار عدد
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
دہی	ایک کپ
گرم مسالا پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
کباب چینی	آدھا چائے کا چمچ
بادیان (پسا ہوا)	ایک چٹکی
سفید زیرہ (بھون کر پیس لیں)	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک	ایک چائے کا چمچ
تیل	ڈیڑھ کپ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی

ترکیب:۔

گوشت پر چھری سے لمبے اور گہری کٹ لگائیں۔ اس کے بعد اس میں سرخ مرچ پاؤڈر، نمک، دہی، گرم مسالا پاؤڈر، کباب چینی، بادیان، سفید زیرہ، لیموں کا رس، لہسن، ادرک پسا ہوا اور ایک کھانے کا چمچ تیل اچھی طرح لگا کر دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں مسالا لگا چکن ڈال کر درمیانی آنچ پر پکا لیں۔ پانی خشک ہونے پر گوشت نکال کر رکھ دیں، بچا ہوا مسالا دو منٹ تک بھون لیں۔ (گریوی کے لیے رکھ دیں) توے پر باقی بچا ہوا تیل گرم کریں اور گوشت کو بھونیں۔ سنہری ہونے پر گریوی کے ساتھ ڈش میں نکالیں۔

جھٹ پٹ میٹھا

اجزاء:۔

بسکٹ (میری)	ایک پیکٹ
دہی	ایک کپ
کریم	چار کھانے کے چمچے
چینی (پسی ہوئی)	چار کھانے کے چمچے
کوکو پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:۔

میری بسکٹ چورا کر لیں، ایک برتن میں دہی پھینٹ کر اس میں کریم شامل کریں (کریم نہ ہو تو بالائی استعمال کر لیں) پھر پسی ہوئی چینی بھی شامل کر لیں اور اس میں کوکو پاؤڈر ملا لیں۔ اس کے بعد کانٹے یا بیٹر کی مدد سے اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب ایک شیشے کی ڈش میں پہلے بسکٹ کا چورا ڈالیں پھر اس پر یہ سارا آمیزہ ڈال دیں

اور اس کو ایک گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ آئس کریم کے ذائقے والا مزے دار جھٹ پٹ میٹھا تیار ہے۔

☆

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Perfumed Talc
Joy
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

زندگی سے مایوس بہن

اس قسم کے خط مجھے ہمیشہ ایک کرب، ایک دکھ کی کیفیت میں مبتلا کردیتے ہیں، نادان، کچی عمر کی لڑکیاں کم عقلی اور کم علمی کے باعث جھوٹے مکار لوگوں کی باتوں میں آکر کس طرح اپنی زندگی کو ایک مسلسل اذیت، ایک عذاب بنالیتی ہیں، آپ کا خط اس کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس مرد کو کیا کہوں جو ایک بچی کے ساتھ یہ کھیل کھیلتے ہوئے بھول گیا ہے کہ اس کی اپنی بیٹی، اپنی بہن بھی اس جگہ ہوسکتی ہے۔ پندرہ سال کی عمر کی ایک بچی کو فون پر نکاح کا جھانسا دینا اور پھر اس کی زندگی کو اس طرح عذاب بنادینا' انتہائی مکروہ اور شیطانی حرکت ہے۔

آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس طرح فون پر صرف کہنے سے کوئی نکاح نہیں ہوتا۔ نکاح کے لیے باقاعدہ گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اپنے بھی ذہن سے یہ بات بالکل نکال دیں کہ آپ کا اس سے نکاح ہوچکا ہے۔ یہ انتہائی احمقانہ بات ہے کہ آپ نے فون پر اس سے اقرار کیا اور آپ اس کی بیوی بن گئیں۔

جبکہ وہ آپ کو بیوی کے حقوق دینے کا بھی پابند نہیں ہے۔ آپ اس کی بیوی نہیں ہیں نہ ہی اس کو آپ پر کوئی پابندی لگانے کا حق ہے۔ آپ اپنی نادانی اور کم عقلی دیکھیں، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ وہ آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جائے گا۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے بچے ہیں، وہ آپ کے سامنے اپنی بیوی کی تعریفیں کرتا ہے۔ اس کو باکردار کہتا ہے آپ پر شک کرتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ تم میری عزت ہو، دنیا کی نظر میں نہیں' اللہ کی نظر میں ہو۔

آپ نے لکھا ہے کہ'وہ آپ سے سچا ہے آپ کی قدر کرتا ہے' آپ کا خیال رکھتا ہے وہ مخلص ہوتا تو آپ کے حقوق آپ کو دیتا۔ آپ کو ٹارچر نہیں کرتا' یہ بھی اس کا جھانسا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں مرجاؤں تو دوسری شادی کرلینا۔ جب پہلی شادی ہی نہیں ہوئی تو دوسری شادی کا کیا سوال؟ وہ آپ کو مدرسے جانے سے، گھر سے باہر نکلنے سے روکتا ہے' اسے اس کا حق نہیں ہے نہ ہی کہیں جانے کے لیے آپ کو اس کی اجازت کی ضرورت ہے۔ آپ گھر سے نکلیں...... مدرسے جائیں۔ علم حاصل کریں۔ کم علمی نے ہی آپ کی زندگی کو مسلسل اذیت بنایا ہے۔

اب سب سے پہلا کام یہ کریں کہ اپنے فون سے سم نکال کر پھینک دیں اور فون کو تالے میں بند کردیں۔ اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھیں۔ اگر وہ کسی اور طریقے سے تنگ کرے تو اسے صاف صاف بتادیں کہ آپ پولیس میں اس کی شکایت کردیں گی۔ جس طرح کا وہ شیطان ہے۔ اس کے لیے صرف دھمکی ہی کافی ہوگی۔

آپ نے لکھا ہے' مجھے بہن بنالیں تو آپ بہن ہی تو ہیں۔

ک ۔ ش

آپ نے اپنے باپ کے مظالم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آپ کو گھر میں قید رکھتا ہے۔ نانا، نانی اور دوسرے رشتہ داروں کے گھر بھی جانے نہیں دیتا۔ رشتے آتے ہیں تو عیب نکال کر انکار کردیتا ہے جبکہ بڑی بہن کی عمر 35 سال ہوچکی ہے۔ یہ صورت حال واقعی بہت اذیت ناک ہے۔ آپ نے اپنی والدہ کے بارے میں نہیں لکھا۔ اگر وہ حیات ہیں تو انہیں اس سلسلے میں آواز اٹھانا چاہیے' آپ کے چچا، تایا سے مدد لینی چاہیے یا ننھیال میں ماموں وغیرہ ہوں تو ان سے بات کریں اور کسی مناسب جگہ رشتہ کردیں کیونکہ اسی صورت آپ کو اس قید سے نجات مل سکتی ہے۔ باپ کو قتل کرنے کے بارے میں ہرگز نہ سوچیں۔ یہ دین اور دنیا دونوں کا خسارہ ہے۔ اللہ سے اپنی بھلائی اور ان کی ہدایت کی دعا کریں۔

سیما ۔ لاہور

شادی ہوئی تو میرے شوہر کینیڈا میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ اکلوتے تھے۔ انہوں نے شادی سے پہلے ہی میرے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ساتھ لے کر نہیں جائیں گے۔ ان کے والدین بوڑھے اور بیمار ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وہ مجھ سے ملنے پاکستان آتے رہیں گے۔

میں نے ان کے والدین کا ہر طرح خیال رکھا۔ میرے سسر کا تو شادی کے دو سال بعد ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن ساس کافی عرصہ بیمار رہیں' وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ سسر کے انتقال کے بعد انہیں برین ہیمرج ہوا اور وہ مفلوج ہو گئیں۔ اس دوران میرے دو بچے بھی ہو چکے تھے۔ ایک مفلوج انسان کی خدمت کتنا مشکل کام ہے' آپ سوچ سکتے ہیں۔ ان کے سارے کام' نہلانا' رفع حاجت' کھانا کھلانا وغیرہ میں انجام دیتی تھی۔ میری عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی شدید ڈپریشن کا شکار ہو جاتی' سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں' گھر کے اور باہر کے سینکڑوں کام تھے جو مجھے انجام دینا ہوتے تھے۔ شوہر محدود رقم بھجواتے تھے۔ کوئی ملازمہ بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان میں اپنا ذاتی گھر بنانا چاہتے ہیں' اس لیے بچت کر رہے ہیں۔

میرے شوہر کے چچازاد بھائی ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ وہ باہر کے کاموں میں میری مدد کر دیا کرتے تھے۔ بل بھروانا اور بچوں کو بیماری میں ڈاکٹر کے پاس لے جانا اور دیگر کام وہ کر دیتے۔ وہ گھر آتے اور مجھے مصروف دیکھتے تو مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ دبے لفظوں میں میری خوب صورتی کی تعریف کرتے۔ پہلے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میرے چہرے پر ناگواری آ جاتی تھی

تین سال بیمار رہ کر ساس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ شوہر ان کے انتقال پر پاکستان آئے۔ اور ایک ماہ رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اب کینیڈا کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جائیں گے۔

اس دوران میں وہ تین سال تک پاکستان نہیں آئے۔ البتہ شوہر کے چچازاد گھر میں آتے رہے۔ ساس سسر کے بعد میں گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ بچے اسکول میں ہوتے تھے۔ تنہائی میں شیطان نے بہکایا اور ہم نے حد پار کر لی۔ بعد میں مجھے شدت سے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھی بہت شرمندہ تھے۔ وہ پھر میرے گھر نہیں آئے۔

اب میرے شوہر پاکستان آ چکے ہیں۔ انہوں نے یہاں کاروبار جما لیا ہے۔ بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ ہمارا اپنا گھر ہے لیکن ضمیر کی خلش اور گناہ کا احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ بار بار دل چاہتا ہے شوہر کے سامنے اعتراف کر لوں' ان سے معافی مانگوں۔

ج: شریعت نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ انسان کی فطرت کو سامنے رکھ کر عائد کی ہیں۔ تنہائی میں نامحرم کے ساتھ کو اسی مصلحت کے تحت منع کیا گیا ہے۔ آپ سے غلطی ہوئی اور آپ کو اس کا احساس بھی ہے۔ اور آپ اذیت میں مبتلا ہیں۔ لیکن جس اذیت میں آپ مبتلا ہیں' اس میں اپنے شوہر کو کیوں مبتلا کرنا چاہتی ہیں؟

آپ انہیں بتائیں گی تو دو ہی صورتیں ہیں کہ وہ یہ بات جان کر مصلحتاً خاموشی اختیار کریں یا آپ کو طلاق دے دیں۔

طلاق دیں گے تو آپ کا گھر اجڑ جائے گا۔ سب سے زیادہ آپ کے بچے متاثر ہوں گے۔ ان کا کیا بنے گا۔ کیا دوسری عورت ان کو ماں کا پیار دے سکے گی؟ اور پھر آپ کہاں جائیں گی۔ اگر انہوں نے خاموشی اختیار کی تو بھی وہ آپ سے محبت نہیں کر سکیں ——— وہ آئندہ کبھی آپ پر اعتبار نہیں کریں گے اور ہمیشہ شک کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

بہت بڑا گناہ آپ سے سرزد ہوا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگتی رہیں اور آئندہ کے لیے توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔

شوہر کو ہرگز کچھ نہ بتائیں۔ اسی میں آپ کی اور آپ کے شوہر اور بچوں کی عافیت ہے۔

☆

شاہانہ بٹ......گوجرانوالہ

س: آپی! میری رنگت سانولی ہے میں میک اپ کرتی ہوں تو میرا چہرہ اور برا لگنے لگتا ہے۔ آپ مجھے میک اپ کا طریقہ بتادیں جس سے میرا چہرہ بہتر لگے......؟

ج: پیاری بہن! سانولے چہرے پر اگر سلیقے سے میک اپ کیا جائے تو یہ خوب صورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنے چہرے پر موجود چکنائی کو صاف کر لیں۔ اس کے لیے آپ اسکرب استعمال کرسکتی ہیں اور جو کا آٹا بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ اس کے بعد اپنی رنگت سے ملتا جلتا فاؤنڈیشن لگائیں۔ ہلکے رنگ کا فاؤنڈیشن آپ کے چہرے کو بھدا کردے گا۔ اگر فاؤنڈیشن رنگت کے حساب سے نہ ملے تو دو شیڈ ملا کر لگالیں۔ پھر ہلکا سا پف کریں۔ اپنی آنکھوں پر لائنر اور مسکارے کا استعمال کریں۔ لپ اسٹک میں آپ برگنڈی اور میرون رنگ کے علاوہ سرخی مائل براؤن رنگ بھی استعمال کرسکتی ہیں یا آپ خود بھی دیکھ سکتی ہیں کہ کون سا رنگ آپ پر سوٹ کررہا ہے۔ رات کی تقریبات میں آپ اپنی آنکھوں پر ہلکا ہلکا گولڈن شمر بھی لگا سکتی ہیں۔

سیما شکیل......کراچی

س: باجی میرا سوال موسم کے متعلق ہے کہ شدید گرمی سے کیسے بچا جائے اور لو لگنے کی صورت میں احتیاطی تدابیر بتادیں؟

ج: گرمی کے موسم میں پانی کا استعمال بڑھا دینا چاہیے، کم از کم دن بھر میں بارہ گلاس پانی ضرور پئیں۔ کافی، چائے اور کولڈ ڈرنک کے بجائے کچی لسی کا استعمال کریں۔ ایک چوتھائی گلاس دودھ لے کر اس میں تین چوتھائی گلاس پانی ڈال کر پی لیں۔

گھر سے باہر جاتے ہوئے سر ڈھانپ کر اور پانی پی کر نکلیں۔ باہر سے واپسی پر فوراً ٹھنڈا پانی نہ پئیں بلکہ کچھ دیر ٹھہر کر پانی کا استعمال کریں۔

کھانے میں ہلکے مسالے اور سبزیوں کا استعمال بڑھا دیں۔ سلاد کا استعمال کریں۔ فالسہ اور آلو بخارے کھائیں، تربوز کالی مرچ کے ساتھ بھی فائدہ کرتا ہے۔ تلی ہوئی، باسی چیزیں اور بازاری کھانوں سے جہاں تک ہوسکے بچیں۔

سلمٰی شاہد......لاہور

س: آپی میری عمر پچیس سال ہے۔ میرا وزن بڑھ گیا ہے۔ آپ مجھے ایسا کوئی طریقہ بتادیں کہ میں کھانے پینے میں احتیاط کرکے اپنا وزن کم کرلوں، میرے لیے ورزش کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے کوئی بیماری نہیں؟

ج: آپ تلی ہوئی اور تیز مسالوں والی غذا سے پرہیز کریں۔ جنک فوڈ اور مختلف کولا اور کولڈ ڈرنک کا استعمال بالکل ترک کردیں۔ پراٹھے کے بجائے سادہ روٹی کھائیں، گرم پانی دن میں دو مرتبہ پئیں، اگر ورزش نہیں کرسکتیں تو چہل قدمی کو اپنا معمول بنالیں۔

ثمینہ حیات......منڈی بہاؤالدین

س: گرمیوں کے آغاز سے ہی میں مختلف مسائل کا شکار ہوجاتی ہوں، مجھے پسینہ بہت آتا ہے اور خاص طور پر بغلوں میں اور اس میں بدبو بھی آتی ہے؟

ج: جسم سے خارج ہونے والے پسینے کی بو کسی بیماری کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ اس لیے اس سے پریشان نہ ہوں۔

سب سے پہلے تو آپ صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ جس کے ذریعے پسینے کی بدبو کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پاؤڈر کا استعمال بھی بہت مفید ہے۔ پسینے سے محفوظ رہنے کے لیے آپ باڈی اسپرے بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ یہ اسپرے آپ کو تازہ دم رکھتے ہیں۔

غسل کے بعد بغلوں میں پھٹکری کا ایک ٹکڑا لے کر پھیر لیں تو بھی پسینہ نہیں آتا۔ لیکن اس کا زیادہ استعمال مفید نہیں، گھر سے باہر جاتے ہوئے آپ ایسا کرسکتی ہیں۔ بدبو دور کرنے کے لیے ڈیوڈرنٹ کا استعمال بھی بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ بغل سے خارج ہونے والے پسینے کو کنٹرول کرتا ہے۔

☆